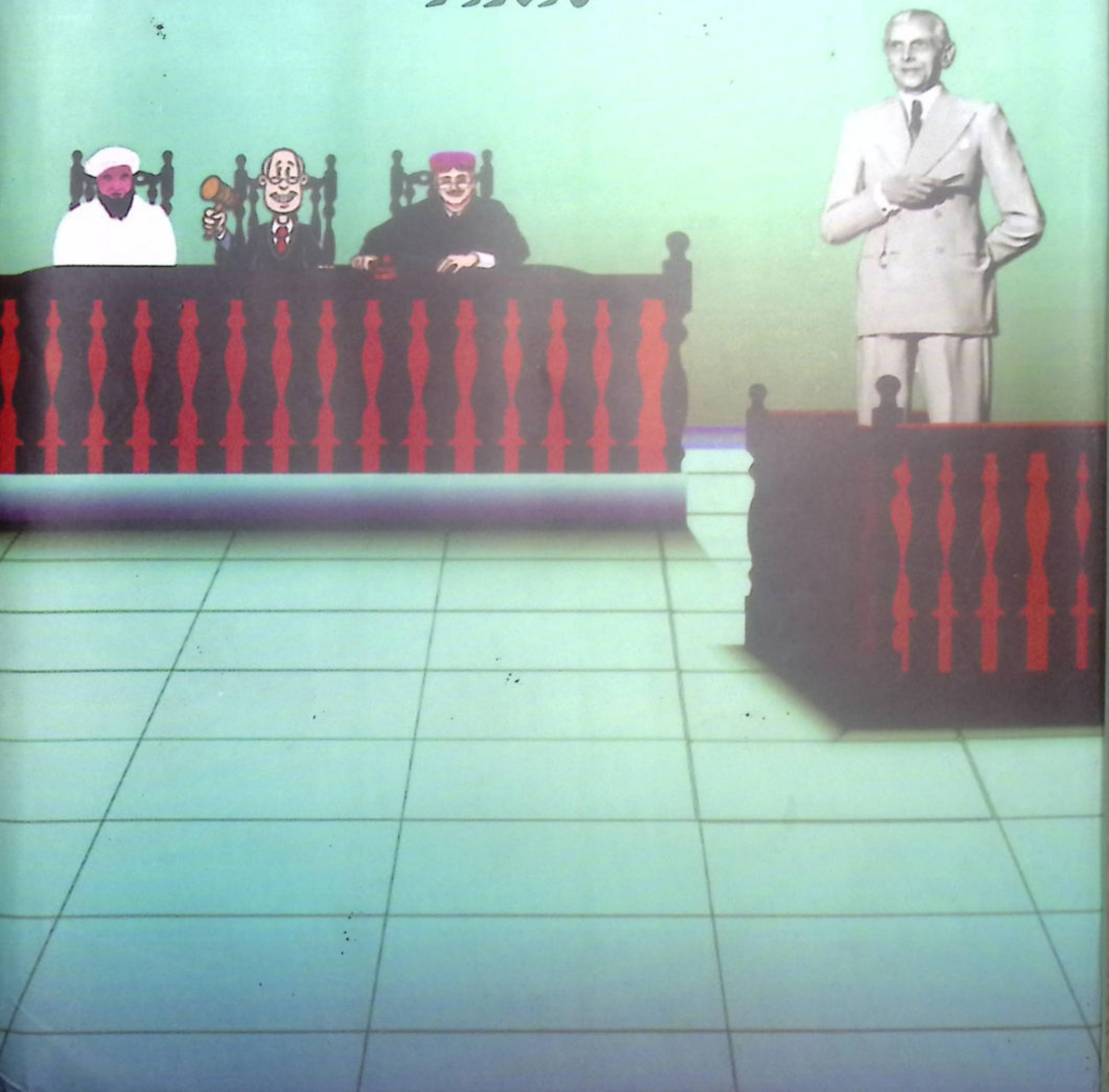
ملزم جناح حاضر ہو!



عماد بزدار



ملزم جناح حاضر ہو !

ملزم جناح حاضر ہو!

عماد بزدار

فکشن ہاؤس

○لاہور ○ کراچی ○ حیدرآباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

نام کتاب	:	ملزم جناح حاضر ہو!
مصنف	:	عماد بزدار
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پروف ریڈنگ	:	ابدال احمد جعفری
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2019ء
قیمت	:	1000/-

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-36307551
فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس
●لاہور ● کراچی ● حیدر آباد
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

ہماں دوست نام ءَ

مینغ انگی اے

مشترکہ محبتانی نیاما

یکھے

جناح صاحب

محبت دے استیں

مشمولات

باب۔۔۔2

مسلمانوں کے قائدِ اعظم

باب ـــ 3

گاندھی کی شخصیت

باب---4

ولی خان کے الزامات کا جواب

چند گزارشات

"قائداعظم کا پاکستان بنانے کا فیصلہ درست تھا۔ قائداعظم کی بھارت پر اعتبار نہ کرنے والی بات آج درست ثابت ہو رہی ہے۔ قائداعظم نے ٹھیک کہا تھا بھارت پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

یہ الفاظ کسی مسلم لیگی کے ہیں نہ کسی پاکستانی کے! یہ اعتراف مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیرِ اعلیٰ اور نیشنل کانفرنس کے صدر فاروق عبداللہ نے حال ہی میں کیا ہے۔

مارچ 2019ء میں!

وقت جوں جوں اپنی پرتیں اتارے گا، قائداعظم کی صداقت کا نقش تاریخ کے صفحے پر زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا جائے گا۔

ان سطور کا لکھنے والا کچھ عرصہ قبل ملک کے ایک پبلشر کے ہاں بیٹھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تقسیمِ ہند سے پہلے جہلم کے پورے بازار میں صرف ایک مسلمان کی دکان تھی۔ گاؤں کے گاؤں ہندو دکانداروں کی تجارت کے تصرف میں تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں میں مسلمانوں کی نسبت زیادہ خواندگی تھی۔ راولپنڈی میں جو عمارت آج وزارتِ دفاع کا ہیڈ کوارٹر ہے اسے قیامِ پاکستان سے پہلے سے "کلکتہ دفتر" کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہاں دفاعی حسابات کا ہیڈ آفس تھا اور اکثریت اس میں کلکتہ (بنگال) کے ہندو بابوؤں کی تھی۔ یہ تو ان علاقوں کی حالت تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

تقسیم سے پہلے معاشی اور معاشرتی میدانوں میں مسلمان، ہندوؤں کے مقابلے میں، کہاں کھڑے تھے؟ اس کا اندازہ آج کے نوجوان کو نہیں ہو سکتا۔ اس کی پیدائش ہی پاکستان میں ہوئی ہے۔ اس نے اپنے بڑوں کو ہندو ساہوکاروں سے قرض مانگتے دیکھا نہ ہندو جاگیرداروں کے کھیتوں میں ہل چلاتے۔ اسے کیا معلوم کہ ایک مسلمان اپنے بچے کو ملازمت دلوانے کے لیے ہندو بابوؤں کے سامنے کیسے اپنی عزتِ نفس کو تار تار کرتا تھا۔ ہاں! اگر وہ متحدہ عرب امارات جائے تو دیکھے گا کہ کس طرح ہندو دوسرے ہندو کی سرپرستی کر کے

مسلمان، خاص طور پر پاکستانی کو ہزیمت سے دوچار کرتا ہے۔ پیش پا افتادہ تھیوری کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت میں منقسم مسلمان اگر متحد ہوتے تو ایک بڑی طاقت ہوتے کے علمبردار بھول جاتے ہیں کہ ہندوؤں کی اقتصادی برتری کے ساتھ ون مین ون ووٹ کی قوت متحدہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اقلیت ہی کا درجہ دیتی۔

قائدِ اعظم، دوسرے لفظوں میں پاکستان، کی مخالفت آج کے پاکستان میں دو گروہ کر رہے ہیں اور اتفاق سے دونوں انتہاپسند ہیں۔ ایک وہ جن کا مذہب کے ساتھ کوئی خاص علاقہ نہیں اور متحدہ ہندوستان کے رومان کے اسیر ہیں۔ ان میں سے اکثر بھارت یاترا کرتے رہتے ہیں۔ یہ اپنی دانست میں بارڈر کی "مدہم" لکیر کو کالعدم گردانتے ہیں۔ دوسرا گروہ اہل مذہب کا ہے جن کے تعلیمی اداروں میں قائد اعظم کا نام لینا جرم ہے۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے طلبہ کو ہر ممکن حد تک ناواقف رکھا جاتا ہے اور قائد اعظم کا ذکر کرنا بھی پڑے تو بیگانگی کے بے مہر لمس کے ساتھ جناح صاحب کہہ کر خانہ پری کر دی جاتی ہے۔

وقت کی غیر جانبدار چکی نے دونوں انتہاپسندوں کے مؤقف کو پیس کر رکھ دیا۔ پہلے گروہ کو اس وقت شکست کا سامنا کرنا پڑا جب سلیمہ ہاشمی اور آپا کشور ناہید جیسے "نیوٹرل" پاکستانیوں کو بھارت نے ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ میاں نواز شریف کو تو توفیق نہ ہوئی مگر آصف علی زرداری نے بلوچوں کو صاف صاف کہا کہ بھارت میں گائے کاٹو گے تو مارے جاؤ گے۔ آر۔ ایس۔ ایس کے سیاسی چہرے بی جے پی کو جب سے بھارت میں اقتدار ملا ہے، "بارڈر مخالف" پاکستانیوں کے لیے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے کہ گئوماتا کے نام پر مسلمانوں کے قتلِ عام پر خاموش رہ سکیں۔ رہا دوسرا مذہبی گروہ، تو قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ زبان سے مانیں یا نہ مانیں، مگر نہاں خانہ دل میں جانتے ہیں کہ بھارت میں مدارس کی چھتوں پر ترنگا لہرانا لازم ٹھہرا ہے۔ 14 اگست، 23 مارچ اور 25 دسمبر کو تعطیل نہ کرنے والے پاکستانی مدارس کو معلوم ہے کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ ادتیاناتھ نے مدارس کو رکھشا بندھن، دیوالی، دُسہرہ، کرسمس اور دوسرے تہواروں کے دن مدارس بند کرنے کا حکم دیا ہے اور اسلامی تعطیلات کم کرنے کا کہا ہے۔ گیارہ اگست 2017ء کو یوپی کے اقلیتوں کی بہبود کے وزیر لکشمی نرائن سنگھ چوہدری کے حکم سے یوپی کی حکومت نے تمام اسلامی مدارس کو حکم نامہ بھیجا کہ ہر مدرسہ میں یوم آزادی منایا جائے اور تقریب کی ویڈیو فلم پیش کی جائے۔

جونئیر وزیر بلدیو اولکھ نے وضاحت کی کہ حکم عدولی کرنے والے مدارس کے خلاف ایکشن لیا جائے گا۔

یہ ایک طویل کہانی ہے۔ آج پاکستان ایک آزاد ملک ہے جو اقوامِ متحدہ کا رکن ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں اس کے سفارت خانے کام کر رہے ہیں۔ آج پاکستانی نوجوانوں کو مسلح افواج، سول سروس، بینکاری، آئی ٹی اور دیگر شعبوں میں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ پاکستان ایک ایٹمی طاقت ہے۔ اور اقتصادی استحکام کی طرف رواں دواں ہے۔ یہ وہ انعامات ہیں جن کا بھارتی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کا کریڈٹ اگر قائداعظم اور ان کی جدوجہد کو نہ دیا جائے تو کسے دیا جائے؟ ہاں کچھ لوگوں کے بارے میں شیخ سعدی فرما گئے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم

چشمہ ء آفتاب راچہ گناہ

چمگادڑ کی آنکھ دن کو کچھ دیکھنے سے قاصر ہے تو اس میں سورج کا کوئی قصور نہیں۔

یہ بہر طور طے ہے کہ وقت قائداعظم کی صداقت اور عظمت جریدہ عالم پر ثبت کرتا جائے گا۔

یہ تمہید اس لیے باندھی گئی کہ عماد بزدار کی زیر نظر تالیف آج کے پاکستان کی ایک بنیادی ضرورت پورا کر رہی ہے۔ عماد نے جذبات سے بلند ہو کر ٹھوس حوالہ جات کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو دیوار سے لگایا گیا اور اس حد تک زچ اور مجبور کیا گیا کہ پاکستان کے مطالبے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ قائداعظم نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے جدوجہد کی اور اس میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ عماد یہی منطقی اور زمانی ترتیب بروئے کار لایا ہے۔ اس نے پاکستانی مسلمانوں کا رخ اصل قائداعظم کی طرف پھیرا ہے۔ یہ ایک خالص تحقیقی کتاب ہے۔ اس میں نعرے ہیں نہ جذبات۔ حقائق کو مذہبی لبادہ پہنانے کی کوشش کی گئی نہ مذہب سے بزور دُور دھکیلنے کی۔

اب یہ عماد بزدار جیسے دردِ دل رکھنے والے دوسرے نوجوانوں کا کام ہے کہ ان خطوط پر مزید کام کریں، پاکستان کی حقانیت کو واضح تر کرنے کے لیے محنت کریں اور ایسی تصانیف کا ایک پورا سلسلہ سامنے لائیں تاکہ سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق روشن دن کی طرح سب کے سامنے آجائے۔

قائدِ اعظم کا ذکر جب بھی کیا جائے گا، گاندھی کا کردار ایک COROLLARY کے طور پر ضرور راستے میں پڑے گا۔ بقول مجید امجد

جو تم ہو برقِ نشیمن تو میں نشیمنِ برق

اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب، کیا کہنا

اگر ایک فقرے میں گاندھی کی شخصیت کو بند کرنے کا کہا جائے تو میں انھیں "مجموعۂ اضداد" کہوں گا۔ پاکستان کو اس کا حصہ دلوانے کے لیے ان کا مرن برت اور پھر قتل یقیناً سچ ہے مگر یہ آدھا سچ ہے۔ پورا سچ جاننے کے لیے گاندھی کی زندگی کے تمامCurrents اورUnder currents کو جانچنے کی ضرورت ہے۔ گاندھی ایک معمہ تھے۔ ایکEnigma اور اس معمہ کو قائداعظم نے سمجھا اور حل کیا۔ عماد نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

رہا کتاب کا باب جو ولی خان کی کتاب کے حوالے سے ہے تو میرے ناقص علم کے مطابق یہ ولی خان کے الزامات کا پہلا باقاعدہ اور باضابطہ جواب ہے۔ مختلف حضرات نے اپنی کتابوں میں ان الزامات کا رد پیش کیا ہے، کچھ نے محض ذکر کیا ہے، مگر بالاستیعاب اس معاملے کو عماد ہی نے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

آخری اور ضروری گزارش یہ ہے کہ مصنف نے مکمل غیر جانبداری کے ساتھ ٹھوس حوالہ جات کی مدد سے اپنا نکتہ نظر پیش کیا ہے۔ قارئین بھی اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہیجان سے بچیں اور شور مندی کے بجائے ہوشمندی بروئے کار لائیں۔

محمد اظہار الحق

(شاعر دانشور اور سینئر کالم نگار)

میلبورن 18/جون 2019ء

ملزم جناح حاضر ہو!

پاکستان کو بنے ستر سال ہو گئے ہیں۔ وہ نسل جس نے پاکستان بنتے دیکھا اس کی جدوجہد میں حصہ لیا، تہہ خاک ہوئی۔ جو اس وقت بچّے تھے شاید ان میں سے کچھ لوگ اب بھی زندہ ہوں۔ اس خاک وخون کے کھیل کے گواہ جو اس نو مولود وطن کو قائم ہونے کی پاداش میں ملا۔ آج ہم اور ہمارے بچے صرف کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ پاکستان کیسے بنا۔ پاکستان کے بننے میں جناح کا کردار کیا تھا۔ لیکن کہیں نہ کہیں قائدِ اعظم اور ان کے رفقاء کو احترام کے اونچے مینار پر ایستادہ کر کے، ہم نئی نسل کو ان کی اصل شخصیت اور جدوجہد کو سمجھنے سے کہیں بہت دور لے گئے ہیں۔ ان کے لیے قائد اعظم شاید بس ایک تصویر ہیں، مطالعہ پاکستان کی کتاب کا ایک باب یا سرکاری افسر کی کرسی کی پشت پر آویزاں ایک تصویر۔

اس پورے پس منظر میں لبرلز اور قوم پرستوں کا وہ ٹولہ جو قائد اور ان کے رفقاء کی تضحیک کرنے اور قائد اعظم کی شخصیت کو گاندھی کے مقابلے میں کمتر ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ان کے لیے ایک مدلل اور جامع موازنے پر مشتمل ایک ایسا جواب وقت کی اشد ضرورت تھا جو دونوں شخصیات کو تاریخ کے آئینے میں ان کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت آج کی نسل کے سامنے رکھ سکے۔ ان تمام تاریخی (ریفرینسز) کے ساتھ جو آزادی سے پہلے اور اسکے فوراً بعد لکھے گئے اور جن کے مستند ہونے پر کے قاری کو کوئی کلام نہ ہو۔

ان تمام حوالوں کو انتہائی محنت کے ساتھ جمع کرنے اور تجزیاتی طور پر پیش کرنے کا کارنامہ عماد بزدار نے انجام دیا ہے۔

قائد سے عقیدت اور محبت کے دعویدار تو بہت سے ہیں لیکن ان کی شخصیت کی سچائی سامنے لانے کے لیے اتنی عرق ریزی اور محنت کرنے کا اعزاز بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا ہے۔ عماد بزدار کی یہ کتاب ان کی اس محنت کو عشق اور جنون کا کارنامہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔

یہ کتاب برصغیر کی تاریخ کی دو اہم شخصیات قائدِ اعظم اور گاندھی کا احاطہ کرتی ہے۔

اگر تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو جناح اپنے ارادوں کی مضبوطی اور اپنی راست گوئی پر قائم شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اور دوسری جانب گاندھی کی سادگی اور مذہب کے نام پر ابہامات پر مشتمل فلاسفی جسے خود کانگرس نے آزادی سے پہلے ہی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ فلسفۂ عدم تشدد کے بانی اور پھر اسکے قطعی برخلاف پہلی جنگ عظیم کے لیے گاؤں گاؤں فوج میں بھرتی کی مہم چلانے والے گاندھی۔

اور تاریخ کی گواہی ہے کہ اسکے مقابلے میں جناح اپنے موقف پر ڈٹ جانے والے اور اصولوں پر کبھی سودا نہ کرنے والے لیڈر تھے۔ جو حق بات کو حاکم وقت کے سامنے کہنے سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔

کانگرس کا طرز سیاست، کانگرس میں مولانا آزاد کی حیثیت، آزادئ ہند کی جنگ کب کانگرس کی معاندانہ پالیسیز کی وجہ سے مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے مطالبے میں ڈھل گئی۔ مسلم لیگ کی مسلمانوں کی جماعت ہونے کی حیثیت اور پالیسیز اور پھر اسکے بعد کی سیاسی اور آئینی جدوجہد کا ہر وہ پہلو جو ان دونوں شخصیات کے اس وقت کے طرز عمل کو سامنے لاتا ہے اسکا تاریخی ریفرنس اس کتاب کا حصہ ہے۔

یوں سمجھئے کہ اس کتاب نے دونوں شخصیات کا کیس ان کے تاریخی حقائق و دلائل کی صورت میں عوام کے سامنے رکھ دیا گیا ہے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ سچائی، کردار و اخلاق کی کسوٹی پر کس کو کھرا اترتے ہوئے پاتے ہیں۔

کیونکہ تاریخ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ حقائق اور سچائی کو کہیں نہ کہیں کسی شکل میں درج کر ہی دیتی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے تو صرف سچ کو کھوجنے کی۔ سوال کرنے اور جواب ڈھونڈنے کی اور عماد بزدار نے اس کتاب میں ان سوالوں کے مدلل جواب کو جمع کر دیا ہے۔

کتاب کے ایک حصے میں قوم پرستوں کے کئی سالوں سے جاری پروپیگنڈے کی حقیقت بھی تاریخ کے دلائل کی روشنی میں سامنے لائی گئی ہے۔ چاہے وہ جناح کے برٹش ایجنٹ ہونے کا جھوٹا الزام ہو، کانگرس کی قوم پرستوں سے قربت، سازشیں، دوری اور اس حوالے سے قیام پاکستان سے پہلے گاندھی کے کردار کو بھی تاریخی حوالوں سے عیاں کیا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب نئی نسل پر ستر سال پہلے کی تاریخ کا وہ رخ سامنے لا سکے گی جو ہمارے ملک کے لبرل و قوم پرست کئی دہائیوں سے مسخ کر کے دکھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب کے بعد امید ہے کہ کئی ایسے اذہان جو ان کے جھوٹ سے آلودہ خیالات کے زیر اثر ہوں شاید اپنا قبلہ درست کر سکیں۔

ثمینہ رشید

27/جون 2019ء۔ لندن

ملزم جناح حاضر ہو!

قائد صحیح تھے اس وقت بھی صحیح تھے جب انہوں نے کہا تھا ہندو لیڈر شپ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس وقت بھی درست تھے جب کہا تھا آج سے ہمارے تمہارے رستے جدا ہیں۔ اور اس وقت بھی درست تھے جب کہا ہم مذہبی معاشی معاشرتی ہر لحاظ سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور وقت نے یہ ثابت کیا کہ ہم ایک الگ قوم تھے ہیں اور رہیں گے۔ جناح اس وقت بھی صحیح ہیں جب نا قابل اعتبار بھارت ہماری سفارتی زمینی سرحدوں کی مالی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ اور اس وقت بھی صحیح ہوں گے جب سپر پاور بننے کا بنیئے کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ اور اس کی وجہ کچھ اور نہیں اس کی مذہبی تنگ نظری ہوگی۔ جناح کو غلط کہہ دینا آسان غلط ثابت کرنا مشکل تر ہے۔ کیا کسی ایسے شخص کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے جس کو اپنی قوم کے درد نے بے چین کر رکھا ہو۔ کیا کسی ایسے شخص کو غلط ثابت کرنا آسان کام ہے جس نے کسی مالی فائدے کی کسی ذاتی مفاد کی پروا کیے بغیر اپنی بستی کے لیے بہتر زندگی کا خواب دیکھا ہو۔ پھر اس بڑے خواب کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہو۔ تعبیر کی سہانی صبح وہ شخص آنکھوں میں نمی لیے قوم کا حوصلہ بلند کر رہا ہو۔ لیکن ہماری بستی میں رسم چلی ہے احسان فراموشی کی ہم محسن کش مرعوب ذہن قوم آپ کو غلط ثابت کرنے کی کوششوں مین سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں آج کل۔

ایسے میں ایسی کوئی کتاب روزن سے آتی پہلی کرن جیسی لگی جو ہر زبان دراز کے منہ پر طمانچے جیسی ہے۔ علمی و تاریخی طمانچہ جب یہ کتاب پڑھی تو بے ساختہ خواہش جاگی اس میں حصہ دار بننے کی اس کتاب میں کچھ لکھنے کی۔ اس جلتے دیئے کی لو کا تھوڑا سا حصہ بننے کی۔ ایسی کتابیں یا تحریریں کسی انعام یا تعریف کے لیے نہیں لکھی جاتیں ایسی کتابیں تو فرض کی طرح ادا کی جاتی ہیں۔ اور قرض کی طرح ادا کی جاتی ہیں۔ وہ قرض جو آزاد فضاؤں میں سانس لینے سے ہم پر واجب ہوتا ہے۔ آزادی دنیا کا سب سے مہنگا سب سے سہانا خواب ہے اور اس کی تکمیل کی جدوجہد سب سے مشکل جدوجہد۔ اس مشکل جدوجہد میں ہجوم تب تک قوم نہیں بنتی جب تک کوئی صاحب ادارک شخص ہاتھ نہ تھام لے۔ جب تک علم بردار کی نیت و عمل میں فرق نہ ہو۔ قول و فعل

میں تضاد نہ ہو۔ اور ایسا ہی تھا بابا جناح۔ اٹل مضبوط فیصلہ کر کے ڈٹ جانے والا اور دور اندیش۔ وہ جس نے کانگریس جوائن کہ تو پوری آمادگی اور یکسوئی سے اپنی قوم کی بہتری کے لیے کام کیا۔ کانگریس چھوڑی تو پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنے مشن کی تکمیل تک اپنے خواب کی تعبیر تک انتھک محنت و کوشش کی۔ جو طبقہ آج کل جناح کو غلط ثابت کرنے میں پورا زور لگا دیتے ہیں ایسے سخن فروشوں کو لکھنوٗ معاہدہ کہ تفصیلات پڑھنی چاہیں جو جناح کی کوششوں سے ہوا جس معاہدہ میں خود ہندووٗں نے مسلمانوں کو الگ قوم مانا۔ جو مصنوعی دانش کی داد لینے کو قائد کا قد چھوٹا کرنے کی کوششوں میں خود بونے ہوتے چلے جا رہے ہیں ان کو نہرو رپورٹ سے دہلی تجاویز سے چودہ نکات اور وہاں سے انیس سو پینتیس کے ایکٹ پر ہندووٗں کی ہٹ دھرمی بغض تعصب اور تنگ نظری دیکھنی چاہیے۔ انہیں ایک بار تو کانگریسی وزارتوں میں کانگریس کا رویہ دیکھ لینا چاہیے اور غلامی میں اپنے خال و خد پہچاننے چاہیں جنہیں لگتا ہے ہم ایک قوم تھے انہیں آج کا ہندوستاں دیکھ لینا چاہیے۔ تعصب تنگ نظری میں جکڑا ہوا۔ پاکستان سمیت انڈیا کی اپنے ہر ہمسائے سے سرحدی ٹینشن پر غور کرنا چاہیے چین جیسے بڑے اور نیپال وسری لنکا جیسے چھوٹے بے ضرر ملکوں میں تخریب کاریوں کے پیچھے چھپے "نادیدہ" ہاتھ کی کھوج لگانی چاہیے۔ ہمارے رائٹ ونگ کے وہ لوگ جو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کو سرے سے غلط مانتے ہیں انہیں خبر ہو کئی ریاستوں میں انڈین مدارس میں ترنگا و ندے ماترم لازمی قرار دی جا چکا ہے۔ چودہ اگست چھ ستمبر اور پچیس دسمبر کو چھٹی نہ کرنے والے اپنے ان بھائیوں کی خبر لیں جن پر پندرہ اگست کو "آزادی" کی تقریب کی وڈیو بنا کر دکھانا لازم ٹھہرا ہے۔ سب سے بڑے بیف ایکسپورٹر انڈیا میں آپ کی قوم پر گائے کے ذبیحہ کے جتنے الزام لگتے ہیں ان الزامات پر سزائیں ہوتیں ہیں اور فیصلے ہجوم کرتے ہیں وہ ان واقعات سے کہیں کم ہیں جن کو بنیاد بنا کر ہمارے "اہل علم" ہمیں معتوب ٹھہراتے نہیں تھکتے۔ اقلیتوں کا رونا رونے والے صاحبان علم کو خبر ہو ہمسایہ اقلیتوں کے لیے خطرناک ملکوں میں ہم سے کہیں آگے ہے۔ خیر یہ تو چند مثالیں تھیں آج کی دنیا سے۔ جو جناح کو ہمیشہ سے درست ثابت کرتی آ رہی ہیں۔

الغرض ہمارے دانشور ہمیں گاندھی کے مون بھرت سے آزاد کی پیش گوئیوں تک ہر سچ ادھورا ہی بتاتے رہے ہیں اور اس ادھورے سچ میں یہ متعصب طبقہ ہر ذی شعور کی نظروں سے مزید گرتا رہا ہے۔ خدا جانے اس غبی تنگ نظر طبقے کی قسمت میں مزید کتنی پستی لکھی گئی ہے کہ تاریخی حوالوں سے مزین یہ کتاب بھی لکھی گئی ہے۔ تاریخ کے ہر طالب علم کے لیے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے۔

سحر رشس عثمان

باب۔۔۔1

متحدہ ہندوستان کا حامی، قوم پرست جناح

جب گاندھی ہندوستانی سیاست میں وارد ہوئے تب جسونت سنگھ کے مطابق جناح صاحب کل ہند سطح کے لیڈر مانے جاتے تھے یعنی جناح صاحب ہندوستانی سیاست میں گاندھی سے کہیں زیادہ سینئر ہیں۔ کانجی کے مطابق دسمبر 1906ء میں جناح پہلی بار کلکتہ کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس وقت وہ دادا بھائی نوروجی، صدر کانگرس کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اس موقع پر خطبہ صدارت میں "سیلف گورنمنٹ" یا "سوراج" کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ آیئے ہندوستانی قوم پرست جناح کی ابتدائی سیاست پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔

جب گاندھی افریقہ میں تھے تب جناح وائسرائے منٹو کے سامنے گاندھی اور ہندوستانیوں کا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ بقول موجمدار اس سے قبل کسی کو بھی اس بہادری سے وائسرائے کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں ہوئی اپنی کتاب "جناح اور گاندھی" میں جناح صاحب اور وائسرائے کا مکالمہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "محترم رکن ایم اے جناح! مائی لارڈ میں بلا ہچکچاہٹ کہوں گا کہ یہ آج کا سب سے دردناک سوال ہے جس امر کے متعلق میں بات کرنے والا ہوں اس نے ہر ہندوستانی کو شدید کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ ہے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی شہریوں کے ساتھ ہونے والا سخت انسانیت سوز سلوک۔۔
>
> صدر مجلس (لارڈ منٹو وائسرائے) ! میں یہاں محترم رکن مقننہ سے کچھ نرم الفاظ استعمال کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے "انسانیت سوز" نہایت سخت لفظ ہے اور معزز رکن کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ ایمپائر کی دوست اکائی کے متعلق بات کر رہے ہیں لہٰذا انھیں اپنے الفاظ کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہیئے۔۔۔

محترم رکن ایم اے جناح! بہت بہتر مائی لارڈ اگرچہ میں اس سے بھی زیادہ شدید اور مؤثر الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اس کونسل کی آئینی حدود سے آشنا ہوں جنھیں توڑنا میں ہر گز پسند نہیں کرونگا لیکن میں اپنے اس مؤقف پر بدستور قائم ہوں کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی شہریوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے وہ بدترین ہے جس کے خلاف عوام کا ردِّعمل بالکل بجا ہے"

اس سے قبل کسی بھی فرد کو وائسرائے کے سامنے اس قدر بے جگری اور جرات مندی سے بولنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا اخبارات نے کونسل کی کاروائی میں جناح کے خطاب کو شاندار کوریج دی اور راتوں رات ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔ عوام میں یہ خیال بیدار ہوا کہ ان کی مانگوں کو بے خوفی سے بیان کرنے والی آواز پیدا ہو چکی ہے۔ اس کے بعد جناح کا نام اخبارات کے صفحہ اول سے کبھی محو نہیں ہوا۔"(1)

جب گاندھی افریقہ سے ہندوستان آئے تو بقول جسونت سنگھ اسوقت جناح ایک کل ہند سطح کے لیڈر بن چکے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جنوری 1915ء میں جب گاندھی جہاز سے ہندوستان پہنچے تو جناح اور گوکھلے سمیت کئی لیڈر ان کا شایان شان استقبال کرنے بمبئی پہنچے تھے۔ اس وقت جناح ایک کل ہند سطح کے لیڈر بن چکے تھے۔ اور نہ صرف مسلمانوں اور ہندوؤں اور اعتدال پسندوں اور انتہاپسندوں کے مابین بلکہ ملک کے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد کی مخلصانہ کوشش کر رہے تھے۔ جناح نے بھی بمبئی میں گاندھی کا پرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ جناح ان ایام میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی پوری خدمات دینے کو تیار تھے۔ جناح کی مقبولیت اور ان کے سیاسی قد کی وجہ سے ہی گوجر طبقہ کی ایک تنظیم گرجہ سبھا نے "مسٹر اور مسز گاندھی" کے استقبال کے لیے منعقدہ گارڈن پارٹی کی صدارت کرنے کا موقع جناح کو دیا تھا۔

23 جنوری 1915ء کو اپنے صدارتی خطاب میں جناح نے نہ صرف بمبئی کی جانب سے بلکہ پورے ہندوستان کی جانب سے "مسٹر اینڈ مسز گاندھی" کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے گاندھی کے سامنے واضح طور پر کہا تھا کہ:

"مکمل اتفاق رائے سے ہندوستان کے مطالبات (برطانوی حکومت کے سامنے) رکھے جاسکیں، اس کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اتفاق رائے اور تعاون کا جذبہ پیدا کرنا ہی سب سے بڑا چیلنج ہے" انھوں نے یہاں تک کہا کہ "بلاشبہ وہ (گاندھی) نہ صرف

ایک قیمتی زیور بلکہ ایک حقیقی کارکن بھی بنیں گے جس کے برابر بہت کم لوگ پہنچ سکیں گے۔"(2)

ایک اور انتہائی اہم بات، جسونت سنگھ کے مطابق، ایک ایسے وقت جب بقیہ ہندوستانی سیاستدان آزادی کے لیے تیار تک نہیں تھے جناح صاحب اس زمانے سے ہی ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے اپنے واضح آئینی خیالات رکھتے تھے:

"قانون ساز اسمبلی میں موجود سرکاری فریق جناح کے ایسے تبصروں سے پریشانی محسوس کرتے تھے لیکن اس سے جناح اور ان جیسے دوسرے ممبران ان کے دباؤ میں آنے والے کہاں تھے۔ انھوں نے جنوری 1919ء میں، بمبئی میں ساؤتھ بورو کمیٹی کے سامنے اپنے بیان میں مونٹیگ چیمس فورڈ رپورٹ میں اصلاحات کے بارے میں واضح طور پر خیالات رکھے لیکن اسی سال میں مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے دیا جانے والا ان کا بیان کہیں زیادہ واضح اور بے باک تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت جب جناح کے بہت سے ساتھی ہندوستان کی آزادی کے لیے تیار تک نہیں تھے، وہ ہندوستان کو آزادی تک لے جانے کے لیے اپنے آئینی خیالات کی واضح اور پرزور وکالت کررہے تھے۔"(3)

جسونت سنگھ مزید لکھتے ہیں کہ تحریکِ آزادی پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب جب ہندو مسلم یگانگت میں اضافہ ہوا برطانوی حکمرانوں کی طرف سے اصلاحات کے نام پر ہندوستانیوں کو رعایتیں ملتی گئیں اور اس ہندو مسلم اتحاد میں کلیدی کردار جناح صاحب کا ہوتا تھا۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

"تحریک آزادی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ، جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین فرقہ وارانہ یگانگت بڑھی تو آئینی اصلاحات بھی آگے بڑھتی گئیں۔ جب ان فرقوں کے درمیان بھائی چارہ موجود ہوتا برطانوی حکومت کی طرف سے اصلاحات خودبخود سامنے آتیں۔ اس کے پس منظر میں انگریزوں کی وہ پریشانی تھی جو ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوتی تھی۔ 1919ء کے مونٹ فورڈ اصلاحات (مونٹیگ۔چیمس فورڈ اصلاحات) کو جب بالآخر پیش کیا گیا تو دراصل پہلی بار برطانوی سامراج نے اپنے اختیارات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہندوستانیوں کو دے دیا تھا۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ کانگرس اور لیگ کے ایک ساتھ کھڑے ہونے سے پیدا شدہ دباؤ کا بھی اہم کردار تھا۔ اگر ایسا دباؤ نہ ہوتا تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انگریز از خود کوئی پہل کرے۔ مسلم لیگ اور

کانگرس کا متحدہ نقطۂ نظر قائم کرنے میں جناح کا کلیدی کردار تھا۔ وہ جناح ہی تھے جنھوں نے کانگرس اور لیگ کے مابین نظریاتی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ انھوں نے ہی ان دونوں جماعتوں کو انڈین کونسل میں اصلاحات کی مانگ کے لیے تیار کیا تھا۔"(4)

جناح صاحب کے اسی رول پر کے ایم منشی اپنی کتاب پلگریمیج ٹو فریڈم میں لکھتے ہیں کہ:

"In a sense Jinnah dominated the Congress and the League (both) at that time. He had played the key roie in preparing a draft constitution for India and getting it adopted by the sessions both of the Congress and of the League. The historical Lucknow Pact was an integral part of this constitution. Under it, the Muslims led by the League promised to work with the Hindus to achieve freedom in return for the Congress conceding to the Muslims separate electorates with weightage far in excess of their numerical strength"

"جناح اس وقت ایک طرح سے گانگرس اور لیگ دونوں پر حاوی تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے آئین کا مسودہ تیار کرنے اور گانگرس اور لیگ دونوں کے جلسوں میں اسے منظور کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخی لکھنؤ معاہدہ اس آئین کا ایک لازمی جزو تھا۔ اس کے تحت لیگ کے زیر قیادت مسلمانوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کا ساتھ دینے کا عہد کیا اور اس کے جواب میں گانگرس نے مسلمانوں کو علیحدہ حلقہ انتخاب کا تحفہ دیا جس میں انھیں ان کی عددی قوت سے کہیں زیادہ وزن دیا گیا تھا۔"

لکھنؤ اجلاس کے صدارتی خطبے میں جناح نے کہا کہ:

"ہمیں ہندوؤں کے تئیں برادرانہ اور نیک جذبات کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اپنے ملک ہندوستان کے مفادات ہمیں ہر دم پیش نظر رکھنے چاہئیے۔ ہندوستان کی ترقی کا راز ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد میں پنہاں ہے"(5)

ایک ایسے وقت میں جب جناح صاحب کی کوششوں سے دونوں فریق قریب آرہے تھے ایک حیرت انگیز بات اندولال یاجنک نے اپنی کتاب میں لکھی۔ اندولال گاندھی کے انتہائی قریب رہے گو کہ اس نے کوئی ثبوت تو نہیں دیا لیکن ایک ہندو لیڈر جو گاندھی کے انتہائی قریب بھی رہے، کے الزام کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی گول میز کانفرنس کے دوران جس طرح پنڈت مالویہ کے زیر اثر آکر اس نے مسلمانوں کی

وائسرائے کونسل میں ایک سیٹ کی ڈیمانڈ مسترد کردی اس الزام کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ وہ کس طرح ہندو انتہاپسندوں کے نرغے میں رہتے تھے۔ اندولال یاجنک لکھتے ہیں:

"ان ہی ایام میں گانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان فرقہ ورانہ سمجھوتے کے لیے نجی جلسے ہوتے رہے۔ اس راہ میں بعض اوقات کچھ ایسی مشکلات بھی پیدا ہوئیں کہ سمجھوتہ کی توقعات مشتبہ نظر آنے لگیں لیکن بالآخر رواداری اور قوم پرستی ہی کے جذبے کو کامیابی نصیب ہوئی اور دونوں جماعتیں حکومت خوداختیاری کی ایک مشترکہ اسکیم بنانے میں کامیاب ہوگئیں۔ یہ اسکیم جو گانگرس لیگ اسکیم کے نام سے مشہور ہے کانگرس اور مسلم لیگ کے عام اجلاسوں میں یک بہ یک منظور کی گئی۔ بے شک یہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس فرقہ ورانہ سمجھوتے کی قریب قریب تمام دفعات، مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں شامل کرلی گئیں اور بالآخر 1919ء کی نئی اصلاحات میں بروئے کار آئیں۔ اپنی پرانی عادت کے مطابق گاندھی جی نے اس تاریخی اجلاس میں بھی بہت کم حصہ لیا۔

عام طور پر یہ افواہ گرم تھی کہ انھوں نے بعض کٹر ہندو لیڈروں کو اندر ہی اندر یہ مشورہ دیا کہ وہ فرقہ ورانہ سمجھوتے کے تصفیے میں مسلم رہ نماؤں کے سامنے ذرا اور اکڑے رہیں لیکن جہاں تک مجلس مضامین اور کھلے اجلاس کا تعلق تھا انھوں نے خاموش رہنا ہی مناسب خیال کیا اگرچہ وہ ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتے رہے۔"(6)

مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کے موقع پر قائم ہونے والی پارلیمانی کمیٹی کے رکن میجر آرمز بائی گور سے جناح کی جو گفتگو ہوئی، اس سے جناح صاحب کے خیالات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس حد تک ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے تھے، جسے ایم آر جے کار نے اپنی سوانح عمری "دی سٹوری آف مائی لائف" میں اس طرح نقل کیا:

Major Ormsby-Gore: You said, you speak from the point of view of India? You speak really as an Indian Nationalist?

M.A Jinnah: I do

Major Ormsby-Gore: that is to say that at the earliest possible moment you wish to do away in political life with any distinction between Muhammadan and Hindu?

M.A Jinnah: yes: Nothing will please me more than when that day comes.

"میجر آر مزبائی: آپ نے کہا کہ آپ ہندوستانی نکتۂ نظر پیش کر رہے ہیں۔ کیا آپ حقیقی ہندوستانی قوم پرست ہیں؟

جناح: جی ہاں

میجر آر مزبائی: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ سیاسی میدان میں ہندو مسلم کی تفریق سے بالاتر ہو کر کام کرنا چاہیں گے

جناح: جی ہاں وہ دن میری زندگی کا خوشگوار ترین دن ہو گا (جب مذہبی تخصیص سیاسی میدان میں ختم ہو جائے گی)(7)

رولٹ ایکٹ پر جناح کا ردِ عمل

جنوری 1919ء میں مجلس قانون ساز میں ایک بل کا مسودہ پیش ہوا جو بعد میں رولٹ ایکٹ کی شکل میں قانون بن گیا۔ اس بل کی کمیٹی کی صدارت جس نے کی اس جج کا نام مسٹر جسٹس رولٹ تھا۔ بل کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے اور اس لیے حکومت یہ اختیار طلب کر رہی تھی کہ وہ باغیوں اور اپنے دوسرے سیاسی مخالفوں کو گرفتار کر کے جیوری کے مشورے کے بغیر ان پر مقدمہ چلائے۔

اس بل پر جناح نے بڑا شدید ردِ عمل دیا۔ کانجی تو یہاں تک لکھتے ہیں حکومت جناح کے شدید ردِ عمل کی وجہ اسے دیس نکالا دینا چاہتی تھی:

> "سن 1919ء میں رولٹ ایکٹ کی بنا پر جب بل پیش ہوا تو ہندوستان میں مخالفت کی لہر سی دوڑ گئی۔ لیجسلیٹو کونسل میں سریندر ناتھ بینرجی، سری نواس شاستری، سر تیج بہادر سپرو، محمد علی جناح اور اٹھل بھائی پٹیل نے اس کے خلاف سخت تقریریں کیں۔ جناح نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ جو حکومت اس قسم کے قوانین نافذ کرتی ہے اسے مہذب کہلانے کا حق حاصل نہیں۔ اس ایکٹ کی مخالفت کی تحریک کے سلسلے میں برطانوی حکومت، جن آٹھ ہندوستانیوں کو دیس نکالا دینا چاہتی تھی، ان میں جناح کا نام بھی شامل تھا۔ لیکن بعد میں یہ مصیبت صرف بی جی ہارنی مین کے سر گئی۔"(8)

رولٹ ایکٹ کے منظور کیے جانے کے خلاف اپریل 1919ء میں جناح نے وائسرائے کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت تک وہ بمبئی کے ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔

وائسرائے کو لکھا گیا جناح صاحب کا استعفیٰ نامہ کچھ اس طرح تھا:

"بل کو منظور کر کے یور ایکسیلینسی کی حکومت نے انھی اصولوں کو بیدردی سے کچل دیا جن کے لیے گریٹ بریٹن نے جنگ لڑی تھی۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو تباہ کر دیا گیا اور لوگوں کے آئینی حقوق کو پامال کیا گیا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت حال میں جب ریاست کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی حد سے زیادہ گھبرائی ہوئی اور نااہل نوکر شاہی کے ذریعہ اٹھایا گیا قدم ہے جو نہ تو لوگوں کے تئیں جواب دہ ہے اور نہ ہی حقیقی عوامی رائے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

کلکتہ میں لیگ کے خصوصی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے 7 ستمبر 1920ء کو جناح نے ہاؤس آف لارڈز میں ڈائر کی حمایت میں منظور تجویز کی شدید مذمت کی اور چیمبر کے ممبران کا ذکر کرتے ہوئے جناح نے انھیں "انگلینڈ کا بے دماغ اشرافیہ" قرار دیا۔

کانجی، اپنی کتاب میں ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے ہندو لیڈرز کے ساتھ جناح صاحب کا کس قدر اچھا پیشہ وارنہ تعلق قائم تھا۔

"مئی 1924ء میں اسمبلی کا اجلاس شملہ میں ہوا۔ اس موقعے پر لوہے اور فولاد کی صنعت کو مضبوط کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ اسمبلی کے بعض ممبر بل کے مخالف تھے مگر ایک طرف موتی لعل نہرو اور جناح کا باہمی تعاون تھا اور دوسری طرف ان دونوں کا حکومت سے بھی تعاون تھا۔ چنانچہ بل مخالفت کے باوجود منظور ہو گیا۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ جس کا انکشاف تین سال بعد ہوا۔ جناح کے بنگلے پر ایک رات ڈنر تھا۔ موتی لعل نہرو، ڈی آر ٹاٹا اور میں شریک تھے۔ وہاں اس بل کا تذکرہ چھڑا۔ جناح ان دنوں کی اسمبلی کی چٹ پٹی باتیں سنانے لگے، جن پر خوب قہقہے لگے۔ جناح نے کہا جس روز بل پر ووٹ لیے جانے والے تھے۔ اس سے ایک دن پہلے رات کے وقت رتن ٹاٹا بے تحاشا بھاگے ہوئے سی سل ہوٹل میں ان کے (جناح کے) کمرے میں پہنچے اور بڑی گھبراہٹ میں چلا کر کہنے لگے "جناح کچھ سنا تم نے؟ غضب ہو گیا اسمبلی کے ممبر۔۔۔۔۔ صاحب کہتے ہیں کہ اگر میں نے ایک بڑی بھاری رقم انھیں نہ دی تو وہ اس بل کے خلاف ووٹ دیں گے۔" یہ ممبر موتی لعل کی پارٹی کے آدمی تھے۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر بھی جناح نے ان صاحب کو جنھوں نے رقم کا مطالبہ کیا تھا اور اسی ہوٹل میں مقیم تھا، بلوا بھیجا، جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے جناح نے ڈانٹ کر کہا "رتن ٹاٹا مجھ سے شکایت کر رہے ہیں کہ آپ نے ان سے اپنے ووٹ کی قیمت دس ہزار روپے طلب کی ہے۔ اطمینان رکھیے یہ رقم آپ کو ہرگز نہیں ملے

گی۔آپ جہنم میں جائیں اور سر دست اس کمرے سے باہر تشریف لے جایئے۔" یہ صاحب وہاں سے منہ لٹکائے چلے آئے اور مزے کی بات یہ کہ اگلے دن انھوں نے بل کے حق میں ووٹ دیا۔رتی اور موتی لعل کے ساتھ میں بھی اس دلچسپ واقعے سے خوب لطف اندوز ہوا۔رتن ٹاٹا نے،جو وہاں موجود تھا،اس کی تصدیق کی۔موتی لال کو اس کا پہلے علم ہو چکا تھا۔

یہ جناح اور موتی لعل کے اس باہمی تعاون کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں لوہے اور فولاد کی صنعتیں مستحکم بنیادوں پر قائم ہیں۔موتی لال کے دل میں جناح کی بے حد عزت تھی اور وہ ان پر اعتماد کرتے تھے۔بالکل یہی معاملہ جناح کا موتی لال کے ساتھ تھا۔"(9)

قوم پرست جناح کی شخصیت کی کچھ ابتدائی جھلکیوں کے بعد دیکھتے ہیں کہ آخر ایسا کیا کچھ ہوا کہ "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" "مسلمانوں کا گوکھلے" جناح ایک علیحدہ ملک بنانے پر تل گئے۔

گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ کی کہانی

اس کی ابتدا گاندھی کی ہندوستانی سیاست میں وارد ہونے سے ہوئی۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جناح اور گاندھی کی شخصیتوں کے تصادم میں یہ سب کچھ ہوا جس کی وجہ سے دونوں شخصیات کے درمیان فاصلے بڑھے کیونکہ جناح صاحب سمجھتے تھے کہ گاندھی کی موجودگی میں وہ ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں بیٹھ سکتے۔اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالتے ہیں کہ وجہ کیا بنی؟ کیا جناح صاحب کسی عدم تحفظ کا شکار تھے؟ کیا جن وجوہات کی بنا پر علیحدگی ہوئی ان میں جناح صاحب کی رائے کہیں غلط تھی؟

ہوم رول لیگ

مسز اینی بینٹ 1893ء میں ہندوستان آئیں جہاں وہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کی مستقل رکن بن گئیں۔مذکورہ سوسائٹی کو 1886ء میں مدراس کے قریب کرنل الوکوٹ اور میڈم بلفاٹسکی نے قائم کیا تھا۔ ہندوستان آنے سے قبل انھوں نے یہاں کے فلسفے مذہب اور کلچر کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا اسے ہندوستانی عوام سے محبت تھی۔

وہ ہندوستان کے لیے مکمل سیاسی آزادی کی خواہشمند تھیں ان کی دلی آرزو تھی کہ ہندوستان اور برطانوی دولت مشترکہ کی دیگر خود مختار اکائیوں میں خود مختار حکومتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ان کی ہندوستان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ ان کی میت کو نذر آتش کر کے راکھ گنگا میں بہادی

جائے۔

وہ کانگرس کے طرزِ سیاست کو ناپسند کرتی تھیں اس لیے اس نے 1916ء میں ہوم رول لیگ قائم کی جس کی صدر وہ خود تھیں۔ مسز بیسنٹ کی شاندار قیادت میں ہوم رول موومنٹ کی مقبولیت جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی مدراس میں لارڈ پینٹ لینڈ نے اس تحریک کی طاقت سے خوفزدہ ہو کر مسز بیسنٹ اور ان کے رفقا کو گرفتار کرلیا۔

مسز بیسنٹ کی گرفتاری پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے انتہائی شدید ردِ عمل کا اظہار کیا۔

جناح نے یہ خبر سنتے ہی ہوم رول لیگ میں بطور صدر شمولیت اختیار کرلی اور ایم آر جے کار اس کے سیکرٹری بن گئے۔

جناح نے ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے پہلے خطاب میں کہا:

> "میرا مسلمانوں کے نام یہی پیغام ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں سے تعاون کریں جب کہ ہندوؤں سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنے پسماندہ مسلمان بھائیوں کے فلاح کے لیے کام کریں اس جذبے سے ہوم رول لیگ کی بنیادیں مستحکم ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لیے ہمیں ہرگز خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں"

بمبئی ایسوسی ایشن کے ایک پرہجوم اجلاس منعقدہ 30 جولائی 1917ء کو جناح نے کہا:

> "ہم مسز بیسنٹ اور ان کے کارکنوں کی گرفتاری پر اصولی بنیادوں پر احتجاج کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ یہ اس خود مختار حکومت کے خلاف سازش ہے جس کی سکیم کانگرس اور مسلم لیگ نے لکھنؤ میں تیار کی تھی لیکن ہم اس سکیم پر سختی سے ڈٹے رہیں گے اور ہم جنگ کے خاتمے پر اس پر عمل درآمد کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے"
>
> (از موجمدار "جناح اور گاندھی")

گاندھی کی ہوم رول میں انٹری اور ڈکٹیٹر شپ کی کہانی

اس زمانے میں ایک سماجی اور سیاسی کارکن کے طور پر گاندھی جی کی شہرت عروج پر تھی مانٹیگ چمسفورڈ اصلاحات پر بہتر طور پر عمل درآمد کرانے کے لیے جیکر کی مخالفت کے باوجود خود جناح نے ہوم رول لیگ کے ایک اجلاس میں گاندھی کا نام ہوم رول لیگ کی صدارت کے لیے تجویز کیا۔ جیکر کے مطابق گاندھی کے بین الاقوامی عزائم ہیں ہماری ایک چھوٹی تنظیم ہے ایسا نہ ہو گاندھی ہماری تنظیم کو اپنے بلند و بالا عزائم کی بھینٹ چڑھائے۔ انھوں نے گاندھی جی کو خط لکھا:

"that you will demand from us, before long, a change in our objects and aims and even try to secure in our creed a place for some of your pet theories, which many of us may be inclined to regard as fantastic fads."

"ہم جانتے ہیں کہ جلد ہی آپ ہم سے ہمارے مقاصد و عزائم میں تبدیلی کا مطالبہ کریں گے اور فوراً ہمارے منشور میں اپنے پسندیدہ نظریات داخل کرنے کی کوشش کریں گے جنھیں ہم تخیل کی اختراعات سے زیادہ نہیں گردانتے۔"

گاندھی نے اس کے جواب میں لکھا:

"A great deal of what you say appeals to me though I am disturbed by your descriptions as 'fads' of some of my theories. May I tell you that the only 'fad' on which I would insist, if I ultimately decided to join your League , would be a common language for India , to be found in one of the vernaculars of the country ,and the gospel of Swadeshi [by Indian]. You need have no apprehension that any other theories of mine your League will be called upon to accept."

"اگرچہ آپ نے میرے نظریات کو تخیل کی اختراع قرار دے کر مجھے شدید تکلیف پہنچائی ہے اس کے باوجود آپ کے خط کا بیشتر متن مجھے اچھا لگا۔ میں صرف ایک امر کی وضاحت کو ضروری خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ اگر میں نے آپ کی جماعت میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو میں اپنے نظریئے پر اصرار ضرور کرونگا وہ ہے ایک مشترکہ لیگ کا قیام جس کے تمام اصول و ضوابط ہندوستانی روایات کے مطابق ہونگے اس کے علاوہ آپ کو کسی دوسری چیز سے پریشان یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے خیالات آپ پر کبھی مسلط نہیں کرونگا۔"(10)

لیکن گاندھی کی یقین دہانیوں کے باوجود گاندھی کے آتے ہی وہی کچھ ہوا جس خدشے کا اظہار جے کار نے گاندھی کے نام اپنے خط میں کیا۔

گاندھی نے ہوم رول لیگ میں آتے ہی اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کرلی۔ اس نے ہوم رول لیگ کے نام اور دستور میں تبدیلی کے لیے اجلاس بلالیا جس کے لیے جناح اور ان کے ساتھی بالکل تیار نہیں تھے کانجی لکھتے ہیں کہ

"چنانچہ جناح، جیکر، منشی، میں اور ہمارے پندرہ ساتھیوں نے ہوم رول لیگ یعنی سوراج سبھا سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح ہوم رول لیگ پر غاصبانہ قبضہ کر کے گاندھی جی نے جناح اور ان کے ساتھیوں کو الگ کر دیا اور اس کے بعد "سوراج سبھا" بھی ختم کر دی گئی۔"

کانجی مزید لکھتے ہیں کہ:

"ستمبر 1920ء کے کلکتہ اجلاس اور دسمبر 1920ء کے ناگ پور کانگرس اجلاس کے درمیان گاندھی جی نے جناح کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی"(11)

موجمار کے مطابق گاندھی عہدہ صدارت حاصل کرتے ہی آمر بن گئے۔ ان کے مطابق:

"عہدہ صدارت کا حلف اٹھاتے ہی گاندھی جی نے لیگ کا جنرل اجلاس طلب کیا جس کا مقصد جماعت کا نام اور منشور تبدیل کرنا تھا اور انھوں نے ہوم رول لیگ کا نیا نام سوراجیہ سبھا تجویز کیا۔ جناح اور چند دوسرے بانی ارکان نے گاندھی جی کی تجاویز سے شدید اختلاف کیا لیکن گاندھی جی نے اجلاس کے چیئرمین کی حیثیت سے تمام اعتراضات رد کر دیے اور نہایت آمرانہ انداز میں اعلان کیا کہ

"ہر رکن کے لیے یہ دروازے کھلے ہیں کہ چاہے تو وہ تاحیات رکن بن جائے اور اگر اسے سبھا کے تبدیل شدہ آئین سے اتفاق نہیں تو فوراً استعفیٰ دے دے۔"

گاندھی جی کے اس غیر جمہوری اور غیر اصولی طرزِ عمل سے جناح اور بعض دیگر ارکان کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گاندھی جی کو ہرگز اس امر کا مجاز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ لیگ کا نام یا منشور تبدیل کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے احتجاجاً فوراً استعفے دے دیے۔"

استعفیٰ دینے کے بعد جناح اور اس کے ساتھیوں نے گاندھی کے نام ایک خط لکھا اس احتجاجی خط پر جناح، جے کار، دوارکاداس، منگل داس پکواس، ناگن داس ماسٹر، اور کے ایم منشی نے دستخط کیے۔ اس خط کا متن درج ذیل ہے

"لیگ کے زیر دستخطی اعلان کرتے ہیں کہ مرار جی ہال میں ہونے والے اجلاس میں جو منشور پیش کیا گیا ہے وہ لیگ کے حقیقی مقاصد و عزائم سے براہ راست متصادم ہے۔ لیگ کے آئین میں تبدیلی کا طریقہ کار بھی قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔ زیر دستخطی ارکان بلا

ہچکچاہٹ کہتے ہیں کہ آپ (گاندھی جی) کی جانب سے اپنایا گیالائحہ عمل غیر قانونی، غلط، شخصی اور آمرانہ ہے۔اس لیے ہم انتہائی افسوس سے فوری طور پر لیگ کی رکنیت اور اپنے موجودہ عہدوں سے مستعفی ہوتے ہیں"(12)

گاندھی کی اس ڈکٹیٹر شپ بارے کے ایم منشی اپنی کتاب "پلگریمج ٹو فریڈم میں لکھتے ہیں کہ:

"When Gandhiji forced Jinnah and his followers out of the Home Rule League and later also from the Congress, we all felt, with Jinnah, that a movement of an unconstitutional nature, [civil disobedience] sponsored by Gandhiji with the tremendous influence he had acquired over the masses, would inevitably result in widespread violence, thus barring the progressive development of self-governing institutions based on a partnership between educated Hindus and Muslims. To generate coercive power in the masses would only provoke mass conflict between the two communities, as in fact it did- with his keen sense of realities Jinnah firmly set his face against any dialogue with Gandhiji on this point'."

"جب گاندھی جی نے جناح اور ان کے ساتھیوں کو ہوم رول لیگ سے نکل جانے پر مجبور کیا اور بعد میں کانگرس سے بھی تو ہم سب لوگوں نے بشمول جناح محسوس کیا کہ گاندھی جی اس زعم میں ہیں کہ انھوں نے عوام الناس پر بے انتہار سوخ حاصل کر لیا ہے۔وہ جو اس غیر آئینی ہیئت کی تحریکوں کی پاسداری کر رہے ہیں تو بالآخر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چاروں طرف تشدد کا دور دورہ ہوگا جس میں تعلیم یافتہ ہندوں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی شراکت سے فروغ پانے والے خود انتظامی کی اساس پر چلنے والے اداروں کا پنپنا مشکل ہو جائے گا۔عوام الناس میں جابرانہ طاقت کی افزائش سے دونوں فرقوں میں عوامی تصادم کے

بھڑکنے کا رجحان پیدا ہوگا جیسا کہ ہوا بھی۔ ذہین اور معاملہ شناسی کے ماہر جناح نے طے کرلیا
کہ اس نکتے پر گاندھی جی سے کوئی گفت وشنید لاحاصل ہے"۔(13)

بات آگے بڑھتی ہے ایک اہم واقعہ "تحریک خلافت" شروع ہوتا ہے جس کے پلیٹ فارم سے مہاتما نے اپنے عدم تعاون پروگرام کو لانچ کیا۔

تحریک خلافت و عدم تعاون اور گاندھی کی طرف سے مذہب کا استعمال

ہمارے ہاں ہمیشہ ایک یک طرفہ بیانیہ پیش کیا جاتا ہے جیسے جناح صاحب ہی تھے جس نے مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے "استعمال" کیا بہت کم لوگ اس پر بات کرتے ہیں یا ان کے علم میں ہے کہ سیاست میں مذہب کے استعمال کا سہرا گاندھی کے سر ہے۔ جناح صاحب نے تو اپنے دفاع کے لیے ایک جنگ لڑی جب اس کی تیس سالہ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو حقارت سے ٹھکرادیا گیا تب جناح صاحب نے اپنے فرقے یعنی مسلمانوں کی بہتری کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا۔۔ عائشہ جلال کے مطابق جناح صاحب کو اس زمانے، جب ان کی کانگرس سے علیحدگی ہوئی، ایک "کیمونلسٹ" کے طور پر ملامت کا نشانہ بنایا گیا. یہ اصطلاح بہت تحقیری انداز میں 1920ء کے دہائی کے اواخر میں ان کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو گانگرس کے انداز کی قوم پرستی کی توثیق نہیں کرتے تھے۔ جناح نے مذہب کا اس حد تک ہی "استعمال" کیا کہ جب اسے کانگرسی پروپیگنڈے کے زیر اثر فرقہ پرست کہا گیا تو علیگڑھ میں اس کا جواب جناح صاحب نے یوں دیا:

> حضرات اگر میں اپنے فرقے کی حالت سدھارنے کے لیے جدوجہد کر رہا ہوں اور ان کی معاشی، معاشرتی تعلیمی اور سیاسی ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔ تو کیا یہ فرقہ پرستی ہے؟ اگر فرقہ پرستی یہی ہے تو مجھے اس فرقہ پرستی پر فخر ہے۔"(14)

اس کو اگر کوئی مذہب کا ناجائز استعمال کہتا ہے تو ضرور کہے حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب کی یہی فرقہ پرستی تھی اور یہی پاکستان کی جنگ تھی۔ جناح صاحب نے مذہب کے ناجائز استعمال کی ہمیشہ مذمت ہی کی ہے۔ مذہب کا اگر بدترین استعمال کسی نے کیا تو وہ گاندھی ہی تھا۔

لیری کولنز جو اپنی کتاب میں گاندھی کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے نظر آئے وہ بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ ہندوستانی سیاست میں مذہب کے استعمال کا سہرا گاندھی کے سر ہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "اس کے باوجود ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ہندو اور مسلمان دانشوروں نے اپنے باہمی اختلافات کو پوری طرح بھلا کر کندھے سے کندھا ملا کر ایک ایسی منزل کی طرف

بڑھنا چاہا تھا جس میں دونوں کا برابر فائدہ تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس اتحاد میں دراڑ ڈالنے کا کام خود مہاتما گاندھی نے کیا۔۔۔۔ خواہ نادانستہ طور پر۔
ہندوستان میں جسے دنیا کا سب سے زیادہ مذہبی ملک کہا جاسکتا ہے وہاں یہ ناممکن تھا کہ آزادی کی لڑائی کو مذہبی رنگ اختیار کرنے سے بچایا جاسکے۔
مذہب کا رنگ گاندھی کے ذریعے آیا۔ اس سے انکار نہیں کہ کوئی شخص گاندھی کی طرح مذہبی تعصب سے بالاتر نہیں تھا، نہ گاندھی کی طرح کوئی وسیع الخیال اور تحمل رکھنے والا تھا۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد کے ہر مرحلے پر مسلمانوں کا خلوص اور تعاون حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اس کے باوجود گاندھی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے۔ بھگوان پر انتہائی گہرے یقین کے بغیر ان کا وجود ناممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی گانگرس پارٹی کی تحریک کو ہندوؤں کی تحریک بننے سے بچانا نہ تو ممکن تھا نہ ہو سکا۔ دھیرے دھیرے گانگرس کا لہجہ ہندوؤں کا لہجہ بنتا گیا جس سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں شبہات پیدا ہونے لگے۔"(15)

ہوم رول لیگ کی بانی، مسز بیسنٹ، نے لیگ چھوڑنے کی وجہ ہی یہی تھی کہ لیگ گاندھی کی وجہ سے مذہبی معاملات میں بری طرح الجھ گئی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ (home rule league is entertwined with religion) یعنی ہوم رول لیگ مذہب سے شرابور ہو چکا ہے۔

تحریکِ خلافت بنیادی طور پر مسلمانوں کی تحریک تھی لیکن اس کے باوجود جناح صاحب نے اس تحریک کا حصہ بننے سے انکار کر دیا لیکن گاندھی، جس کا خلافت سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، اس موقعے کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے کود پڑے۔ موجمدار "جناح اور گاندھی" میں لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے جناح کی سرگرمیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی جو ان کے اپنے وطن میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست شیدائی تھے لیکن انھیں دور دراز ترکی میں خلافت کی بقا سے اس قدر محبت ہو گئی کہ وہ علی برادران کی تحریک کے سب سے بڑے حامی ثابت ہوئے ترکی کے مسلمان انھیں ہندوستان کے مسلمانوں سے عزیز ٹھہرے نفسیات میں بی ہیویراسٹ کا کہنا ہے کہ کسی بھی شخص کے کردار کی صحیح شناخت اس کا عمل ہے نہ کہ اس کے بلند و بالا خیالات۔

گاندھی جی کے حقیقی کردار کو سمجھنے میں تحریک خلافت سے بڑھ کر کوئی چیز مددگار ثابت نہیں ہو سکتی اس میں شمولیت سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کا اصل مقصد کیا تھا

جسے وہ مشن کا نام دیتے تھے وہ جنوری 1915ء میں ہندوستان واپس لوٹ آئے اور 1919ء تک ان کا روّیہ گانگرس اور جناح کے تیئں نیم دلانہ تھا انھوں نے فرقہ وارانہ یگانگت کے لیے جناح کی کوششوں کو کبھی نہیں سراہا۔ 1915ء سے 1919ء تک وہ چھوٹی چھوٹی جگہوں پر ستیہ گرہ کا کھیل کھیلتے رہے۔

حتیٰ کہ جلیانوالہ جیسے ہولناک سانحے پر بھی انھوں نے گہرے ضبط اور اعتدال پسندی کا مظاہرہ کیا لیکن تحریکِ خلافت شروع ہوتے ہی ان کے مزاج کا رنگ یکسر بدل گیا۔ ان میں گھوڑے جیسی پھرتی، تیزی اور چستی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

یہاں کئی سوال ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں مثلاً وہ جناح سے اس قدر لا تعلق کیوں تھے اور انھوں نے مولانا آزاد اور علی برادران کے لیے اتنی گرمجوشی کیوں ظاہر کی؟ وہ جلیانوالہ کے قتل عام اور پنجاب میں ہونے والے بدترین مظالم پر خاموش رہے لیکن خلافتِ عثمانیہ کا غم کھانے والوں میں پیش پیش ثابت ہوئے جس کا ہندوستان کے معروضی حالات اور عوام سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان سوالوں کا تجزیہ کرنے سے گاندھی کے حقیقی کردار کا تعین ممکن ہے۔" (16)

اس کی وجہ بھی موجمدار نے کچھ اس طرح بتادی۔:

"ہندو عوام تو پہلے ہی مہاتما کے چرنوں میں گر چکے تھے اور خلافت تحریک کی بھرپور حمایت سے مسلم عوام بھی ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اب ان کے سحر کے اسیر ہونے کی باری دانشور طبقے کی تھی۔ اب تک انڈین نیشنل کانگرس کو گاندھی جی کی مختلف تحریکوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو شروع ہو چکی تھیں۔ تاہم اب گاندھی جی نے اپنی توجہ کانگرس کی جانب مبذول کی، وہ اپنے خیالات کے فروغ کے لیے اس عظیم ادارے پر گرفت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اسے اپنے نظریات کے آلہ کار کے طور پر استعمال کر سکیں۔ کانگرس پر ان کی چڑھائی بالکل طوفانی انداز میں تھی اور سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو جیسے رہنماؤں نے ان کے سامنے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ دسمبر 1920ء میں گانگرس کے اجلاس ناگپور میں خود گانگرس نے گاندھی جی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور آئندہ کی سرگرمیوں کے لیے گاندھی جی کا لائحہ عمل اپنایا۔ اس کے بعد گاندھی جی عملاً گانگرس کے آمر بن گئے۔

یہ صورتِ حال محمد علی جناح کے لیے سخت نا قابلِ برداشت اور نا قابلِ تسلیم تھی جو کانگرس کے اولڈ گارڈ اور اس پرانی انڈین نیشنل کانگرس کے عظیم محافظ تھے جو دادابھائی نوروجی، فیروز شاہ مہتہ، گوپال کرشن گھوکھلے، سریندر ناتھ بینرجی اور دوسرے رہنماؤں کی تنظیم تھی۔ وہ آخری لمحے تک جنگ کیے بغیر کانگرس کو گاندھی جی کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ جناح کو گاندھی جی کی آئیڈیالوجی سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ گاندھی جی ہندوستان کو بد نظمی کی دلدل کی طرف لے جا رہے ہیں جہاں ہر چیز تباہی پر منتج ہو گی۔"(17)

گاندھی نے جب خلافت کی تحریک کی حمایت کی تو جناح کا ردِ عمل بیان کرتے ہوئے کانجی نے لکھا کہ گاندھی نے جناح پر گویا بم کا گولا مارا۔ جناح نے مزاحمت کی لیکن کانجی ہی کے مطابق اس وقت ایسی صورت حال بنا دی گئی کہ جو گاندھی کی مخالفت کرتا اسے ٹوڈی، غدار اور برطانوی ایجنٹ کہا جانے لگا۔

کچھ لوگ بہت بھونڈے انداز میں گاندھی کا مقدمہ اس طرح لڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گاندھی اگر خلافت کی حمایت نہ کرتے تو تب بھی پاکستانی مسلمانوں نے گاندھی پر تنقید ہی کرنی تھی گویا گاندھی بامر مجبوری خلافت کی حمایت کر رہے تھے۔ یہ بالکل ایک بے بنیاد بات ہے۔ گاندھی دل و جان سے اس تحریک کا حصہ بنے۔ اس موقعے کو استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنی لیڈر شپ کی دھاک مسلمانوں پر بھی بٹھا دی جیسا کہ موجمدار نے بیان کیا ساتھ ہی اس نے "گائے کو مسلمانوں کے چھریوں سے محفوظ کیا"

منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے" کے صفحہ نمبر 40 میں موجمدار کا حوالہ دیتے ہوئے گاندھی کی تحریک خلافت کی حمایت گاندھی کی زبانی یوں بیان کرتے ہیں۔

"میرا کہنا ہے کہ ہم دونوں کے ساتھ خلافت مرکزی مدعا ہے، مولانا محمد علی کے ساتھ اس وجہ سے کہ یہ ان کا دھرم ہے میرے ساتھ اس وجہ سے کہ خلافت کے لیے اپنی جان دینے سے اس بات کو یقینی بناتا ہوں کہ گائے (ماتا) مسلمانوں کی چھری سے محفوظ رہے، کیونکہ یہ میرا دھرم ہے" چونکہ مسئلہ بڑا نازک ہے اصل انگریزی Version بھی دیا جا رہا ہے۔

"I claim that with us both, the Khilafat is the central fact; with Maulana Mohammad Ali, because is his religion; with me because, in laying down my life, I ensure the safety of the cow, that is my religion, from the Muslim knife."

اقتباس مجمدار کے 'ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ ان انڈیا' جلد اسے لیا گیا ہے (صفحہ 64)
ایسی حالت میں گاندھی جیسے ایسے صف اول کے کانگرسی نیتا اپنی مذہبی وابستگی کا اظہار جب گائے اور مسلمانوں کی چُھری کے بغیر نہیں کر سکتے تھے، تو ہندو مسلم ہم آہنگی اور اتفاق کا فروغ ان کے ہاتھوں کہاں تک ہو سکتا تھا اس کا اندازہ کوئی بھی کر سکتا ہے۔"(18)

آیئے اس وقت ہندوستان میں گائے بیلوں کی تعداد بارے کے بارے میں کچھ حقائق پڑھتے ہیں جن کو گاندھی جی مسلمانوں کی چھریوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ لیری کولنز لکھتے ہیں کہ:

"چنانچہ 1947ء میں گائے اور بیلوں کی تعداد ہندوستان میں دنیا کے تمام ملکوں سے زیادہ تھی۔ تقریباً بیس کروڑ گائے بیل ہندوستان میں بھٹک رہے تھے یعنی ہر دو ہندوستانیوں کے درمیان ایک گائے یا بیل۔

اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں انسانوں کی آبادی اتنی ہی تھی جتنی ہندوستان میں گائے بیلوں کی تعداد۔ صرف چار کروڑ ہندوستانی گائیں ایسی تھیں جو کسی طرح مر کھپ کر دودھ دیتی تھیں۔ فی مویشی صرف ایک پنٹ کا اوسط۔

چار پانچ کروڑ بیل بار برداری کے کام آتے تھے اور بیل گاڑی وغیرہ میں جوتے جاتے تھے۔ بقیہ دس کروڑ سے زیادہ گائے بیل بالکل کسی کام کے نہیں تھے۔ کھیتوں، میدانوں اور شہروں دیہاتوں میں یہ جانور پوری آزادی کے ساتھ مٹر گشتی کرتے تھے۔ ہر روز جو اناج ان غیر ضروری جانوروں کے پیٹ میں سما جاتا تھا اگر وہ بچایا جا سکتا تو تقریباً ایک کروڑ ہندوستانیوں کو کھانا مل سکتا تھا جو ناکافی اور ناموزوں خوراک ملنے کی وجہ سے ادھ مرے ہوئے تھے۔ اگر مذہبی جذبے کو طاق پر رکھا جائے اور صرف انسانوں کو زندہ رکھنے کا سوال سامنے رکھا جائے تو ان غیر ضروری جانوروں کو ضرور ختم کر دیا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اندھی مذہبی عقیدت کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ ہندو گائے کو مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ خود بھوکے مر رہے تھے تا کہ گائے بیل جہاں چاہیں منہ ماریں اور جبڑے چلاتے رہیں۔

یہاں تک کہ خود گاندھی نے ہمیشہ یہی کہا کہ گائے میں ایشور رہتا ہے اور گائے کی حفاظت کرنا ایشور کی پوجا کرنے کا دوسرا نام ہے"(19)

بیورلے نکولس "ورڈکٹ آف انڈیا" میں گائے بیلوں کی تعداد اور حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں مویشیوں کی صورت حال کے بارے میں ناقابل فہم اعداد و شمار کے صفحے کے صفحے لکھے جاسکتے ہیں لیکن مختصر اًواقعات درج ذیل ہیں دنیا بھر کے مویشیوں کی ایک تہائی تعداد، ہندوستان میں پائی جاتی ہے، جو مضحکہ خیز حد تک زیادہ ہے اور ان میں بیشتر بالکل بے کار ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مویشیوں کی فی ایکڑ تعداد ڈنمارک سے، جو کسی زمانے میں یورپ کا ڈیری فارم کہلاتا تھا، دگنی ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں آپ کو کسی قیمت پر بھی دودھ کا اچھا گلاس نہیں مل سکتا۔

اس شرمناک صورت حال کا ذمہ دار ہندو مذہب ہے، جو مویشیوں کو ذبح کرنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ سسک سسک کر مر جائیں، بھوک سے مر جائیں، بیماری کی حالت میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہیں، جو ہر شخص کے لیے خواہ وہ کتنا بھی سنگدل کیوں نہ ہو، ناگوار ہوتا ہے لیکن ان کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر اس مصیبت سے نجات دلائے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے سو مویشیوں میں سے 70 دودھ دینے کے قابل نہیں ہوتے۔ صرف کھاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں باقی 30 مویشیوں کے لیے اتنی کم خوراک بچتی ہے کہ مویشیوں کی دودھ کی پیداوار اوسطاً ڈیڑھ پاؤنڈ فی کس ہوتی ہے۔ دودھ کی یہ مقدار دنیا کے کسی نارمل ملک کی پیداوار کی نسبت ایک تہائی سے بھی کم ہے (جرمنی میں ایک گائے اتنا دودھ دیتی ہے جتنا ہندوستان میں نو مویشی) یہ ہے وہ قیمت جو ایک ہندو، اپنے مویشی خانے میں وشنو مہاراج کے احکام کی تعمیل میں ادا کرتا ہے۔

یہ مسئلہ ایک معاصر مسئلہ ہے اور اس کے حل کے سلسلے میں انگریزوں کو کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا۔ جب تک ہندو مذہب اپنی موجودہ شکل میں موجود ہے اس کا حل تلاش کیا ہی نہیں جاسکتا۔

گاندھی شاید ہندوؤں کا نکتہ نظر تبدیل کرسکتے لیکن وہ ہمیشہ ٹھوس مسئلوں کے حل سے گھبراتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا رویّہ اُس جواب سے ظاہر ہو جائے گا، جو انھوں نے گؤشالہ کے ایک مینیجر کو دیا تھا۔ اس شخص نے ایک خط کے ذریعے اس سے مشورہ طلب کیا تھا جو درج ذیل ہے:

"اس وقت میرے گؤشالہ میں 500 گائیں ہیں۔ وہ تمام قطعاً بیکار مویشی ہیں اور کھانے کے سوا کچھ اور کام نہیں کرسکتے۔ ان میں سے اوسطاً 350 سے لیکر 400 تک مویشی تقریباً موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں، جو کسی وقت بھی دم توڑ سکتے ہیں۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔"

اگر گاندھی نے اس کا مختصر سا جواب دیا ہوتا کہ "تمام کو گولی مار دو" تو وہ ہندوستان کی اتنی بڑی خدمت کرتے،

جتنی عدم تشدد کی ہزار مہمیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ خیالات میں ایک انقلاب کا آغاز کر دیتے جو بالآخر زراعت میں انقلاب کا باعث بنتا اور کسانوں کو غلامی کی سطح سے بلند ہونے پر اکساتا۔ (اور اس کے ساتھ ہندوستان کے بارے میں کتابیں لکھنے والوں پر بھی احسان کرتے کہ پہلی بار انھوں نے کوئی ایسی بات کی ہے، جو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ ورنہ ان کی باتیں تو اس قسم کی ہوتی ہیں کہ انھیں سولہ دفعہ پڑھنے اور طویل غور و فکر کرنے کے بعد آپ ان کا ایک مطلب اخذ کرتے ہیں، لیکن اگلے ہی صفحے پر اس کی تردید کر دی جاتی ہے) لیکن گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ "انھیں گولی مارو" یہ فقرہ بہت براہ راست ہوتا، اینگلو سیکسن لوگوں کی صاف دلانہ باتوں کی مانند۔۔۔۔۔اور سب سے بڑھ کر یہ بات گائے کی اس پوجا کے خلاف جاتی تھی جس کو وہ بہت مشتہر کیا کرتے ہیں۔ وہ نہایت چالاکی سے اس مشکل سے نکل گئے۔ اولاً اصل مسئلہ کو قطعاً نظر انداز کر کے اور ثانیاً اس کا الزام کسی اور کے سر لگا کر۔۔۔۔۔۔یہاں انھوں نے سارا الزام انتظامیہ پر عائد کر دیا۔

انھوں نے جواب دیا:

> "یہ بات انتظامیہ اور اس طرح کے اداروں کے منتظمین کے لیے لازمی ہے کہ وہ بیمار اور کمزور مویشیوں کی نرسنگ اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے مؤثر ترین طریقے تجویز کریں"
>
> اور اُن کے ان عملی اور روشن خیالی پر مبنی الفاظ سن کر، مرتے ہوئے وہ جانور، کینسر میں مبتلا گائیں اور وہ بچھڑے جن کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں، ایک مرتبہ نہایت احسان مندی سے ڈکارے تو ضرور ہوں گے۔"(20)

گاندھی ان گائیوں کو مسلمانوں کی چھریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے خلافت تحریک میں کود پڑتے ہیں ,صرف گائے ہی پر کیا موقوف اس نے، اندولال کے مطابق، قرآن اور گیتا دونوں سے اپنے پسندیدہ چرخے کی نشاندہی بھی کی۔ اس کے باوجود گاندھی کے مداحوں کے خیال میں گاندھی نے کبھی مذہب کا استعمال نہیں کیا۔

وہ تو اس حد تک آگے چلے گئے کہ مسلم علما کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے لچکدار فلسفہ عدم تشدد میں بھی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ ٹنڈولکر لکھتے ہیں کہ:

> "But Muslims have special Koranic obligations in which Hindus may or may not join. They, therefore, reserve to themselves the right, in the event of the failure of non-co-operation cum non-

may be enjoined by the Islamic scriptures. I venture heartily to associate myself with this resolution."

"مسلمانوں پر قرآن نے کچھ ایسے فرائض عائد کیے جن میں ہندو شمولیت اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے پاس یہ حق محفوظ ہے کہ وہ عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کی ناکامی کی صورت میں اسلامی فقہ کی رو سے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ حصول انصاف کے لیے ان پر ہر طریقے کا در کھلا ہے۔ میں دل و جان سے اس قرارداد کی حمایت کا اعلان کرتا ہوں۔(21)

دیکھا جا سکتا ہے کہ واحد جناح ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود اس تحریک کے خلاف ہیں۔ گاندھی ہوں اور صاحبِ بصیرت مولانا آزاد، دل و جان سے خلافت تحریک کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ "صاحب بصیرت" جس کی دوربین نظروں سے صدی بعد کے مستقبل کے واقعات چھپے نہیں رہ سکتے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہب کا استعمال کرتے ہوئے سادہ لوح لوگوں کو اندھے کنویں میں دھکیل دیتے ہیں۔ پتا نہیں اسوقت ان کی بصیرت کہاں گئی تھی؟

بنگال کے گورنر رچرڈ کیسی کے سامنے گاندھی نے خود اعتراف کیا جس کا حوالہ منصور احمد اور سیر وائی دونوں نے اپنی کتاب میں دیا کہ جناح نے اسے کہا کہ "آپ نے (گاندھی نے) ہندوستانی سیاست میں بہت سارے ردی عناصر در انداز کر کے اور انھیں مقبولیت کا جامہ پہنا کر برباد کر دیا ہے اور یہ کہ سیاست کے ساتھ مذہب کو خلط ملط کرنا ایک جرم ہے۔ جس کے مرتکب گاندھی جی ہوئے تھے۔

(مسٹر کیسی کی ڈائری مورخہ 2 دسمبر 1945ء بہ حوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد 6 صفحہ 61)

سیر وائی نے بھی یہی کچھ لکھا کہ جناح نے گاندھی کو روکنے کی کوشش کی وہ لکھتے ہیں کہ:

"دوسرا اہم واقعہ گاندھی جی کا تحریکِ خلافت کی حمایت کرنا تھا۔ تحریکِ خلافت خالصتاً مذہبی تحریک تھی۔ جیسا کہ خود گاندھی نے 20 اکتوبر 1921ء کے ینگ انڈیا میں بیان کیا کہ اگرچہ خلافت میرے اور مولانا محمد علی کے درمیان اتحاد کا باعث ہے اور یہ مولانا محمد علی کے لیے مذہبی معاملہ ہے، لیکن اگر میں خلافت کے لیے جان قربان کر کے مسلمانوں کے چاقوؤں سے گائے کو محفوظ کر سکوں تو یہ میرے دھرم کا تقاضا ہے۔ بہرحال گاندھی کا خیال تھا کہ وہ تحریکِ خلافت کی حمایت کر کے مسلم ہندو اتحاد کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہے۔ منشی کے بقول جناح نے گاندھی کو وارننگ دی کہ وہ مسلمان راہنماؤں کی تشدد پسندی کو ہوا نہ دیں۔ بے شک جناح واحد انسان نہیں تھا جس نے اس خطرے کو محسوس کیا۔ سری

نیواس شاستری نے بھی لکھا ہے کہ مجھے خدشہ ہے کہ یہ تحریک ہمیں تباہی کی طرف لے جائے گی۔ کئی برس بعد گاندھی نے مسٹر رچرڈ کیسی، گورنر بنگال کو بتایا کہ جناح نے اسے کہا تھا کہ وہ مذہب کو سیاست میں لا کر ہندوستانی سیاست کو تباہ کر رہے ہیں"(22)

موجمدار کے مطابق گاندھی کو چونکہ ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ اپنے پسندیدہ نظریات کی تشہیر کی فکر تھی اسی لیے "مسلمانوں کا گوکھلے" انھیں پسند نہیں تھے کیونکہ وہ انھیں آزاد کی طرح "ٹالسٹائی" ماننے کو تیار نہیں تھے اور وہ مہاتما کو مسٹر کہنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جونہی گاندھی جی کی نظر مولانا آزاد پر پڑی وہ بھانپ گئے کہ انھیں مسلمانوں کے قریب لانے میں یہ شخص کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ جناح ایک محب وطن ہندوستانی تھے جن کی زندگی کا مقصد اپنے مادر وطن کو آزاد کروانا تھا لیکن گاندھی جی کے لیے ہندوستان کی آزادی ثانوی حیثیت رکھتی تھی ان کا اوّلین مقصد اپنی ذات اور اپنے پسندیدہ نظریات کی تشہیر تھا۔ وہ سرزمین ہند کو گاندھی ازم کے فروغ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے فلسفے کی جے جے کار محض ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں سننا چاہتے تھے۔ اس نقطہ نظر سے جناح ان کے لیے قطعاً بیکار تھے۔ انھوں نے جناح کو کانگرس کا متوالا، دادابھائی نوروجی کا شاگرد، گوکھلے کا منظورِ نظر، اور ہندو مسلم اتحاد کا سفیر ہونے کے باوجود مسترد کر دیا اور مسلمان انتہا پسندوں کے گلے لگ گئے جن میں محمد علی اور شوکت علی کے علاوہ ایسے لوگ شامل تھے جن کا ماضی فرقہ واریت سے وابستہ تھا۔"(23)

گاندھی نے خلافت پلیٹ فارم استعمال کرتے ہوئے اپنے عدم تعاون کا پروگرام لانچ کیا۔

"یکم اگست 1920ء کو تلک کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چھ ہفتے بعد کلکتے میں کانگرس کا خصوصی اجلاس ہوا۔ لالہ لاجپت رائے صدر تھے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تجویز پیش کی تو مسز بیسنٹ، جناح، سی آر داس، اور مہاراشٹر سے تلک کے ساتھیوں نے تجویز کی مخالفت کی۔ جناح، ان کی بیوی، جیکر، عمر سوبانی، جمنا داس اور شنکر لال کانگرس سپیشل ٹرین سے کلکتہ گئے تھے۔ ہاوڑا اسٹیشن پر موتی لعل نہرو جناح سے ملے۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔ موتی لعل نہرو نے جناح کو بتایا کہ گاندھی جی عدم تعاون کی تجویز پیش کرنے والے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہونگے کہ کونسل اسمبلی وغیرہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ موتی لعل نے جناح کو مشورہ دیا کہ وہ مسز بیسنٹ، سی آر داس، لالہ لاجپت رائے، اور مالویہ کے ساتھ مل کر اس تجویز کو نامنظور کرائیں لیکن اس کے دس بارہ دن بعد جب تجویز پر ووٹ لینے کا

وقت آیاتو اپنے بیٹے جواہر لعل نہرو کے اثر میں آکر خود موتی لعل نے گاندھی جی کے ساتھ اس تجویز کی موافقت میں ووٹ دیا۔ ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی تو ایسا گمان ہونے لگا کہ تجویز نامنظور ہو جائے گی۔ چنانچہ نہایت ہوشیاری سے رائے شماری کا کام اگلے دن پر اٹھار کھا گیا۔ دوسرے دن عمر سوبانی اور شنکر لال ادھر ادھر سے کوئی سو آدمی جلسے میں پکڑ لائے اور ان سب نے گاندھی جی کی تجویز کے حق میں ووٹ دے دیا۔ تجویز معمولی اکثریت سے منظور ہو گئی۔ یہ ساری داستان اب تک امبیدکر کے سوا کسی اور نے بیان نہیں کی ہے۔"(24)

جناح صاحب کی مزاحمت

ایس کے بندو پادھیائے کا حوالہ دیتے ہوئے منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"ایک چشم دید کی رپورٹ کے مطابق جناح نے جو جانتے تھے کہ کانفرنس میں گاندھی لہر موجود ہے، تن تنہا عدم تعاون کو آپریشن تحریک کی بے خوفی سے (جس میں ان کی مقتدر شخصیت کا زور تھا) مخالفت کی۔۔۔۔ جناح، جس لیڈر کو اب سے صرف چند ماہ پہلے تک پبلک میں مہاتما کہہ کر خطاب کرتے تھے، (جیسا کہ لاکھوں دوسرے ہم وطن بھی) آج انھوں نے اسے کانگرس کے کھلے اجلاس میں مسٹر گاندھی کہہ کے مخاطب کیا تھا۔۔۔۔ شدید مخالفت کے باعث جناح اجلاس سے اُٹھ کر چلے گئے، بلکہ اسی رات ناگپور بھی چھوڑ دیا، تاہم وہ پبلک میں کہا کرتے تھے، میرا راستہ ہی صحیح راستہ ہے، آئینی طریقہ ہی صحیح راستہ ہے"(25)

ہیکٹر بولتھو اپنی کتاب میں اس اجلاس کے چشم دید گواہ سر چمن لال کی گواہی بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"دسمبر 1920ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ محمد علی جناح اس میں شریک ہوئے، لیکن وہاں جو کچھ ہوا اس نے انھیں کانگرس سے قطعی طور پر بددل کر دیا۔ ناگپور کے اجلاس کے مندوبین میں ملک کے ممتاز وکیل دیوان چمن لال بھی تھے، جو 1918ء میں پہلی دفعہ جناح سے ملے تھے۔ جناح کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ

"وہ بڑا پیارا اور سیدھا سادا انسان تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کسی قیمت پر کسی کے ہاتھ بکنے والا نہ تھا۔"

راقم الحروف سے گفتگو کے دوران دیوان چمن لال نے کانگرس کے ناگپور والے اجلاس کی یاد تازہ کی اور

گاندھی کی انتہا پسندی کے خلاف جناح کے احتجاج کا ذکر کیا۔ جناح نے اس موقع پر بڑے اعتماد سے یہ اعلان کیا تھا کہ:

"تم غلط راستے پر ہو؟ میرا راستہ ٹھیک ہے کیوں کہ آئینی اور قانونی طریق کار ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔"

یہ سن کر تحریکِ خلافت کے مشہور رہنما، مولانا محمد علی جوہر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے:

"جناح صاحب! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئینی طریق کار آپ کے ذہن پر سوار ہے۔ اس پر مجھے انگلستان کا ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ ایک دن کنزرویٹو پارٹی کا ایک نوجوان رکن کارلٹن کلب سے نکل کر پکیڈلی سرکس جا پہنچا، جہاں مکتی فوج کا جلسہ ہو رہا تھا مقرر نے اپنے خطبے کے دوران کہا: "دوستو اس راستے پر چلو کہ یہی خدا کا راستہ ہے۔" نوجوانوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے پوچھا: "جناب کتنے عرصے سے لوگوں کو اس راستے پر چلنے کی تلقین کر رہے ہیں؟" مکتی فوج کے خطیب نے جواب دیا۔ "بیس برس سے" اس پر اسے جواب ملا: اگر بیس برس میں یہ راستہ جناب کو صرف پیکڈلی سرکس تک پہنچا سکا تو اس کی انتہا معلوم۔"

دیوان چمن لال کا کہنا ہے کہ جناح یہ چبھتا ہوا طنز سن کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھیں بہت دکھ ہوا ہے اور پھر وہ چپ ہو گئے۔"

سٹینلے والپرٹ کے مطابق جناح صاحب کو گستاخانہ سلوک سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کو شیم شیم اور سیاسی ٹھگ کی آوازوں کے بیچ چپ ہونا پڑا۔ اس کے باوجود جناح صاحب اپنے مؤقف سے پیچھے نہیں ہٹے۔" (26)

اسی ناگ پور اجلاس کا احوال موجد ار ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"سی آر داس تو باقاعدہ گاندھی سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اچانک انھوں نے قلابازی کھائی اور گاندھی جی کے حامی بن گئے۔ سی آر داس کے ہتھیار ڈالنے سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاندھی جی نے میدان مار لیا ہے اور اب ان کی قرارداد کسی کی مزاحمت کے بغیر تالیوں کی گونج میں منظور ہو جائے گی۔ لیکن نہیں آہنی اعصاب کا مالک ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے ببانگ دہل قرارداد کی مخالفت کا اعلان کیا۔ یہ شخص محمد علی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ یہ شخص دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی شاندار اور باوقار کانگرس کی عمدہ روایات کا امین اور محافظ تھا۔ وہ کانگرس کی ایسی بربادی نہیں دیکھ

سکتا تھا۔جب محمد علی جناح نے اپنی جرات مندانہ تقریر میں مسٹر گاندھی اور مسٹر محمد علی جیسے الفاظ استعمال کیے تو مجمع میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔لوگوں نے چلا چلا کر جناح سے کہا کہ وہ گاندھی جی کو مہاتما گاندھی اور محمد علی جوہر کو مولانا کہہ کر مخاطب کریں۔جناح نے باآواز بلند یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔یہ کانگرس کا آخری اجلاس تھا جس میں جناح نے باقاعدگی سے شرکت کی"(27)

زاہد چوہدری کے مطابق جمیعت العلمائے ہند کی جانب سے 925 مولویوں کی دستخطوں سے ایک فتویٰ صادر کیا گیا جس میں مسلمانان ہند کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ گاندھی کی مجوزہ پر امن عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیں۔اس طرح موہن داس کرم چند گاندھی تحفظِ خلافت کے لیے مسلمانانِ ہند کا "امیر المومنین" بن گیا جبکہ اس نے مہاتما کی حیثیت سے ہندوؤں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انھیں "ایک سال" کے اندر سوراج حاصل کر کے دے گا۔"

گاندھی کے بلند و بالا عزائم، ہجرت اور موپلہ عوام کی بغاوت

موجمدار گاندھی کے بلند و بالا عزائم، مسلمانوں کی افغانستان کی طرف ہجرت اور موپلہ عوام کی بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی جی نے اپنے ان بلند و بالا خیالات کے لیے بہت کچھ داؤ پر لگا رکھا تھا۔وہ خود کو جولیس سیزر کے روپ میں دیکھا کرتے تھے۔ان کا سپنا ہندوستان میں ایک مقدس گاندھی سلطنت کا قیام تھا جس کے وہ بلا شرکتِ غیرے پوپ بننا چاہتے تھے۔واضح رہے کہ پوپ کا لفظی مفہوم پاپا یا 'باپو' ہی ہے۔دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ کسی کے کہنے سے پہلے انھوں نے خود اپنے آپ کو باپو کہنا شروع کر دیا اور اپنے خطوط پر 'باپو' کے نام سے دستخط کرنے لگے اس سے ان کے آئندہ عزائم پر روشنی پڑتی ہے وہ نہ صرف جدید ہندوستان کے باپ بلکہ پوری دنیا کے جنم دیوتا کہلانا چاہتے تھے۔اس مقصد کے لیے ان پڑھ اور جنوبی ہندو مسلم عوام کے مذہبی جذبات کا ان کے قابو میں ہونا بہت ضروری تھا۔کیونکہ برطانوی سرکار بھی اس شخص کے سامنے بے بس ہوتی ہے جو ایک اشارہ ابرو سے عوام کے مذہبی تشدد کو بھڑکا سکتا تھا"

آگے لکھتے ہیں کہ:

" ہندوستان میں اپنی مقدس سلطنت کے قیام کے بعد ان کا ارادہ اپنے مذہب اور اپنی ذات کو مزید فروغ دینے سے متعلق تھا۔ وہ پوری دنیا کو "حلقہ بگوش گاندھی ازم" دیکھنا چاہتے تھے۔ 1921ء میں جب انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو مندرجہ ذیل خط لکھا تو حقیقتاً ان کے ذہن میں یہی خیال جاگزیں تھا"صرف میرے انکسار اور عجز نے مجھے روکے رکھا و گرنہ میں اپنے گھر کی چھت پر چڑھ کر ببانگ دہل کہتا کہ عدم تعاون کا پروگرام صرف ہندوستان کے لیے نہیں پوری دنیا کے لیے ہے"(28)

ینگ انڈیا میں گاندھی کا مضمون 12 جنوری 1928ء کو شائع ہوا اس سے بھی گاندھی کے ان عزائم کا پتہ چلتا ہے:

"My ambition is much higher than independence. Through the deliverance of India, I seek to deliver the so-called weaker races of the earth from the crushing heels of western exploitation in which England is the greatest partner. If India converts, as it can, Englishmen, it can become the predominant partner in a world commonwealth of which England can have the privilege of becoming a partner, if she chooses. India has the right, if she only knew, of becoming the predominant partner by reason of her numbers, geographical position and culture inherited for ages. This is big talk, I know. For a fallen India to aspire to move the world and protect the weaker races is seemingly an impertinence. But in explaining my strong opposition to this cry for independence, I can no longer hide the light under a bushel. Mine is an ambition worth living for and worth dying for."

" میرا مقصد حصول آزادی سے کہیں بلند تر ہے۔ ہندوستان کے بعد میں روئے ارض کی دیگر غلام اقوام کو بھی آزاد دیکھنا چاہتا ہوں جو مغرب کے زیر تسلط کراہ رہی ہیں اور انھیں غلام بنانے والی استحصالی طاقتوں میں انگلستان سر فہرست ہے۔ اگر ہندوستان انگریزوں کے کلچر پر غالب آ جائے جس کی اس میں اہلیت بھی ہے تو یہ عالمی دولت مشترکہ کا اہم ترین رکن بن سکتا ہے۔ اس عالمی دولت مشترکہ میں انگلستان کی شمولیت پر بھی کوئی پابندی نہیں لگائی

جائے گی۔ ہندوستان کو میں نے اس لیے اہم ترین رکن قرار دیا ہے کہ اس کی آبادی، رقبہ، جغرافیائی حیثیت اور تہذیب و ثقافت پوری دنیا سے زیادہ مضبوط اور عظیم الشان ہے۔ آج کے کمزور ہندوستان کے لیے یہ خواب یقیناً حقیقت سے بہت دور ہے کہ وہ نہ صرف خود آزاد دنیا کا مانا ہوا ملک بن جائے بلکہ غلام اقوام کی رہنمائی بھی کرے۔ لیکن اب میں اس قندیل کی روشنی کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا۔ میر انصب العین اس قدر بلند ہے کہ اس کے لیے جینا اور مرنا دونوں سعادت ہیں۔"(29)

واپس آتے ہیں اپنے اصلی موضوع پر۔ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جاتا ہے۔ لوگ مذہبی جوش میں آکر اپنے گھروں کا سامان تک بیچتے ہیں اور افغانستان ہجرت کر جاتے ہیں۔ ظلم یہ ہوا کہ وہاں افغانستان میں انھیں قبول کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ سارے جرائم کسی کو نظر نہیں آتے کیونکہ یہ عظیم گاندھی سے سرزد ہوئے اور آزاد جیسے "صاحب بصیرتوں" نے ان کا ساتھ دیا۔ افغانستان پہنچ کر لوگوں کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا اس کا احوال بھی موجمار بیان کرتے ہیں:

"تحریکِ عدم تعاون کے رسمی آغاز کے بعد گاندھی جی اور علی برادران نے پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا تاکہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو آخری حد تک بھڑکایا جاسکے۔ ہزاروں مفلس، ان پڑھ اور بے بس مسلمان کسانوں نے اپنے گھر مسمار کر کے افغانستان کی جانب ہجرت شروع کر دی جس پر انھیں علی برادران نے اکسایا تھا۔ جب یہ لاچار انسان افغانستان کی سرحد پر پہنچے تو افغان حکام نے انھیں اپنے علاقے میں گھسنے نہیں دیا۔ یہاں پر ان کا افغان سپاہیوں کے ساتھ خونریز تصادم بھی ہوا۔ یہ بدنصیب افراد ناقابلِ بیان تکالیف برداشت کرتے ہوئے وطن واپس پہنچے۔ واپس آنے والوں کی تعداد جانے والوں سے نصف تھی۔ لاتعداد انسان اس ہجرت میں زندگی کی بازی ہار گئے واپس آنے والوں کی تکلیفوں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ وطن میں بھی بدنصیبیاں ہی ان کی راہ تک رہی تھیں۔ یہاں کوئی سامانِ زندگی باقی نہ تھا کیونکہ بیشتر لوگ اپنے گھر بار، کھیت کھلیان اور ڈھور ڈنگر بیچ کر افغانستان گئے تھے۔"

زاہد چوہدری "مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء" میں لکھتے ہیں کہ "ایک غیر سرکاری اندازے کے مطابق مولویوں کے اس فتوے کی بنا پر جن لوگوں نے تحریکِ ہجرت میں حصہ لیا تھا ان کی تعداد 5 لاکھ سے 20 لاکھ تھی۔" ('انڈین مسلمز آ پولٹیکل ہسٹری' از رام گوپال)

افغانستان میں رہنے کی اجازت نہ ملنے پر ان کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اب وہ نہ ادھر کے رہے تھے نہ

ادھر کے۔ وہ افغانستان میں نہیں رہ سکتے تھے لیکن اگر واپس اپنے گھروں کو جاتے تو ان کے پاس اب زمینیں نہیں تھیں اور کاروبار بند ہو چکے تھے۔ مہاجرین کی ایک کثیر تعداد خصوصاً بوڑھے عورتیں اور بچے سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکے تھے اور راستے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ پشاور سے لیکر کابل تک (کی) سڑک ان بدنصیب بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی قبروں سے بھر گئی تھی اور جو لوگ واپس اپنے آبائی وطن پہنچ گئے تھے ان کی حالت بہت بری تھی۔ ان کے پاس نہ تو کوئی مکان، نہ کوئی پیسہ، اور نہ ہی کوئی ذریعہ روزگار تھا۔ وہ "دارالحرب" میں اپنا سب کچھ اونے پونے فروخت کر کے "دارالسلام" گئے تھے۔"

اس دوران مالابار میں موپلاؤں نے محمد حاجی کی زیر قیادت "خلافت کی حکومت" قائم کر لی۔ جس نے باقاعدہ بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ پولیس سے جب یہ بغاوت کنٹرول نہیں ہوئی تو بغاوت کچلنے کے لیے فوج کو بلایا گیا۔ 7 جنوری 1922ء کو موپلاؤں کے خلیفۃ المسلمین محمد حاجی کو گرفتار کیا گیا اور 20 جنوری کو اسے اپنے 21 ساتھیوں سمیت گولی مار دی گئی۔

موجمدار اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "دریں اثنا ایک اور نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ مالابار میں موپلہ عوام نے بغاوت کر دی۔ موپلہ عوام کی اکثریت مسلمانوں پر مبنی تھی اور وہ ماہی گیری اور کھیتی باڑی سے گزر اوقات کرتے تھے۔ تحریکِ خلافت نے ان پر امن انسانوں کو مذہبی جنون اور فرقہ واریت سے آشنا کر دیا۔ انھوں نے قیامِ خلافت کے لیے اعلانِ جہاد کیا تو لاتعداد انگریزوں، بے گناہ ہندو زمینداروں اور مہاجروں کو بے دردی سے ہلاک کرنے کے علاوہ ان کے گھر اور مندر نذر آتش کر دیے۔ متعدد ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا گیا۔ حکومت نے بھی جواباً موپلہ مسلمانوں کے خلاف پوری قوت سے کاروائی کی اور وسیع پیمانے پر جانی نقصان ہوا۔" (30)

اسی نقصان کے بارے میں منصور احمد (انڈین مسلم) لکھتے ہیں کہ:

> "رام گوپال ہی کے مطابق شورش کو دبانے کے سلسلے 2266 موپلا مارے گئے 1615 زخمی ہوئے 5688 پکڑے گئے اور 38256 نے خود سپردگی کی۔ ایک خاص واقعہ میں 70 (ستر) موپلاؤں کو (کچھ رپورٹوں کے مطابق 100) ایک مال گاڑی کے ڈبے میں بند کر کے کالی کٹ سے مدراس لے جایا جا رہا تھا، جب ڈبے کو پودنور ریلوے اسٹیشن پر کھولا گیا تو پایا گیا کہ 66 (چھیاسٹھ) آدمی مر چکے تھے اور باقی بدترین حالت میں تھے۔" (31)

تاہم منصور احمد بندوپادھیائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ موپلاؤں پر ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی بات حقیقت سے زیادہ الزام تھی ان کے مطابق اس شوشے کو لیکر ہندوؤں نے سنگھٹن کی تحریک چلائی جس کا مقصد ہندوؤں کے درمیان ذات پات کے اختلاف ختم کر کے انھیں منظم کرنا تاکہ وہ مسلمانوں کے سامنے ایک طاقت بنے رہیں۔ سنگھٹن تحریک کے بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھے وہی مالویہ جس کے زیر اثر آکر دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی نے وائسرائے ایگزیکٹو کونسل میں مسلمانوں کی ایک سیٹ کی فرمائش رد کر دی۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس تحریک کے بعد دونوں طرف کے شدت پسندوں کو تحریک ملی۔

موجمدار کے مطابق گاندھی جی کی تحریک خلافت میں شمولیت سے میثاق لکھنؤ خود بخود مسترد ہو گیا جو جناح کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ لکھنؤ کے اس معاہدے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلافات کو بہت حد تک مٹا دیا تھا لیکن تحریک خلافت نے ان اختلافات کو بھڑکا کر اپنے مقاصد حاصل کیے کیونکہ یہ بنیادی طور پر مذہبی جنون پر مبنی تحریک تھی۔

ٹنڈولکر کے مطابق تحریک خلافت ختم ہونے پر کچھ ہندو اور مسلمان گاندھی سے اس طرح شکوہ کرتے نظر آئے:۔

> "Some Hindus laid the blame at Gandhi's door: "You asked the Hindus to make common cause with the Muslims on the Khilafat question. That resulted in unifying and in awakening the Musalmans, and now that the Khilafat is over, the awakened Muslims have proclaimed a kind of holy war-against us Hindus." The Muslims said: "We simple-minded people have been unjustly treated. You by your agitation won over Mahomed Ali to your side and you attacked the famous institution at Aligarh built with patient care by Sir Syed Ahmed. Your boycott of the councils prevented our able men from going to the councils to the prejudice of the interests of our community."

"ہندوؤں نے گاندھی کو الزام دیتے ہوئے پوچھا " آپ نے خلافت کی خاطر ہمیں مسلمانوں سے اتحاد کا درس دیا تھا لیکن اب جبکہ وہ تحریک ختم ہو چکی ہے تو بیدار مسلمانوں نے وہی جہاد ہندوؤں ہی کے خلاف شروع کر دیا ہے۔ جب کہ مسلمانوں نے کہا" آپ نے

اپنی تحریک میں ہم سادہ لوح مسلمانوں کو بالکل مہروں کی طرح استعمال کیا۔ یہاں تک کہ محمد علی کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے آپ نے علی گڑھ کے اداروں کو زک پہنچانے سے گریز نہیں کیا، جنھیں سر سید نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔ مجالس قانون ساز کا بائیکاٹ کر کے آپ نے نہایت قابل مسلمانوں کو وہاں پہنچنے اور ترقی کرنے سے روک دیا جس سے بحیثیت قوم مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا۔" (32)

ناگ پور اجلاس کے بعد جب علی برادران کے ساتھ گاندھی علی گڑھ پہنچے تو علی برادران چاہتے تھے کہ یونیورسٹی کے ٹرسٹی حکومت سے امداد لینا بند کر دیں تو یونیورسٹی کے چانسلر جناب ضیاالدین اس کوشش کے راستے میں رکاوٹ بن گئے۔ وہاں کسی نے گاندھی سے پوچھا کہ آپ پہلے بنارس کالج کیوں نہیں توڑتے تو گاندھی کا جواب تھا کہ اس پر مدن موہن مالویہ جی تیار نہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کی یہ شکایت بلاجواز نہیں تھی کہ خلافت کی حمایت کی آڑ میں گاندھی نے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچایا۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے موجمدار آگے لکھتے ہیں کہ:

"اگر ہندوستان کے مسلمان رتی بھر شعور کا مظاہرہ کرتے ہوئے ترکی کے مسلمانوں کی سرگرمیوں اور مطالبات پر غور کیا ہوتا تو وہ جان جاتے کہ ترکی کی جدید قیادت موصل کے تیل کے کنوؤں کا قبضہ حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی اور اسے خلیفہ کے زیر اختیار علاقے اور مقدس مقامات سے سر مو کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ امر رنج والم سے خالی نہیں کہ ہندوستان کے مجہول مسلمان عرب علاقوں پر ترکی کا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار تھے جبکہ ترکی خود موصل کے تیل کے کنوؤں کی خاطر عرب، شام اور فلسطین کے علاقوں سے قبضہ چھوڑنے پر تیار تھا۔ 3 مارچ 1944ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے تحریک خلافت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ جس شخص کو خلیفہ عبد المجید نے ملک بدر کر دیا تھا، وہ اتاترک بن کر لوٹا اور اس نے ترکی میں خلافت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ ترکی خلافت تو ختم ہو گئی لیکن تحریکِ خلافت کے زہریلے اثرات ہندوستان کی سیاست سے کبھی ختم نہ ہو سکے۔"(33)

اس حوالے سے اندولال یاجنک کا یہ تبصرہ بھی پڑھنے لائق ہے جس میں تحریک کو شروع کرنے والے رہنماؤں کی بے بصیرتی و کوتاہ نظری، گاندھی کی طرف سے مذہب کے استعمال اور تحریکِ خلافت کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"تعجب کی بات معلوم ہو گی کہ ترکی سلطنت کے اصل سپاہی اور شہری تو اہلِ برطانیہ کے اقتدار کے خلاف بلکہ

اتنا ہی اپنے سلطان کے خلاف بھی بدحواسی سے لڑ رہے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں نے شاخ زریں پر پھر خلیفہ کا اقتدار قائم کرنے کے لیے ایک عجیب وغریب شورش بپا کر رکھی تھی۔ اس بیان کا اضافہ کرنا بھی ناموزوں نہ ہوگا کہ نہ مصر کے سنی عربوں نے شورش خلافت میں کسی موقع پر اور کسی صورت میں اپنی دلچسپی ظاہر کی نہ فارس کے شیعوں نے۔

لیکن خلافت کانفرس جو نومبر 1919ء کے شروع میں دہلی میں منعقد ہوئی اس نے ان واقعات پر نہ غور کیا اور نہ اُن واقعات کی پرواکی جو انھیں ممالک میں رونما ہو رہے تھے جن کے متعلق یہ لوگ اتنی دلچسپی لے رہے تھے۔ صاف روشن ہے کہ کسی نے یہ معلوم کرنے کی زحمت نہ اُٹھائی کہ آیا کسی مسلم سرزمین میں ان کی تحریک کے متوازی کوئی اور تحریک بھی ہے یا نہیں۔ علما اور مولویوں کی شرعی اور نیم شرعی جماعتوں پر مشتمل مسلمان لیڈروں نے باآسانی اس کا یقین کر لیا کہ حکومت برطانیہ نے خلافت کے پاک مقاصد کے ساتھ دغا۔ برطانوی حکومت نے واقعی دوران جنگ عربوں کے تحفظ کے پکے معاہدہ کی برملا خلاف ورزی کرتے ہوئے بیشتر اسلامی ممالک میں اپنے آہنی قدم جما دیے تھے لیکن حقیقی سیاست ان مجلسوں میں پس پشت ڈال دی گئی تھی اور ان میں اسی نکمے اور ناقص سلطان کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کو پھر سے قائم کرنے کا شور مچایا جا رہا تھا جس کے خلاف خود اس کی قدیم رعایا، اسی طرح علَمِ بغاوت بلند کر چکی تھی جیسے اس نے برطانیہ کے خلاف کیا تھا۔ ہندو لیڈر جو اس کانفرس میں مدعو کیے گئے تھے وہ بھی گاندھی جی اور شاردھانند جیسے انسان تھے جن کی سیاست ہمیشہ ایک گہرے مذہبی رنگ سے رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ گاندھی جی اپنی ستیہ گرہ کی جدوجہد کی وجہ سے محارہانہ سیاست میں بلند مرتبہ حاصل کر چکے تھے۔ اس نے ان کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ہندو ساتھیوں کو کانفرنس میں یقین دلا دیں کہ ہندوستان کے ہندوؤں کا یہ بین فرض ہے کہ خلافت کے سلسلے میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کے لیے وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہر جنگ میں دوش بدوش کھڑے ہوں۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

"انھیں ہندوؤں کے تفریقی تعصبات کو برانگیختہ کرنے میں بھی کوئی پس وپیش نہیں ہوا۔ اسی تحریک میں انھوں نے، تحفظِ گاؤ کا مسئلہ بھی ٹھونس دیا۔ بردولی کے قصے کے بعد انھوں نے لکھا کہ عوام گانگرس میں اس لیے شامل ہوئے ہیں کہ وہ خلافت اور گائے کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان سے خلافت کے امداد کی توقع ختم کر دو۔ وہ گانگرس کو خیر باد کہہ دے گا۔ ہندو سے کہہ دو کہ وہ گانگرس میں رہ کر گائے کی حفاظت نہیں کر سکتا تو ایک ہندو بھی گانگرس میں نہ رہ جائے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کی ذہنیت تو ضرور خلافت سے وابستہ ہو چکی تھی لیکن ہندو ذہنیت کی یہ تشخیص بالکل لغو ہے۔ کوئی ذی ہوش آدمی یقین نہیں کر سکتا کہ کروڑوں ہندو

جو کانگرس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے ان کے دل میں اس قسم کی تحریک رہی ہو کہ ہم لوگ مسلمانوں کے چھرے سے گائے کو محفوظ رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تاہم گاؤکشی کے مسئلے کو اکثر ایک سیاسی مسئلے کی حثییت سے پیش کیا جاتا رہا۔ ہندوؤں کے مذہبی جنون کو اس اُمید پر زندہ رکھا جارہا تھا کہ خلافت کی نام نہاد جنگ میں برادرانہ شرکت کا انعام انھیں یہ ملے گا کہ ہندوستان میں گاؤکشی بند ہو جائے گی۔ یہ توقعات پوری نہ ہوئیں اب اگر ہندوؤں جذبات مجروح ہوئے اور فرقہ وارانہ فسادات کا باعث بنے تو اس کی بھی اصل ذمے داری گاندھی جی پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جب تک وہ میدان میں پہنچے سیاسی جنگ تو ختم ہو چکی تھی لیکن ان کے بوئے ہوئے منحوس بیج البتہ بار آور ہو رہے تھے اور زہریلی فصلیں خوب زوروں پر کاٹی جارہی تھیں۔ مگر گاندھی جی حسب دستور خود فریبی کے جوش میں اپنے کرتوتوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جس قضیہ خلافت کی انھوں نے اتنی زوروں میں حمایت کی تھی اس کے متعلق حال ہی میں جو حالات رونما ہوئے تھے ان کی طرف سے بھی وہ آنکھیں بند کیے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ سیاسی اور دنیاوی آزادی کے مقابلے میں نہ صرف مذہبی محرکات کو برطرف کر دیا گیا تھا بلکہ فاتح مصطفیٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ سے خلافت کا قصہ ہی بالکل ختم کر دیا تھا۔ حالانکہ ہندوستان کے کج رو مسلمان خلافت کو بچانے کے لیے برابر سر دُھنتے رہے۔ یہ سارا تماشا گاندھی جی کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اور اس کو سمجھنا اور اس سے سبق لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ روحانی دقیانوسیت پر دنیاوی قوت کی برتری ایک خیالی مذہبی سلطنت پر جدید طرز کی جمہوریت کی فوقیت اور شکستہ حال توہم پرستی پر جارحانہ وطن دوستی کا تفوّق، خود پائے گاہِ خلافت میں ثابت ہو چکا تھا۔ مگر گاندھی جی نے اس سے نہ کوئی سبق سیکھا اور نہ پرانا خیال ترک کیا۔ انھیں اپنے کرتوتوں پر کوئی ندامت تھی نہ ان کے خیالات میں کسی اصلاح کی گنجائش نظر آتی تھی۔

یہ غالباً پہلی مرتبہ تھا کہ ایک بڑی قومی تحریک کی بنیاد مذہبی تخیلات اور ایک گروہ کی توہمانہ شکایات پر رکھی گئی۔ یہ ایسا وقت تھا کہ ایک طرف عہد وسطیٰ کے کٹر مولاناؤں مولویوں اور عالموں اور دوسری طرف کٹر سادھوؤں، سنیاسیوں نے اس نئے سیاسی پلیٹ فارم پر یورش کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی دلائل اور مقدس کتابوں نے سیاسی مصلحتوں اور عقلی براہین کی جگہ باآسانی چھین لی۔ سیاسی تقریروں کے ہر دوسرے جملے میں رام، کرشن، قرآن اور اللہ کی سندیں پیش کی جانے لگیں۔ عوام کے بڑے بڑے مجمعوں کو ہندوستانی کہنے کے بجائے ہندو اور مسلمان کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا۔ دونوں کے مذہبی جذبات جو متعدد حیثیتوں سے 'میں' باہم مخالف اور متضاد تھے۔ کسی نہ کسی طرح ترک موالات کے عملی پروگرام کی تائید میں متفق کر کے پیش کیے جانے لگے۔ مختصر یہ کہ ہندوستانیوں کے گرد پرانی دنیا کے توہمات اور مجنونانہ جذبات کا طوفان برپا کر دیا گیا۔

تاکہ عوام سیاسی مسائل کے تقاضوں اور استدلال کی غیر ہنگامی روشنی کو بالائے طاق رکھ کر جذباتی ہیجان اور مذہبی عقائد کی روشنی میں بے تحاشا اس لائحہ عمل کی طرف دوڑ پڑیں۔

"ولبھ بھائی مزاح کا ایک نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے اور ہمارے خلافت کے متبرک مقاصد کا بہت مذاق اُڑاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا غور کرو، عرب فلسطین، شام اور عراق عرب کے لیے ہمارا لڑنا جب کہ ہم خود اپنے ملک میں برطانوی سنگینوں کے نیچے غلام بنے ہوئے ہیں۔ یہ اچھا خاصا تماشا نہیں تو اور کیا ہے؛"(34)

اب آپ اس پورے منظر نامے پر دوبارہ نظر دوڑائیں کہ جو واقعات پیچھے بیان ہوئے ہیں ان میں جناح صاحب کہاں اور کیوں غلط تھے؟

کیا گاندھی کو ہوم رول لیگ میں لیکر آنا غلط تھا؟

کیا ملوکیت کی یادگار خلافت کی تحریک کی حمایت نہ کرنا غلط تھا جہاں بغیر سوچ سمجھے گاندھی و ہمنوا نے سادہ لوح لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر انھیں مروایا؟

موجمدار لکھتے ہیں کہ جناح کو ان کے آئینی راستے سے کوئی نہیں ہٹا سکا اپنے ہم مذہبوں میں عدم مقبولیت کا خوف بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکا۔

عدم تعاون میں شرکت کی پیشکش پر جناح صاحب کا جواب

گاندھی نے جب عدم تعاون کا ڈول ڈالا تو جناح صاحب کو ایک خط لکھا اور اپنے "عدم تعاون" کے لیے تعاون مانگا تو جناح صاحب نے درج ذیل جواب دیا:

"میں آپ کی اس تجویز کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں جو آپ نے میرے لیے رکھی ہے کہ میں ملک میں جو نئی زندگی آئی ہے، اس میں حصہ لوں۔ اگر نئی زندگی، سے آپ کی مراد، آپ کے طریقے اور پروگرام ہیں۔ تو معاف کیجئے کہ میں انھیں قبول نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ تباہی و بربادی کی طرف لے جائیں گے۔۔۔ آپ کے طریقوں نے پہلے ہی ان تنظیموں میں، جن کو آپ نے اب تک ہاتھ لگایا ہے، تقسیم اور دراڑ پیدا کی ہے اور ملک کی عوامی زندگی میں بھی، نہ صرف ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان بلکہ ہندو اور ہندو اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان بھی یہاں تک کے باپ اور بیٹے میں بھی، ملک کے طول و عرض میں لوگ عمومی طور پر بے اطمینانی اور مایوسی کی کیفیت میں پڑے ہوئے ہیں، آپ کے انتہا پسندانہ اقدام نے ناتجربہ کار نوجوانوں، سادہ لوحوں اور اَن پڑھوں کے

ہی دماغ کو متاثر کیا ہے، ان سب کا مطلب ہے انتشار اور افراتفری انجام اس کا کیا ہو گا اس خیال سے میں کانپ جاتا ہوں۔۔۔۔۔

نیشنلسٹوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ متحد ہو جائیں اور ایسے پروگراموں پر کام کریں جنھیں سب قبول کر لیں، کہ یہی راہ ہے مکمل خود اختیاری حکومت کے جلد حصول کی۔ ایسا پروگرام کسی ایک فرد کی تحکمانہ ہدایت پر نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اسے ملک کے سارے اہم نیشنلسٹ لیڈروں کی حمایت اور قبولیت حاصل ہونی چاہیے اور اس مقصد کے لیے مجھے یقین ہے کہ میں اور میرے رفقاء ہمہ تن تیار اور کاربند رہیں گے"

اس میں جناح صاحب ایسی کونسی غیر معقول بات کر رہے کہ نیشنلسٹوں کے لیے ایک ہی راستہ کہ وہ متحد ہو جائیں اور ایسے پروگراموں پر کام کریں جنھیں سب قبول کریں۔ کسی ایک فرد کی تحکمانہ ہدایت پر نہیں بلکہ آگے بڑھنے کے لیے سب کی رضامندی ضروری ہے اس کے لیے میں حاضر ہوں۔ یہی کچھ ٹیگور نے بھی گاندھی کی آمریت پر تنقید کرتے ہوئے گاندھی کو مخاطب کرتے لکھا کہ ہندوستان کو اپنا عظیم مقصد محض ایک آقا کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔

عدم تعاون پر رابندر ناتھ ٹیگور کا ردِ عمل

عدم تعاون کی تباہ کاریوں سے صرف جناح صاحب ٹنڈولکر دوسری اہم شخصیات نے بھی گاندھی کو روکنے کی کوشش کی۔ ان میں ایک رابندر ناتھ ٹیگور بھی تھے۔ ٹنڈولکر "مہاتما جلد دوم" میں ٹیگور کا ردِ عمل ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"We need all the moral force which Mahatma Gandhi represents, and which he alone in the world can represent. It is criminal to transform moral force into force. My prayer is that India may represent the co-operation of all the peoples of the world. For India, unity is truth, and division evil. Unity is that which embraces and understands everything; consequently, it cannot be attained through negation. The present attempt to separate our spirit from that of the Occident is tentative of spiritual suicide. . . The present age has been dominated by the Occident, because the Occident has a mission to fulfil. We of the Orient should learn from the Occident.

The problem is a world problem. No nation can find its own salvation by breaking away from others."

"ہمیں ان تمام اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے جن کی نمائندگی گاندھی جی کر رہے ہیں اور پوری دنیا میں صرف وہی کر سکتے ہیں لیکن اخلاقی قوت کو تخریبی طاقت بنادینا صریحاً مجرمانہ ہے۔میں ہندوستان کے عوام کو عدم تعاون کے بجائے تعاون پر آمادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔کیونکہ اتحاد سچائی اور نفاق جھوٹ ہے اور اتحاد منفی ہتھکنڈوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔عوام کو مغرب سے متنفر کرنے کی حالیہ کوشش روحانی خودکشی کے مترادف ہیں۔ہمارا دور مغربی فلسفے کا دور ہے کیونکہ اس نے انسانیت کو ایک مشن دیا ہے۔ہم اہلِ مشرق کو مغرب سے سیکھنا چاہیے۔کوئی قوم دنیا بھر سے کٹ کر ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔"(35)

موجمدار کے مطابق ٹیگور نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔سانحہ جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مظالم کے بعد انھوں نے سرکار برطانیہ کو سر کا خطاب بھی واپس کر دیا تھا لیکن یہ انھوں نے سب انفرادی حیثیت میں کیا لیکن انھیں احساس تھا کہ ایسے حساس موقعے پر ان پڑھ عوام کے جذبات کو بھڑکانا نہیں چاہیے چنانچہ انھوں نے مکمل خاموشی اختیار رکھی۔تاہم انھوں نے ضرورت محسوس کی کہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات پر گاندھی جی کو بروقت انتباہ کیا جائے انھوں نے متعدد خطوط میں گاندھی کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی ٹیگور نے اپنا ایک ذاتی منشور بھی جاری کیا جس میں گاندھی جی کے آمرانہ روّیے کی سخت مذمت کی گئی تھی۔ٹیگور کے اس منشور کا ایک اہم اقتباس درج ذیل ہے:

"In a manifesto, "A Call of Truth", published in Modern Review dated October 1921, Tagore wrote: "An outside influence seemed to be bearing down the people, grinding them and making one and all speak in the same tone, follow the same groove. Everywhere I was told that culture and reasoning should abdicate, and blind obedience only reign.

A cause as great as India's should not be dependent on the will of a single master .Emotion and enthusiasm are required but also science and meditation."

"مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عوام کو کسی بیرونی دباؤ کے تحت بیک زبان بولنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور وہ بلاوجہ بھیڑ چال میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ ہر جگہ کلچر اور عقل وشعور کو کچل کر اندھی تقلید کا رواج عام کیا جارہا ہے۔۔۔ہندوستان کو اپنا اس قدر عظیم مقصد محض ایک آقا کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں جذبات اور ولولے کے ساتھ ساتھ سائنس اور غور وفکر کی بھی ضرورت ہے۔"(36)

طلبا کے تعلیمی کیریئر کی تباہی

گاندھی کے مطابق برطانوی سرکار کے زیر اہتمام تعلیمی ادارے غلام ذہنیت تیار کر رہے ہیں اس لیے ان تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ بھی ضروری ہے۔

اندولال اس بارے لکھتے کہ:

"انھوں نے اس مقاطعے کی رفتار اس طرح اور بڑھا دی کہ سولہ برس سے زائد عمر کے طالب علموں اور طالبات سے براہِ راست اپیل کرنے لگے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی سے قطع نظر بطورِ خود ان حکومت زدہ مدرسوں سے تعلق ترک کردیں۔ بہت سے روشن خیال والدین نے ایسی اپیلوں کے خلاف کچھ نرم اور گرم احتجاج کیا، ان درخواستوں کا جن کی بنیاد اطاعت والدین اور خاندانی نظم وضبط کے مقدس اُصولوں پر رکھی گئی تھی گاندھی جی پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ نوجوانوں سے بدستور براہِ راست درخواست کرتے رہے حتیٰ کہ انھوں نے ہندوستانی مذہبی تاریخ اور اساطیر سے مقدس مثالیں پیش کرکے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ والدین کی مرضی کو نظر انداز کرکے ترکِ موالات کے صراط مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔"(37)

جے کار کے مطابق "گاندھی جی کی بدترین حرکتوں میں سے ایک طلبا کے جذبات کو بھڑکانا اور ان کی عزت نفس کے تصور کو غلط رنگ دینا تھا۔"

موجمدار لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی جی کی تقریریں طلبا پر سم قاتل بن کر اثر انداز ہوئیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں طلبا نے سلسلۂ تعلیم ترک کر کے گلیوں میں آوارہ پھرنا شروع کر دیا۔ ان کے ذہن میں حب الوطنی کے تصورات نہایت غیر واضح اور موہوم تھے بس وہ گاندھی جی کے حکم پر دیش بھگتی کر رہے تھے"

جناح صاحب نے اس معاملے میں بھی مزاحمت کی۔ ناگپور اجلاس میں جناح صاحب کو ہجوم نے تقریر نہیں کرنے دی تاہم انھوں نے اس تحریک پر اپنے خیالات کا اظہار فرگوسن کالج پونا میں کچھ اس طرح کیا کہ

> "وہ گاندھی جی کی بے حد عزت کرتے ہیں لیکن انھیں یقین ہے کہ تحریک عدم تعاون کا تعلیمی و سیاسی پہلو ملک و قوم کے لیے ہر اعتبار سے ہلاکت اور تباہی کا باعث بنے گا۔ جناح صاحب کا خیال تھا کہ اس موقع پر صحیح سیاسی نظریات پر مبنی خالصتاً سیاسی تحریک چلائی جانی چاہیے جو ہر شخص کے جذبہ حب الوطنی سے مطابقت رکھتی ہو۔ جب تک ہندوستانی سیاست نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا اس کا گمراہ ہونا لازم ہے۔"

انھوں نے گاندھی جی اور ان کے پیروکاروں کے متعلق کہا کہ "وہ جذباتی اور روحانی ذرائع سے سیاست کا میدان مارنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیاست میں کام محض سیاسی ذرائع ہی سے چل سکتا ہے۔ گاندھی جی اور ان کے حواری انسان کی حقیقی سرشت کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں حالانکہ انسان صرف انسان ہوتا ہے اسے فرشتہ فرض کر لینے سے بڑی کوئی حماقت نہیں۔"

ہیکٹر بولتھو کے مطابق :

> "گاندھی کے ان غیر معقول خیالات اور جذباتی نعروں کے جواب میں جناح کی دلیل بڑی معقول اور حقیقت پسندانہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر گاندھی انگریزی طرز کے اسکولوں کا بائیکاٹ کرانا چاہتے ہیں تو ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کی جگہ قومی مدرسے قائم کریں۔ ترک موالات اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پوچھا: "نیشنل کانگرس کے بیس ہزار مندوبین میں سے کتنے ہیں جو اب تک برطانوی مال کا قطعی بائیکاٹ کر چکے ہیں۔ "جناح نے کہا کہ وہ بائیکاٹ کی تحریک کی اسی صورت میں حمایت کریں گے جب ہندوستانی خود اپنے کارخانے قائم کریں، اور بدیسی مال کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ غرض کہ ہر مسئلے پر جناح اپنی صاف گوئی اور حقیقت پسندی سے گاندھی کے سیاسی تصورات اور نعروں کو آسمان سے زمین پر کھینچ لاتے اور ان کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کر دیتے۔"(38)

موجمدار کے مطابق گاندھی ان بے کار طلبا سے روزانہ پانچ پانچ گھنٹے چرخہ کتواتے تھے اور اگر ان میں کوئی سکت باقی رہتی تو انھیں ہندی سکھائی جاتی۔ موجمدار سوال اٹھاتے ہیں کہ "کیا اس سے بڑھ کر نوجوانوں کے کیریئر کی تباہی کسی طرح ممکن تھی" اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس سے بڑھ کر بھی ممکن تھی وہ اس طرح کہ گاندھی جی نے نوجوانوں کو شہر چھوڑ کر دیہات کا رخ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔"

پتہ بھائی ستیہ رمیانے تاریخ گانگرس کی جلد اول کے صفحہ 57 پر گاندھی کے چرخے اور تعلیمی اداروں کے متعلق لکھا:

"اندازہ کریں کہ وہ 60 لاکھ بچے بچیاں جنھیں اصولاً سکول میں زیرِ تعلیم ہونا چاہیئے تھا روزانہ دو دو گھنٹے سوت کاتا کرتے تھے اس سوت کو اکٹھا کرنے سے ہمالیہ کے برابر پہاڑ کھڑا ہو سکتا تھا اور کپڑے کے سمندر بہہ سکتے تھے۔"(39)

اندولال گاندھی سکیم کے تحت قائم کیے گئے تعلیمی اداروں کی حالت کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"نئی اسکیم کے تحت پرائمری سکولوں کی حالت بہت شرمناک ہوگئی تھی۔ میں اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ کمیٹی نے طلبا کے والدین کے ساتھ شدید بدعہدی کی ہے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو اس لیے ہمارے سپرد کیا تھا کہ ہم انھیں نوشت وخواند اور حساب کی عمدہ تعلیم دیں گے مگر اس کے بجائے ہم نے گندی اور بد نما عمارتوں میں نہایت ذلیل قسم کے اسکول قائم کر دیے تھے۔ جن میں فرنیچر تک نہ تھا۔ ان میں کچھ ٹوٹے پھوٹے چرخے رکھ دیے گئے تھے، وہ بھی ایسے کہ کسی کے کل پرزے الگ، کسی میں ایک حصہ ہے تو دوسرا نہیں، دوسرا ہے تو تیسرا نہیں۔ غرضیکہ محض بے کار جن سے کتائی کا کام بھی نہیں لے سکتے تھے۔

اس کے علاوہ کچھ سوت کے پلندے (جن میں اکثر مل کے بنے ہوئے تھے) کچھ پونیاں جن میں اُلجھے ہوئے دھاگے ہوتے تھے جو کرگوں پر لگائے بھی نہ جاسکتے تھے۔ غرض کہ یہ کل کائنات تھی جن سے ان اسکولوں کی تزئین کی گئی تھی۔ سیاسی پروپیگنڈے کی غرض سے دیہاتوں کا دورہ کرتے ہوئے میرے لیے یہ منظر بہت دردناک اور غم انگیز تھا کہ یہ الم انگیز تماشا یکے بعد دیگرے دیہاتوں کے ہر اسکول میں کیا جارہا ہے۔ اگرچہ میں اس وقت سیاسی قضیے میں اس قدر منہمک تھا کہ مجھے ان مدرسوں پر اس امر کے سوا اور کسی نکتہ نظر سے خیال کرنے کی مہلت نہ تھی۔ مگر میرے دل کی گہرائیوں میں یہ بات اُسی وقت سے کھٹکنے لگی کہ کیا لڑکوں اور لڑکیوں کی نئی نسل اور قومی تعلیم کے ان اغراض و مقاصد کے خلاف یہ گناہ نہیں ہے کہ ایک مقدس جنگ کے نام پر ایسا تماشا کھڑا کر دیا جائے۔" (40)

سری پرکاش آزادی کے بعد مہاراشٹر اور مدراس کے گورنر بھی رہے، گانگرس کے نامور رکن تھے سری

پرکاش اپنے ایک مضمون جو 12 اگست 1962ء کو "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" میں شائع ہوا، میں گاندھی کی طرف سے طلبا کے تعلیمی کیریئر کی تباہی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ سوال سب سے پہلے مجھ سے میرے بیٹے نے پوچھا جس کا جواب میں آج تک نہیں دے سکا۔ کیا یہ اس دور کے سیاسی رہنماؤں کے لیے جائز تھا کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے طالبعلموں کو استعمال کرتے اور ان کا تعلیمی کیریئر تباہ کرتے؟ کیا درس گاہوں کا پرامن ماحول بگاڑنا درست تھا؟ کیا یہ کسی ایسے شخص (گاندھی) کے لیے جائز تھا کہ وہ اپنے بن ماں کے بچوں کی ذمہ داریوں کو ترک کر کے عوامی زندگی میں انتشار پیدا کرنے کے لیے کود پڑتا۔ ہمارے پاس تو اس بات کی بھی ضمانت نہیں تھی کہ گاندھی جی یہ سب کچھ واقعتاً قومی خدمت کے لیے کر رہے تھے یا محض اپنا دل بہلانے کے لیے۔ یہ سوال جیسے خار بن کر میرے بیٹے کے دل میں چبھتے ہیں اس طرح ان کی کھٹک میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ اگر کوئی مجھے ان کا جواب دے سکے تو میں بہت مسرور ہونگا۔ میں جانتا ہوں کہ بہت سے نوجوانوں نے میرے بیٹے سے بڑھ کر تکلیفیں اٹھائی ہیں اور بہت سے باپوں نے مجھ سے بڑھ کر صدمات سہے ہیں" (41)

گاندھی سے شدید مخالفت کے باوجود، بقول موجمدار، جناح صاحب حکومت کے دام میں نہیں پھنسے وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ جناح نے ڈٹ کر گاندھی جی کی تحریکِ عدم تعاون کی مخالفت کی لیکن وہ حکومت کے اس دام میں نہیں پھنسے جو اس نے تحریک کے مخالفین سے فائدہ اٹھانے کے لیے بچھار کھا تھا۔

اگر جناح صاحب کسی عدم تحفظ کا شکار ہوتے تو گاندھی کو ہوم رول لیگ میں لیکر ہی کیوں آتے؟ اور سب سے اہم بات جب جناح کے کانگرس اور گاندھی کے ساتھ بڑھتے فاصلوں کی وجوہات پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کہیں نظر آتا ہے کہ جناح صاحب کا مؤقف غلط تھا؟

نہرو رپورٹ اور ہندوستانی قوم پرست جناح کا الوداعی نغمہ

جناح صاحب کانگرس سے علیحدہ ہو چکے لیکن اس کے باوجود ابھی تک وہ ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے ہیں۔ 1924ء میں جناح صاحب مسلم لیگ کے اس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے جسے لاہور میں منعقد ہونا تھا۔ اجلاس سے ایک روز قبل انھوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنی پالیسی پر روشنی ڈالی۔

1. ہندوستان کے آئین میں ترمیم۔

2. پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ اور یہاں ہم آہنگی کی خوشگوار فضا قائم کرنا۔

3. آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان 1916ء جیسی مکمل فکری یک جہتی کے قیام کے لیے کوششیں کرنا مسلم لیگ کوئی بھی ایسی پالیسی وضع نہیں کرے گی جو کانگرس کے نظریات سے متضاد ہو۔۔۔اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ کی پالیسی ایسے خطوط پر وضع کی جائے گی جن سے قومی مفادات کو مزید تقویت حاصل ہو۔ تاہم مسلم اقلیت کے خصوصی مفادات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

اپنے خطبہ صدارت میں انھوں نے کہا:

> ”سوراج کے حصول کی خواہش کا بنیادی تقاضا ہندو مسلم اتحاد ہے خاص طور پر سیاسی یک جہتی (یہاں جناح کی تقریر میں ”سوراج“ لفظ کا استعمال اس امر کا شاہد ہے کہ وہ ہندوؤں کی دلداری کو کس قدر عزیز رکھتے تھے)۔۔۔مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کو داخلی خود مختاری اور ڈومینیئن کی حیثیت اسی روز حاصل ہو جائے گی جس روز ہندو اور مسلمان ایک ہو جائیں گے“(42)

اپریل 1926ء میں لارڈ ریڈنگ کی جگہ لارڈ ارون وائسرائے بن کر برطانیہ سے ہندوستان آئے۔ نومبر 1927ء میں سائمن کمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس کمیشن کا سربراہ لارڈ سائمن کو مقرر کیا گیا (کانگرس کا ساتھ دیتے ہوئے اسی سائمن کمیشن کا جب جناح صاحب نے بائیکاٹ کیا تو لارڈ برکن ہیڈ اس قدر غصے میں آئے کہ انھوں نے لارڈ ریڈنگ اور سرجان سائمن کو ہدایت کہ وہ بھی ایسے حربے آزمائیں کہ جناح کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے اور وہ اپنے میدان میں بالکل تنہا رہ جائیں۔)

محمد علی جناح-دی گریٹ اینگما، مصنف: شیش راؤ چوہان، کے دیباچہ میں دھیر وایس مہتا جناح صاحب کا سائمن کمیشن کے بارے میں ردِ عمل یوں بیان کرتے ہیں:

> "Jalianwala Bagh was a physical butchery, the Simon Commission is a butchery of our souls...."

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

> "He was as firm as a rock in boycotting the Simon Commission. Proposals were made that the boycott should be only political and not social. Jinnah did not budge an inch and said: "Boycott is

boycott and it must be total and complete."

اس موقعے پر لارڈ برکن ہیڈ نے دار الامراء میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستانی سیاست دانوں کو چیلنج کیا کہ اگر وہ کوئی برطانوی فارمولا پسند نہیں کرتے تو خود اپنے ملک کے لیے کوئی متفقہ آئین تیار کر لیں۔ ہندوستانی سیاستدانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ دسمبر 1927ء میں کانگرس کا اجلاس مدراس میں ہوا۔ اس کانگرس میں آل پارٹیز کانفرنس طلب کرنے کی تجویز پیش کی گئی تا کہ ہندوستان کا نیا متفقہ آئین کا خاکہ تیار کیا جا سکے۔ یہ کانفرنس مئی 1928ء کو بمبئی میں منعقد ہوئی جس میں ایک مختصر کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا سربراہ پنڈت موتی لال نہرو کو مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کو "نہرو رپورٹ" کا نام دیا گیا۔

اس رپورٹ پر غور وخوض کرنے کے لیے آل پارٹیز نیشنل کنونشن دسمبر 1928ء میں کلکتہ میں طلب کیا گیا۔ نہرو رپورٹ کی تدوین کے وقت جناح صاحب یورپ میں تھے اور اس کی تیاری میں شرکت نہ کر سکے۔

منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 44 تا 46 میں آگے کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں نہرو رپورٹ اگست 1928ء میں شائع ہوئی، اس وقت مسٹر جناح انگلینڈ میں تھے، جب انگلینڈ سے لوٹے تو جہاز کے ڈیک پر ہی چھاگلہ نے انھیں نہرو رپورٹ کی کچھ تفصیلات بتائیں اور باور کرایا کہ کس طرح نہرو رپورٹ میں آل پارٹی کانفرنس (جو نہرو کمیٹی کی جنم داتا تھی) میں متعین اغراض و مقاصد کے بعض اہم عناصر سے انحراف کیا گیا تھا اور اس کی عین روح سے بھی۔

S.K.Bandpadhya نے اپنی گراں قدر کتاب "قائداعظم محمد علی جناح اینڈ دی کریئشن آف پاکستان" میں رقمطراز ہیں۔

تاہم جب نہرو رپورٹ منظر عام پر آئی تو پایا گیا کہ یہ دہلی مسلم تجاویز، مسلمانوں کی تجاویز جو 20 مارچ 1927ء کو مرتب کی گئی تھی) سے بنیادی طور پر مختلف تھی۔ کانگرس نے مسلم پرپوزلز، (مسلمانوں کی تجویزات) کو (پہلے ہی) جب تسلیم کر لیا تھا تب ہی مسلم لیگ نے اسی کے اساس پر آل انڈیا پارٹیز کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا، اس کے لیے ہمیں اس کی تہہ میں جانا چاہیے کہ کون سے اسباب تھے جن کی باعث کانگرس کے موقف میں اتنے کم عرصے میں ایسی تبدیلی آگئی۔ واضح رہے کہ 20 مارچ 1927ء کو دہلی میں مسلم لیگ نے ایک میٹنگ بلائی تھی جس میں سارے مسلمان دانشور شریک ہوئے تھے، اس میٹنگ میں مسلمانوں کے خیالات و مطالبات پیش کیے گئے تھے، جس کے نتیجے میں وہ متفقہ تجاویز مرتب کی گئیں جسے دہلی مسلم پرپوزلز کا نام دیا گیا تھا۔

لیکن اس سے پہلے آیئے دیکھتے ہیں یہ دہلی مسلم پرپوزلز تھے کیا؟ اس کے لیے پھر بندوپادھیائے کی کتاب سے

نقل کرتے ہیں۔(صفحہ 21تا66)

20مارچ1927ء کو جناح نے دہلی میں ایک کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ جہاں مسلمانوں کے مطالبات متعین کیے گئے جسے عرف عام میں دہلی مسلم پرپوزلز کہا جاتا ہے، مئی ماہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ممبئی کی اپنی نشست میں ان تجاویز کو تسلیم کیا۔ جن کے مطابق کانگرس:

1. مسلمان جوائنٹ الیکٹریٹ یا مخلوط طرز انتخاب پر راضی ہو جائیں گے بشر طیکہ سندھ ایک الگ صوبہ بنادیا جائے۔

2. شمال مغربی سرحدی صوبے(N.W.F.P) اور بلوچستان کو وہی درجہ حاصل ہو جو دوسرے صوبوں کا تھا۔

3. پنجاب اور بنگال اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب وہی ہو جو ان کی آبادی کا ہے۔

4. اور یہ نمائندگی مرکز لیجسلیچر میں ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

جیسا کے بندوپادھیائے نے بتایا ہے، نہرورپورٹ کی تجاویز مسلم مطالبوں سے کافی حد تک میل نہیں کھاتی تھیں، لہذا کلکتہ میں منعقد نیشنل کنونشن میں 22دسمبر1928ء کو جناح نے اس میں ترمیمات پیش کیں، ان ترمیمات کو اختصار سے بندوپادھیائے نے بیان کیا ہے۔ جناح کے مطالبات تھے:

1. مرکزی لیجسلیچر میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

2. بالغ رائے دہندگی (اس زمانے میں ایسا نہیں تھا کہ ووٹ کا حق عمومی طور پر ہر بالغ کو ہو جیسا کہ آج ہے بلکہ اس کا اساس مالگزاری، ٹیکس وغیرہ تھا) کی فراہمی نہ ہونے کی حالت میں (جیسا کہ نہرورپورٹ میں تجویز کیا گیا تھا) بنگال اور پنجاب میں سیٹوں کا تعین آبادی کے تناسب سے ہونا چاہیے، اور اسے 10 سال کے عرصے کے بعد پھر سے تبدیل کرنے کی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔

3. باقی ماندہ اختیارات صوبوں کے تحت رہنے چاہئیں نہ کہ مرکز کے تحت۔

جناح کے یہ مطالبات کانگرس نے مسترد کردیے۔(43)

نہرورپورٹ کمیٹی نے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے سے انکار کردیا۔ مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی 33 کے بجائے آبادی کی بنیاد پر 25 کی تجویز دی گئی مزید یہ کہ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ وحدانی ہو گا، مرکز مضبوط اور صوبوں کے اختیارات محدود ہونگے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس سے پیشتر ازسرنو اس کی قیادت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جناح صاحب کے مطالبات

من و عن تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

جناح صاحب نے کلکتہ کانفرنس میں جو تقریر کی وہ پڑھنے کے قابل ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے موجمار لکھتے ہیں کہ ایسی تقریر ہندو مسلم اتحاد کا کوئی سفیر ہی کر سکتا ہے۔ مسلم لیگ کے سیکرٹری سید شمس الحسن نے اپنی کتاب "پلین مسٹر جناح" جس کا ترجمہ منیر احمد منیر نے "صرف مسٹر جناح" کے نام سے کیا، میں وہ تقریر درج کی جس کا حوالہ بہت سارے لکھاریوں نے دیا۔ جناح صاحب سے پہلے جیکر نے ایک بڑی تند و تیز تقریر کی، سر تیج بہادر سپرو نے تسلیم کیا کہ اقلیتیں اکثریت کو کچھ نہیں دے سکتیں۔ سپرو نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"میں چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر جناح کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں انھیں 15 سال سے جانتا ہوں۔ اگر آپ انھیں ایک بگڑا ہوا بچہ سمجھتے ہیں تو جو کچھ وہ مانگتے ہیں دے دیجئے اور یہ قصہ ختم کیجیے۔ میں مسٹر جناح سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اپنے مطالبات میں ذرا سی نرمی اور رعایت سے کام لیں لیکن ہم پہ بھی لازم ہے کہ ہم حقیقت پسند سیاستدانوں کی طرح اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور اعداد و شمار سے گمراہ نہ ہوں۔"

سپرو کے بعد جیکر تقریر کے لیے اُٹھے اور کہا:

"جناح ایک ضدی بچے کی مانند ہے جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔ جناح مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر اس کی ترامیم منظور کر لی گئیں تو ہم مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ مسلمانوں کی اکثریت کانگرس اور جمعیت العلماء کے ساتھ ہے اور یہ جماعتیں نہرو رپورٹ کو من و عن تسلیم کر چکی ہیں۔ مزید بر آں میں نے بمبئی میں اپنی جماعت ہندو مہا سبھا کے بہت سے لیڈروں کو نہرو رپورٹ کے خلاف بغاوت کرنے سے باز رکھا ہے لیکن جناح کی ترامیم کی منظوری کی صورت میں انھیں بغاوت سے نہیں روک سکوں گا۔" (44)

جناح صاحب نے مشتعل ہوئے بغیر ایک ماہر وکیل کی طرح اپنا مقدمہ پیش کیا۔ انھوں نے کنونشن کے ارکان کی توجہ کینیڈا اور مصر کی آئینی اصلاحات کی جانب مبذول کرائی۔ بڑی دردمندی سے سر تیج بہادر سپرو کے کہے گئے الفاظ دہرائے کہ اقلیت اکثریت کو کچھ نہیں دے سکتی۔ ساتھ یہ بھی کہا کہ ہم قانون کی عدالت میں نہیں کھڑے، ہمیں ایک سیاسی مسئلہ در پیش ہے اس کے لیے گہرے غور و فکر اور تدبّر کی ضرورت ہے۔۔۔ پوری تقریر کچھ اس طرح ہے:

"آپ کی نامزد کمیٹی کی رپورٹ پہلے ہی آپ کے سامنے پڑھی اور پیش کی جا چکی ہے، مجھے از حد افسوس ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ بہر صورت نہ تو مطلق کار آمد ہے نہ مفید۔ حضرات، مجھے

یقین ہے کہ سب کو احساس ہو گا کہ حالیہ موقعہ صرف مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے مفاد کے لیے بہت نازک اور اہم ہے۔ میرے خیال میں یہ تسلیم کرلیا جائے گا کہ ہندو مسلم تصفیہ ہماری ترقی کے لیے مطلقاً ناگزیر ہے اور یہ کہ ہمارے اس بے کراں ملک میں تمام فرقوں کو دوستانہ اور متفقہ جذبے سے رہنا چاہیے۔ جہاں کہیں ایسا مسئلہ پیدا ہوا ہو کوئی ملک کسی دوسرے کے تسلط میں رہتے ہوئے نہ تو اپنے لیے آئین حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے اور نہ ہی اقلیتوں کو تحفظ دیے بغیر اندرونی طور پر نمائندہ ادارے مستقل بنیاد پر قائم کر سکا ہے۔ اکثریتیں مائل بہ جبر واستبداد ہوتی ہیں اور اقلیتیں ہمیشہ خوفزدہ رہتی ہیں کہ ان کے مفادات اور حقوق نقصان اور تعصب کا شکار رہیں گے جہاں تک کہ قانونی ضابطوں کے ذریعے انھیں واضح اور قطعی تحفظ نہ دے دیا جائے۔ لیکن جب ہمارا واسطہ فرقہ وارانہ اکثریت سے ہو تو یہ خدشہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ جس موجودہ حالت میں ہم کام کر رہے ہیں اور آزادی کے لیے جدوجہد میں ہیں اس پر آپ غور کریں گے اور اپنا ووٹ مجوزہ ترامیم کے حق میں دیں گے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، جو مناسب اور معقول ہیں اور اس طرح ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لائق ٹھہراتی ہیں۔"

جناح صاحب مزید کہتے ہیں کہ:

"بحث میں مسلم لیگ کی طرف سے کوئی اور مندوب اس لیے حصہ نہیں لے رہا کہ کنونشن جو تقریباً بارہ سو مندوبین پر مشتمل ہے ہم اس میں جھگڑے کھڑے کر کے غلط تاثرات ابھارنے کے لیے شریک نہیں ہوئے۔ ہم اپنی تجاویز پہلے ہی کنونشن میں پیش کر چکے ہیں۔ ہم جس مفروضے کی بنیاد پر ان کی حمایت کر رہے ہیں وہ ہر طرف سے تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اس ملک میں فرقہ واریت موجود ہے۔ ہم یہاں شریکِ تہمت ہونے کے لیے نہیں آئے۔ جارحانہ آبرایادر پردہ چوٹیں اچھے نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ میں اپنے دوست مسٹر جے کار کی تقریر کا اسلوبؔ یا طرز نہیں اپناؤں گا، اور نہ میں اس موقعہ پر ان کے پیش کردہ دلائل اور تکرار سے الجھوں گا جو بظاہر خوش نما ہیں۔ القصہ، ان (جے کار) کی حیثیت الٹی میٹم کی ہے، اور الٹی میٹم کے بارے میں ہندو مہا سبھا نے ہمیں ابتدا ہی میں خبردار کر دیا تھا کہ اگر رپورٹ میں فرقہ وارانہ سمجھوتے کے ضمن میں ایک لفظ بھی تبدیل کیا گیا تو وہ اس کی حمایت ترک کر دیں گے۔ اپنے دوست سر تیج بہادر سپرو کے ریمارکس کے سلسلے میں مجھے

افسوس ہے کہ بعض مقررین نے ان کا غلط مفہوم لیا ہے۔ انھوں نے مجھے "بگڑا ہوا بچّہ" کہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انھوں نے ایسا کیوں کہا ہے جبکہ دوسروں نے اس کی بچگانہ توجیہہ کی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس سے انکار نہیں ہو سکتا اور مجھے امید ہے کہ مسٹر جے کار اور دوسرے میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ہر وہ ملک جو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہو اور جمہوری طرزِ حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہو، تو جہاں کہیں بھی اقلیتیں ہوں گی اس کا اقلیتوں کے مسئلہ سے سامنا ہو گا۔ اور کوئی بھی آئین چاہے وہ کتنا ہی مثالی ہو اور خالص علمی اعتبار سے وہ کتنا ہی مکمل ہو تب تک اقلیتوں کی حمایت حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ یہ محسوس نہ کریں کہ مجوزہ آئین اور حکومت میں ان کا وجود محفوظ ہے۔ ایک آئین کی فیصلہ کن کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس قطعی کسوٹی پر ہو گا اگر اقلیتیں فی الواقعہ اس میں محفوظ ہوں۔ نہیں تو کوئی مخصوص آئین برقرار نہیں رہ سکے گا بلکہ بغاوت اور خانہ جنگی پر منتج ہو گا۔

میں آج یہاں اپنی یہ رائے دینے کے لیے نہیں آیا کہ آئین بننا چاہیے یا نہیں۔ بلکہ میں مسٹر جے کار سے پوچھتا ہوں کہ وہ جس معاہدے کو ایک عظیم ترین اقدام قرار دیتے تھے کیا وہ اسے اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ آج ہم بہت سنجیدہ اور باضابطہ سمجھوتے میں مصروف ہیں۔ مختلف تنظیموں کا محض یہ کام نہیں کہ وہ آئیں اور کہیں "ہم اس سے متفق ہیں" اور اٹھ کر چلی جائیں۔ میرے نزدیک ہم یہاں باضابطہ معاہدے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور تمام پارٹیاں جو اس معاہدے میں شامل ہوں انھیں اس کے لیے مل جل کر کام اور جدوجہد کرنا ہو گی۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ مقصد کے حصول کے لیے ہندو اور مسلمان مل کر چلیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آپ صرف مسلم لیگ ہی کو نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو تیار کریں۔

یہاں میں مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ میری یہ آرزو ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں سات کروڑ مسلمان ہمارے ہم قدم ہوں۔ کیا آپ چند ایک پر ہی اکتفا کریں گے؟ کیا آپ اس پر مطمئن ہوں گے اگر میں کہوں "میں آپ کے ساتھ ہوں"؟ کیا آپ چاہتے ہیں یا نہیں کہ مسلم انڈیا آپ کے ساتھ چلے؟ سکھوں، عیسائیوں اور پارسیوں جیسے فرقوں کے بارے میں ذرا سی بے ادبی کیے بغیر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ ہندوستان کے دو بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مد نظر

رکھیں۔ لہٰذا فطرتاً ان دونوں فرقوں کو متفق اور متحد کرنا ہوگا اور یہ احساس ابھارنا ہوگا کہ ان کے مفادات مشترکہ ہیں، اور وہ ایک مشترکہ مقصد کے لیے اکٹھا آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اس موقعہ پر اسی تدبر کا مظاہرہ کریں جو سر تیج بہادر سپرو نے بیان کیا ہے۔ اقلیتیں اکثریت کو کچھ نہیں دے سکتیں۔ اس لیے آپ کا مجھ سے یہ کہنا بے سود ہے کہ میں ان پر زور نہ دوں جنھیں آپ "معمولی نکات" قرار دیتے ہیں۔ میں ایک "شریر بچے" کی طرح ان ترامیم کا مطالبہ نہیں کر رہا۔ اگر یہ معمولی نکات ہیں تو آپ انھیں تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟

یہ اکثریت پر ہے اور صرف اکثریت ہی دے سکتی ہے۔، میں آپ سے مفاہمت کا مطالبہ کر رہا ہوں، کیونکہ میرے خیال میں یہ مسلمانوں کے لیے بہترین اور منصفانہ ہے۔ کینیڈا اور مصر کی آئینی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ اقلیتیں ہمیشہ اکثریتوں سے خوفزدہ رہی ہیں۔ اکثریتیں مطلق العنان اور جابر رہی ہیں۔ خاص طور پر جب اقلیتیں اور اکثریتیں مذہبی ہوں، اس لیے مکمل تحفظ ان کا حق ہے۔ کیا فرانس، کینیڈا، اور برطانیہ کے باشندوں میں مفاہمت آبادی کی بنیاد پر ہوئی تھی یا خالص انصاف کی بنیاد پر؟ کیا مصر میں قبطیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین مفاہمت ایسے غور وفکر کے بعد منضبط ہوئی تھی؟

ہمارا واسطہ سیاست سے ہے۔ ہم قانون کی عدالت میں نہیں۔ اس لیے موشگافیوں اور ذرا ذرا سے جھگڑوں کی تدبیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بڑے مسئلے ہیں جو تدبر کے اعلیٰ ترین ضابطے اور سیاسی دانش سے ہی طے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے ایک بار پھر کہوں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس مسئلے پر انتہائی احتیاط سے غور کریں۔

مہربانی فرما کر یہ خیال نہ کریں کہ جو کچھ میں نے کہا اس میں کسی فریق کو دھمکی دے رہا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مجھے غلط نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر آپ یہ مسئلہ آج طے نہیں کرتے تو ہمیں کل یہ طے کرنا ہوگا۔ اس اثنا میں ہمارے قومی مفادات متاثر ہو چکے ہونگے۔ ہم سب اس دھرتی کے بیٹے ہیں۔ ہمیں اکٹھا رہنا ہے۔ ہمیں مل جل کر کام کرنا ہے، اور ہمارے جو بھی اختلافات ہوں، بہر کیف ہمیں مزید رنجش پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم متفق نہیں ہو سکتے تو چلیں کم سے کم اختلاف پر ہی متفق ہو جائیں۔ لیکن ہمیں دوستوں کی طرح رہنا چاہیے۔ میں ایک بار پھر دہراتا ہوں یقین کریں جب تک ہندو اور مسلمان متحد

نہیں ہو جاتے ہندوستان میں کوئی ترقی نہیں ہوگی۔ لہٰذا کسی منطق، فلسفہ یا تکرار کو اپنے سمجھوتے کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں۔ ہندو مسلم اتحاد سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی"(45)

اس وقت ہندو مہاسبھا کے علاوہ کانگرس سے تعلق رکھنے والے اراکین نے بھی جناح صاحب کی تقریر پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جن کے مطابق جناح صاحب محض محدود تعداد کے فرقہ پرست مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں جنھیں اہمیت دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

ایس والپوٹ نے اپنی تصنیف، "جناح آف پاکستان" میں کنونشن میں جناح کی اس تقریر کو ہندوستانی قوم پرست جناح کا الوداعی نغمہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"He had delivered his swan song to Indian nationalism. The dream stirred by Dadabhai's ringing voice in Westminster's commons, nurtured by Morley and Pherozeshah, enriched by Gokhle and Montague, all these long lost Liberal giants was dead. Nagpur had ended Act One. Calcuta finished Act Two."

"انھوں نے ہندوستانی نیشنلزم کے لیے اپنا الوداعی پیغام سنا دیا تھا، وہ خواب جو ہاؤس آف کامنز کے ویسٹ منسٹر ہال میں دادا بھائی نوروجی کی گرجتی آوازوں، مارلے (منٹو) اور فیروز شاہ مہتہ کی کاوشوں اور جوگو کھلے، مانٹیگو کے فروغ آفرینی کا پروردہ تھا، یہ سارے حریت پسند جیالے! وہ خواب اب مر چکا تھا۔۔۔ ناگپور میں پہلا ڈراپ سین ہوا تھا، دوسرا اب کلکتے میں واقع ہوا۔"(46)

سر تیج بہادر سپرو کے اس استدلال کے باوجود کہ اقلیت کے پاس دینے کو کچھ نہیں اکثریت کو فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیونکہ اقلیت کے معنی ہی ہیں کہ وہ کم حیثیت ہے اس کے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہے جناح کو مثبت ردِ عمل نہیں ملا۔

ہیکٹر بولیتھو نے نقل کیا ہے کہ جناح کے ایک نزدیکی پارسی دوست جوان کو دوسرے دن صبح ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے گئے تھے بتاتے ہیں کہ ان ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر جناح نے ڈبڈبائی آنکھوں سے کہا تھا، جمشید، یہ زندگی کا دوراہا ہے۔(This is the parting of the ways)

منصور احمد کے مطابق "جناح کی زندگی کا یہ ایک نادر لمحہ تھا جب کسی نے جناح کو منظر عام پر آنسو کے ساتھ دیکھا ہو۔"

جناح صاحب کے سیکرٹری کے ایچ خورشید جناح صاحب کی قوم پرست سیاست کی ناکامی پر لکھتے ہیں:

"جناح جیسے سچے قوم پرست کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا کہ کسی کو اسکی سرزمین کا فرزند نہیں بلکہ ہندو یا مسلمان سمجھا جائے۔انھوں نے دونوں گروہوں کو قریب لانے کی خاطر بے مثل خدمات انجام دی تھیں، لیکن یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ان کی قوم پرستانہ سیاست ناکام رہی اور ان کا ابتدائی مفروضہ غلط ثابت ہوا قوم پرستی مسٹر جناح کی اوّلین محبت تھی اور اس کے درد کی ٹیسیں وہ بعد کی زندگی میں بھی محسوس کرتے رہے۔ مسٹر گاندھی صحیح ثابت ہوئے کیونکہ لوگ ہندو اور مسلمان پہلے تھے،ہندوستانی بعد میں تھے۔اگر مسٹر جناح کا خمیر صرف تخیل پسندی سے گُندھا ہوتا تو وہ شہرت یافتہ وکیل ہوتے ہوئے بھی میدان سیاست کے کسی گمنام گوشے میں دم توڑ دیتے۔ اگر وہ مسلمان کی حیثیت سے مخاطب نہ ہوتے تو ہندوستان کا مسلمان ان کے کہے پر کبھی کان نہ دھرتا۔رہی ہندوؤں کی بات تو ان کی ہم نوائی حاصل کرنے کے لیے مسٹر جناح کا ہندو ہونا ضروری ہوتا۔انھیں یہ کہنا پڑا کہ جب میں مسلمان ہوں تو اپنی قوم سے بطور مسلمان بات کیوں نہ کروں۔ تخیل پسند جناح ایک قوم پرست تھا، لیکن اس کی قوم پرستی اپنی طفلی ہی میں دم توڑ گئی۔"(47)

14 نکات پر ہندو لیڈر شپ کا ردِ عمل

نہرو رپورٹ کے جواب میں جناح صاحب نے اپنے 14 نکات پیش کیے۔ موجمدار کے مطابق 14 نکات بھی کوئی جارحانہ مطالبات پر مبنی نہیں تھے اگرچہ اس وقت کانگرسی ارکان ان پر بے حد مشتعل ہوئے۔ کانگرسی ارکان کے مطابق یہ کچھ ایسے لوگوں کے اذہان کی اختراع ہیں جن کی مقبولیت کم اور وہ مشہور زیادہ ہیں۔اس لیے انھیں حقارت سے مسترد کر دینا چاہیئے۔

خالد بن سعید کا حوالہ دیتے ہوئے موجمدار لکھتے ہیں کہ:

"کانگرس کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا جس سے فائدہ اٹھا کر جناح سے بات چیت کے علاوہ مسلم لیگ سے دیرپا معاہدہ کر سکتی تھی۔۔ اگر کانگرس اس وقت دانشمندی کا ثبوت دیتی تو مسلم لیگ کا وہ قدامت پسند دھڑا خود بخود تنہا رہ جاتا جس کی قیادت سر محمد شفیع اور حمایت انگریز کر رہے تھے۔ لیکن نہرو رپورٹ کا نتیجہ اس کے عین برعکس نکلا۔"

نہرو نے جناح کے 14 نکات اور مطالبات کو مضحکہ خیز اور فرقہ پرستی کا ملغوبہ قرار دیا۔۔۔ گاندھی جی کے نام اپنے ایک خط مورخہ 27 ستمبر 1931ء میں جناح صاحب کا ذکر نفرت سے کرتے ہوئے لکھا تھا:

"اگر مجھے اپنے عزیز دوست محمد علی جناح کی 14 نکات والی بکواس کو تھوڑی دیر کے لیے
بھی سننے کو کہا جاتا تو میں ساؤتھ سی آئی لینڈز کی تنہائی میں چلے جانے کو سوچتا جہاں اس کی
تھوڑی بھی توقع ہو کہ کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جن کو کم از کم اتنا تو فہم ہو گا، یا اتنے نافہم
نہیں ہونگے کہ 14 نکات پر بات کرنے سے باز رہیں۔"(48)

گول کانفرنسز اور جناح صاحب کی مصروفیات

انگلینڈ میں لیبر گورنمنٹ بر سر اقتدار آگئی تو لارڈ اِروِن نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں ایک ایسی حکومت بنائی جائے گی جس کی حیثیت ڈومینئین سٹیٹس کی ہو گی۔ اس لیے ہندوستانی رہنماؤں سے گفت وشنید کے لیے لندن میں ایک گول میز کانفرنس بلائی گئی۔

پہلی گول میز کانفرنس لندن میں نومبر، دسمبر 1930ء میں ہوئی اس کانفرنس میں کانگرس نے شرکت سے انکار کر دیا تھا ہندوؤں میں جن لوگوں نے کانفرنس میں شرکت کی ان میں سر تیج بہادر سپرو، ایم آر جیکر، شاستری اور مونجے اہم نام ہیں مسلمانوں کی طرف سے سر آغا خان، جناح صاحب اور مولانا محمد علی جوہر۔ چونکہ کانگرس اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوئی اس لیے یہ کسی خاص نتیجے کی حامل نہیں۔

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران کانجی کے مطابق:

"۔۔۔ جناح نے دونوں جانب کے رجعت پسندوں کے خلاف اپنا رویّہ کھلم کھلا ایک پکے نیشنلسٹ کا رکھا کانفرنس کے دوران جناح نے برطانوی کنزرویٹو پر یہ کہہ کر بڑا سخت حملہ کیا کہ ہندوستان میں ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ان کے تجارتی مفاد محفوظ رہیں۔ اس بیان سے کنزرویٹو پارٹی کے ارکان بہت برہم ہوئے۔ انھوں نے آغا خان کے ذریعے جناح پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے مقام سے ذرا بھی نہیں ہٹے اور ہندوستانیوں کے مقاصد اور ان کی مفادات کے لیے ڈٹے رہے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے جناح کو بلا کر سمجھایا کہ حالات جس طرح پلٹنے والے ہیں ان کے پیشِ نظر برطانوی وزیر اعظم کو ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہو گی جو صوبوں کے گورنر بن سکیں۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر جناح نے "نیک بختی" کا ثبوت دیا تو انھیں بھی گورنری کے عہدے سے سرفراز کیا جا سکتا تھا۔ جناح نے ریمزے میکڈونلڈ سے پوچھا "کیا برطانوی تجارتی مفاد کو محفوظ کرانے کی خاطر انھیں رشوت دی جا رہی ہے؟"(49)

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر 1931ء میں لندن میں ہوئی۔ چونکہ پہلی کانفرنس میں کانگرس نے شرکت

نہیں کی اس لیے دوسری گول میز کانفرنس میں گاندھی اِروِن معاہدے کے نتیجے میں کانگرس کے رہنماؤں کی شرکت یقینی بنائی گئی اس کانفرنس میں گاندھی نے شرکت کی۔ اسی کانفرنس کے بارے میں منصور احمد (انڈین مسلم) لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ گاندھی جی کانفرنس میں شریک تھے، مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے ہندو مسلم تعلقات اور حکومت میں نمائندگی کے ضمن میں اس کی نوعیت کیا ہو اسے ہی طے کرنا چاہیے، ہندوستان میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کمیٹی میں مسلمانوں کے لیے ایک سیٹ پر تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا، گاندھی جی کا اصرار تھا کہ مالویہ جی (پنڈت مدن موہن مالویہ) راضی ہو جائیں تو وہ بھی راضی ہیں، لیکن مالویہ جی کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ واضح رہے کہ مدن موہن مالویہ ہندو مہاسبھا کے بڑے لیڈر تھے۔ انھوں نے ہی ہندوؤں کے لیے سنگھٹن تنظیم کی بنیاد ڈالی لہذا مالویہ جی کا رویہ مسلمانوں کے سلسلے میں مددگار ہو یہ بات مشکل ہی سے تصور کی جا سکتی تھی، اس طرح اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب گاندھی جی کا انحصار ایک ہندو مہاسبھا لیڈر پر اس قدر ہو تو گفت و شنید میں موافقت و مصالحت کہاں ہو سکتی تھی؟ انجام کار گفت وشنید ناکامی سے ہمکنار ہوئی۔"

منصور احمد، رضا خاں کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ What Price Freedom میں فرینک موریس (عرصہ دراز تک اخبار انڈین ایکسپریس کا ایڈیٹر) کے ایک مضمون سے یہ اقتباس لیا ہے:

"میں مسٹر جناح سے پہلی دفعہ اس وقت ملا جب میں انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا اور وہ 1930ء میں گول میز کانفرنس کے لیے لندن آئے ہوئے تھے دوسرے سال انھوں نے وہیں سکونت اختیار کر کے اپنے ابتدائی پیشہ بیرسٹر میں لگ جانے کے لیے ہامس ٹیڈ میں ایک مکان لے لیا تھا، اور پری وی کونسل میں کرنے کے لیے کنگس واک میں اپنا چیمبر لے رکھا تھا جہاں میں اکثر ان کے یہاں جاتا تھا وہ ان دنوں بھی ایک نیشنلسٹ تھے گو دوسری گول میز کانفرنس کے دوران گاندھی جی اور کانگرس کے رویے سے بہت نالاں تھے جب ہندو مسلم تنازعات کو حل کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی لیجسلیچر میں صرف ایک سیٹ جو مسلمان مانگتے تھے اس کو لے کر ناکام ہوئی۔

گاندھی جی نے ایک ایسے تصفیہ پر مہر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کر دیا جس پر پنڈت مدن موہن مالویہ راضی نہ ہوں اور مالویہ جی ظاہر ہے راضی نہ ہو سکے۔ اس ایک سیٹ پر پیدا ہوئی کشمکش سے ردِ عمل کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس کی انتہا پاکستان کے قیام پر ہوئی، تاہم اگلے 15 سالوں میں، جو اس وقت سے حصولِ آزادی تک کے عرصے میں دستیاب تھے، حالات کو سنبھالا جا سکتا تھا۔"(50)

سری گول میز کانفرنس ناکام ہوئی۔ ہیکٹر بولتھو کے مطابق کانفرنس کا اختتام ریمزے میکڈونلڈ کی اس فہمائش پر ہوا۔

"اگر آپ لوگ آپس میں کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کر سکے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو اور جس پر آئندہ آئینی اصلاحات کی بنیاد رکھی جا سکے، تو بہت جلد ہماری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی اور ہمارے لیے آگے قدم بڑھانا ناممکن ہو جائے گا۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ ہمارے قدم رک چکے ہیں۔ اگر آپ لوگ آپس میں کوئی سمجھوتہ نہ کر سکے تو حکومتِ برطانیہ کوئی عارضی سکیم نافذ کرنے پر مجبور ہو جائے گی، کیونکہ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ وقت پر طے نہ ہو سکا تب بھی آئینی اصلاحات ملتوی نہ کی جائیں گی۔"

جسونت سنگھ کے مطابق جناح صاحب اس وقت کچھ اس قسم کی صورت حال سے دوچار تھے۔

پہلی گول میز کانفرنس نے جناح کی گومگو حالت کو بالکل اجاگر کر دیا۔ تمام مبصروں میں مانچسٹر گارڈین نے ہی سب سے واضح اور سلجھے الفاظ میں اس کشمکش کو بیان کیا۔

”گول میز کانفرنس میں جناح کی حالت عجیب و غریب تھی۔ ہندو سوچتے تھے کہ وہ ایک فرقہ پرست مسلمان ہیں اور مسلمان انھیں ہندو نواز گردانتے تھے۔ راجاؤں نے انھیں حد سے زیادہ جمہوری تصور کیا اور انگریز انھیں ایک پرجوش انتہا پسند مانتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہیں تھے۔ کوئی انھیں پسند نہیں کر رہا تھا۔“

جناح صاحب نے اس کانفرنس کے دوران اپنے اس کردار کے بارے میں خود کئی سال بعد 2 مارچ 1936ء کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں اپنی تقریر کے دوران اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

”میں نے مسلمانوں کو ناخوش کیا، اور مشہور 14 نکات کو رکھ کر ہندو دوستوں کو بھی ناراض کیا، میں نے راجاؤں کو ناخوش کیا کیونکہ میں ان کی خفیہ سرگرمیوں کے بالکل خلاف تھا۔

ساتھ ہی میں نے برطانوی پارلیمنٹ کو ناراض کیا کیونکہ مجھے شروع میں ہی محسوس ہو گیا تھا کہ یہ سب دھوکہ ہے اور میں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ کچھ ہی ہفتوں میں وہاں میرا کوئی دوست نہیں رہ گیا تھا۔"(51)

ہیکٹر بولتھو کے مطابق دوسری گول میز کانفرنس کے اختتام سے پہلے ہی محمد علی جناح کی سیاسی حیثیت ماند پڑ چکی تھی اور وہ اپنے خیالات اور طرزِ عمل کو بدلنے کے بجائے سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ برسوں بعد 1938ء میں علی گڑھ طلبا کے سامنے جناح صاحب نے اس کی وجہ بھی بتادی کہ وہ کیوں سیاست سے دستبردار ہو گئے تھے۔

"گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں ہندوؤں کے روّیے سے مجھے سخت صدمہ پہنچا اور میری آنکھیں کھل گئیں۔ ان اجلاسوں میں ہندوؤں کے جذبات و خیالات کو میں نے اصلی روپ میں دیکھا، ان کے ذہن کے تمام گوشے میرے سامنے بے نقاب ہو گئے اور ان کا روّیہ پوری طرح مجھ پر منکشف ہوا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب ہندو مسلم اتحاد کی کوئی امید نہیں، میں اپنے ملک کی طرف سے بالکل مایوس ہو گیا۔ مسلمانوں کی حالت تو اتنی گرچکی تھی جیسے وہ کسی لاوارث خطہ زمین کے باشندے ہوں۔ ان کے رہنما انگریزوں کے خوشامدی اور کاسہ لیس تھے یا پھر کانگرس کے حاشیہ بردار۔ جب بھی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی، یہ دونوں عناصر ان کے آڑے آئے اور تنظیم کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں نہ ہندوستان کے لیے کچھ کر سکتا ہوں، نہ ہندوؤں کی ذہنیت بدل سکتا ہوں، نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا احساس دلا سکتا ہوں۔ میں اتنا مایوس اور دل شکستہ ہوا کہ لندن میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہندوستان کی محبت میرے دل میں ضرور تھی، لیکن میں بالکل مجبور تھا۔"(52)

بولتھو کے مطابق ستمبر 1931ء میں جناح ویسٹ ہیتھ ہاؤس میں منتقل ہو گئے اور وہاں انھوں نے وہ طرزِ زندگی اختیار کیا جو ان کے مزاج اور عادات کے عینِ مطابق تھا۔ وہ اب ہندوستانی سیاست کی تلخیوں اور آویزشوں سے بہت دور نکل آئے تھے اور لندن میں بڑی پُر سکون اور باضابطہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ پابندی سے مقررہ وقت پر ناشتہ کرتے اور پھر ٹھیک نو بجے بریڈبری انھیں موٹر میں ان کے دفتر لے جاتا جو کنگز بینچ واک میں واقع تھا۔ وہاں انھوں نے نئے سرے سے اپنی وکالت جمائی۔ کئی برسوں بعد پریوی کونسل میں جناح کی

وکالت کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ جوٹ (Lord Jowitt) نے لکھا:

"جناح قانونی معاملات میں نہایت ہوشیار تھے اور پریوی کونسل میں اپنے مقدمات کی پیروی میں وہ بڑی فہم و بصیرت کا ثبوت دیتے تھے۔ان کی ان صلاحیتوں کے باعث ہم ان کا بہت احترام کرتے تھے۔"

جناح صاحب کی وطن واپسی

بولتھو کے مطابق وہ اپریل 1934ء میں انگلستان سے وطن لوٹے تھے۔اسی مہینے مسلم لیگ کونسل کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہو سکتی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سچی دوستی ہو اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ دل سے تعاون کریں۔"

پھر وہ لندن چلے گئے اور چند مہینے وہاں قیام کیا۔ان کی ذہنی کشمکش ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ایک طرف وہ ہندو مسلم اتحاد کی دیرینہ آرزو ترک کرنے پر تیار نہ تھے،دوسری طرف عقل یہ کہتی تھی کہ وہ آرزو محض ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔

1936ء میں دلی میں لیگ کے چند ممبروں سے گفتگو کے دوران جناح صاحب نے کہا:

"ہمیں چاہیے کہ ہم مسلمانوں کے مفادِ کلی کو پیشِ نظر رکھیں۔ اگر آپ ان کی بھلائی اور ترقی کے لیے دل و جان سے کوشش نہ کریں گے تو ہرگز کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ کوئی شخص آپ کا احترام نہیں کرے گا، نہ کوئی آپ سے مشورہ لینے کی زحمت کرے گا۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ آپ عوام کو منظم کریں اور انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ اپنی حیثیت و اہمیت کے مطابق ملک کی سیاست میں حصہ لے سکیں۔

"میری رائے ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم کرنا چاہیے۔ اس طرح دونوں فرقے بہتر طور پر ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے اور باہمی مفاہمت کے لیے ہمیں برسوں انتظار نہ کرنا پڑے گا۔۔۔۔ میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اگر وہ اچھی طرح منظم ہو گئے تو قومی آزادی کی تحریک میں وہ بڑا کام کر سکیں گے۔"

اگلے حصے میں ہم اس جانب بڑھتے ہیں جب متحدہ ہندوستان کے حامی قوم پرست جناح 1937ء کے الیکشن کے بعد کانگرس کا رویہ دیکھ کر ہندو مسلم اتحاد سے مکمل مایوس ہو کر فیصلہ کن جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر54،55
2- جناح، اتحاد سے تقسیم تک جسونت سنگھ صفحہ نمبر67
3- ایضاً65
4- ایضاً62
5- کے ایم منشی" پلگر یمیج ٹو فریڈم
6- گاندھی ایز آئی نو ہم از اندولال یاجنک ترجمہ محمد ظفر احمد انصاری صفحہ نمبر 40-41
7- "دی سٹوری آف مائی لائف" از ایم آر جے کار صفحہ نمبر161
8- محمد علی جناح کانجی دوآر کاداس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر26
9- ایضاً۔ صفحہ نمبر46-47
10- "دی سٹوری آف مائی لائف" از ایم آر جے کار صفحہ نمبر318
11- محمد علی جناح کانجی دوآر کاداس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر38
12- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر71،74
13- کے ایم منشی" پلگر یمیج ٹو فریڈم
14- حیات قائد اعظم، ہیکٹر بولتھو مترجم زہیر صدیقی صفحہ نمبر166
15- فریڈم ایٹ مڈنائٹ لیری کولنز، دامنک لیپیئر ترجمہ: سعید سہروردی صفحہ نمبر27
16- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر 89،90
17- ایضاً۔ صفحہ نمبر 20-21
18- منصور احمد (انڈین مسلم) "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے صفحہ نمبر40
19- فریڈم ایٹ مڈنائٹ لیری کولنز، دامنک لیپیئر ترجمہ: سعید سہروردی صفحہ نمبر27،26
20- برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر280-81
21- مہاتما جلد اول کے صفحہ نمبر424
22- تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیروائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر24-25
23- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر 95
24- محمد علی جناح کانجی دوآر کاداس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر36-37

25- بندوپادھیائے از منصور احمد (انڈین مسلم) "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے، صفحہ 33اور34

26- حیات قائداعظم از بولتھو صفحہ نمبر112-13

27- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر121

28- ایضاً۔ صفحہ نمبر114

29- مہاتما جلد دوم از ٹنڈولکر صفحہ نمبر459-460

30- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر99

31- منصور احمد (انڈین مسلم) "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے صفحہ نمبر37

32- ٹنڈولکر جلد دوم صفحہ نمبر179

33- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر101

34- گاندھی ایز آئی نو ہم از اندولال یاجنک صفحہ نمبر 150-172،56،51

35- "مہاتما جلد دوم" صفحہ نمبر60

36- ایضاً۔ صفحہ نمبر83

37- گاندھی ایز آئی نو ہم از اندولال یاجنک مترجم مولانا ظفر احمد انصاری صفحہ نمبر 213

38- حیات قائداعظم از بولتھو صفحہ نمبر116-17

39- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر130

40- گاندھی ایز آئی نو ہم از اندولال یاجنک صفحہ نمبر 247-48

41- جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر130-131

42- ایضاً۔ صفحہ نمبر153-154

43- منصور احمد (انڈین مسلم) "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے صفحہ نمبر44-46

44- مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء از زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر161

45- صرف مسٹر جناح تالیف سید شمس الحسن، ترجمہ منیر احمد منیر صفحہ نمبر53-54،57تا60

46- جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ صفحہ نمبر102

47- قائداعظم کی یاد میں کے ایچ خورشید صفحہ نمبر75-76

48- ایس کے بندوپادھیائے از منصور احمد صفحہ نمبر211

49- محمد علی جناح کانجی دوآرکاداس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر86

50- منصور احمد (انڈین مسلم) "کیا مسلمان ہی علیحدگی کے ذمہ دار تھے صفحہ نمبر52

51- جناح، اتحاد سے تقسیم تک جسونت سنگھ صفحہ نمبر130

52- حیات قائداعظم از بولتھو صفحہ نمبر135-36

باب ---2

مسلمانوں کے قائدِ اعظم

فیصلہ کن جنگ کا آغاز

1937ء کے الیکشن تک، ہندو لیڈر شپ سے مایوسی کے باوجود، جناح صاحب ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے تھے۔ وہ ابھی تک مکمل مایوس نہیں ہوئے تھے۔ 1936ء کی تقریر آپ پڑھ چکے جس میں کہتے ہیں کہ:

"دونوں فرقوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہیئے۔ اس طرح دونوں فرقے بہتر طور پر ایک دوسرے کو سمجھ سکیں گے اور باہمی مفاہمت کے لیے ہمیں برسوں انتظار نہ کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد بھی انتخابی جلسوں میں جناح صاحب یہی بات کرتے نظر آئے۔ مثلاً موجمدار، خالد بن سعید کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی کتاب میں جناح صاحب کی یہ تقریر بیان کرتے ہیں۔

"ہماری تحریک نفرت اور بغض پر مبنی نہیں ہے۔ ہماری تحریک ہر مذہب کو زیتون کی شاخ پیش کرتی ہے۔ ہم تعاون کے لیے رضامند ہیں ہم کسی ایسے گروپ یا گروپوں کے ساتھ متحد ہونے پر بھی تیار ہیں جن کے نظریات و مقاصد کم و بیش ہم جیسے ہوں۔ مسلم لیگ ہندوستانی عوام کے لیے مکمل قومی خود مختار حکومت کا مطالبہ کرتی ہے، ہندوؤں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے درمیان اتحاد اور آبرومندانہ معاہدہ وہ محور ہے جس پر 38 کروڑ افراد کی اپنی حکومت (سیلف گورنمنٹ) تشکیل پا کر قائم رہ سکتی ہے"

(پاکستان از خالد بن سعید صفحہ 38)

اس کے علاوہ جناح صاحب نے یہ بھی کہا:

"کانگرس اور مسلم لیگ کے نظریات میں کوئی فرق نہیں ہے (خصوصاً ہندوستان کی مکمل آزادی کا نظریہ دونوں میں مشترک ہے) کوئی بھی خوددار ہندوستانی ایسا نہیں ہو سکتا جو غیر ملکی حکمرانی کی حمایت کرے یا اپنے ملک کے لیے خود مختار حکومت نہ چاہے۔" (1)

1937ء کے الیکشن میں کانگرس کو اس بات کی توقع تو تھی کہ وہ سب سے زیادہ سیٹیں جیتنے والی پارٹی ہوگی لیکن اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ قطعی اکثریت حاصل کریں گے۔ اس لیے انتخابات سے قبل کانگرس نے مسلم لیگ سے ایک معاہدہ کر لیا۔ یہ کوئی تحریری معاہدہ نہیں تھا لیکن یوپی کے چوہدری خلیق الزماں اور نہرو کے درمیان یہ بات طے پا چکی تھی کہ الیکشن کے بعد وہ مل کر حکومت بنائیں گے۔

الیکشن کے نتائج آتے ہیں جس میں کانگرس کو زبردست کامیابی ملی۔ 5 صوبوں میں کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہو گئی 4 یعنی بمبئی، بنگال، آسام اور صوبہ سرحد میں کانگرس ہی سب سے بڑی واحد پارٹی ثابت ہوئی، بمبئی میں کانگرس کے ممبروں کی تعداد بقیہ دوسرے ممبروں کے مقابلے میں ایک کم تھی۔ پنجاب اور سندھ میں کانگرس اقلیت میں رہی۔

اس عظیم کامیابی نے موجمدار کے مطابق کانگرس پر نشے کا سا اثر کیا اور اس کا غرور و تکبر نکتہ عروج پر پہنچ گیا۔

آیئے اس پر ایک نظر دوڑاتے ہیں کہ کانگرس نے کیسے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے لیگ اور جناح صاحب کا دستِ تعاون جھٹک دیا۔ جناح کی نیک نیتی کے ثبوت کانجی نے اپنی کتاب میں دیے ایک ایسے وقت میں جب کانگرس لیگ کے ارکان توڑنے کے لیے کوشاں تھی جناح صاحب کس اخلاص سے کانگرس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کیونکہ الیکشن کے بعد بھی جناح صاحب نے کہا تھا کہ:

"اگر ہندوؤں مسلمانوں میں مناسب سمجھوتہ ہو جائے تو مجھ سے زیادہ کون خوش ہو گا اور مجھ سے زیادہ کون اس ضمن میں مددگار ثابت ہو گا"۔

کانجی لکھتے ہیں کہ:

"بمبئی اسمبلی کی کانگرس پارٹی کے لیڈر بی جی کھیر چنے گئے۔ لارڈ بریبورن نے جو گورنر تھے کھیر کو وزارت بنانے کی دعوت دی لیکن چونکہ گورنر کانگرس کی شرط ماننے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انھوں نے انکار کر دیا اس پر لارڈ بریبورن نے دوسری پارٹی یعنی مسلم لیگ کے لیڈر سر علی محمد خان دہلوی کو وزارت بنانے کا کہا مگر جیسا کہ خود جناح نے مجھے بتایا اس کی ہدایت کے ماتحت علی محمد دہلوی نے یہ کہہ کر معذرت پیش کر دی کہ جمہوری نظامِ حکومت

میں اقلیت وزارت قائم کرنے کی مجاز نہیں ہے لیکن جیسے ہی علی محمد دہلوی اپنے گھر پہنچے
بریبورن نے انھیں دوبارہ فون کیا کہ وہ سیاسی پارٹی کے رکن کی حیثیت سے نہ سہی اپنی
انفرادی حیثیت میں حکومت میں شریک ہو جائیں۔ جناح کو اس کا علم ہوا تو لارڈ بریبورن کی
اس غیر آئینی حرکت پر بہت برہم ہوئے اور انھیں سخت احتجاجی خط لکھا جس میں سیاسی
جماعتوں مین انتشار پیدا کرنے کی کوشش پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی"(2)

یہ تو تھا جناح صاحب کا روّیہ، اب ذرا "جمہوری" کانگرس اور کانگرسی ہائی کمان کے روّیے بھی دیکھ لیں کہ وہ جناح کی اس نیک نیتی کا جواب کس انداز میں دے رہے تھے اس کی گواہی بھی کانجی ہی نے دی وہ لکھتے ہیں کہ:

"بمبئ میں کھیر وزیر اعلیٰ چنے گئے انھوں نے جناح سے اپنی وزارت میں شامل کرنے کے لیے دو مسلم لیگ ممبروں کے نام مانگے جناح اس کے لیے بخوشی رضامند ہو گئے اور گانگرسی وزارت کو مسلم لیگ کے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

لیکن اس کے بعد کیا ہوا اس کی داستان خود بی جی کھیر نے مجھے سنائی اور جس کی تصدیق بعد میں جناح نے کی۔ قصہ یہ ہوا کہ گانگرس ہائی کمان اس کے لیے کسی طرح رضامند نہ تھا کہ جناح سے کسی قسم کا تعلق پیدا کیا جائے جناچہ کھیر کی یہ خواہش رد کر دی گئی اور اس کی بدلی ہوئی شکل یوں پیش کی گئی کہ مسلم لیگ کے جن دو ممبروں کو لیا جائے گا وہ پہلے لیگ سے مستعفی ہوں اور گانگرس میں شریک ہو جائیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ شرط لیگ کے لیے انتہائی ہتک آمیز تھی جناح بجا طور پر اس سے خفا ہوئے چنانچہ انھوں نے گانگرس کی تجویز ٹھکرا دی۔ وہ گانگرسی وزارت سے تعاون ضرور کرنا چاہتے تھے لیکن اپنی پارٹی کا گلا نہیں گھوٹنا چاہتے تھے۔"(3)

یہ تھا" جمہوری"کانگرس کا اصلی چہرہ۔ اسی وجہ سے جناح صاحب سمیت دوسرے لوگ بھی کانگرس کو ایک فاشسٹ جماعت قرار دیتے تھے جو کسی دوسری پارٹی کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بمبئ کے علاوہ یوپی میں بھی یہی کچھ ہوا جہاں نہرو اور چوہدری خلیق الزماں کی انڈرسٹینڈنگ تھی کہ وہ مل کر حکومت بنائیں گے۔ آیئے اس پوری کہانی پر نظر دوڑاتے ہیں۔

مولانا آزاد اپنی کتاب "آزادی ہند" میں لکھتے ہیں کہ:

"جواہر لال میرے عزیز ترین دوستوں میں ہیں اور ہندوستان کی قومی زندگی کو ان کی عطا کسی سے کم نہیں ہے۔۔ تاہم افسوس کے ساتھ مجھے یہ کہنا ہو گا کہ یہ پہلا موقع نہیں تھا جب

انھوں نے قومی مقصد کو زبردست صدمہ پہنچایا۔ انھوں نے 1937ء میں بھی تقریباً ایسی ہی بھول کی تھی۔

اس وقت یوپی میں چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب حکومت کی تشکیل کے لیے میں لکھنؤ آیا، میں نے ان دونوں سے بات کی۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کانگرس سے صرف تعاون ہی نہ کریں گے بلکہ مکمل طور پر کانگرس پروگرام کی حمایت بھی کریں گے۔ انھیں فطری طور پر یہ توقع تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کا کچھ حصہ ہو گا۔ مقامی صورت حال ایسی تھی کہ دونوں میں سے کوئی بھی حکومت میں تنہا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ یا تو دونوں کو لیا جاتا یا پھر کسی کو بھی نہیں۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ دونوں حکومت میں شامل کر لیے جائیں گے۔

چند روز بعد، میں الٰہ آباد واپس آیا اور یہ معلوم کر کے مجھے شدید افسوس ہوا کہ جواہر لال نے خلیق الزماں کو اور نواب اسمٰعیل خان کو لکھ دیا تھا کہ دونوں میں سے بس ایک کو وزارت میں لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دونوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ جواہر لال کی پیشکش کو قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں۔

یہ ایک انتہائی افسوسناک واقعہ تھا۔ اگر لیگ کی تعاون کی پیشکش قبول کر لی گئی ہوتی تو عملی مقاصد کے اعتبار سے مسلم لیگ پارٹی کانگرس میں ضم ہو گئی ہوتی۔ جواہر لال کے اس عمل نے یوپی میں مسلم لیگ کو ایک نئی زندگی عطا کر دی۔ ہندوستانی سیاسات کے تمام طالب علم یہ جانتے ہیں کہ لیگ کی تنظیم نو یوپی ہی سے ہوئی۔ مسٹر جناح نے موقعے کا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک جارحانہ کارروائی شروع کر دی جس نے انجام کار پاکستان بنوایا۔" (4)

"صاحب بصیرت "امام الہند صرف مستقبل کے واقعات کی پیشین گوئی ہی درست فرما سکتے ہیں ورنہ گزرے ماضی کے تمام اہم واقعات کے بارے میں وہ اپنی کتاب میں نسیان کے مریض نظر آتے ہیں۔ اس پورے معاملے میں آزاد خود بھی کم ذمہ دار نہیں تھے جس کا ذکر وہ گول کر گئے ہیں۔

پہلی غلط بیانی تو موصوف نے یہ کی کہ لیگ کی نشستیں اپنی کتاب میں 26 بتائیں جو کہ حقیقت میں 29 تھیں البتہ یہ ضرور ہے کہ تین بندوں کو توڑ کر کانگرس نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

چوہدری خلیق "شاہراہِ پاکستان" میں لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے 36 نمائندوں میں 29 کامیاب ہوئے یعنی تقریباً ہم کو اسی فیصد کامیابی ہوئی۔ کانگرس ٹکٹ پر کوئی مسلمان یوپی سے کامیاب نہ ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی

کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں لکھا ہے کہ مسلم لیگ کو انتخابات میں صرف 26 نشستیں ملیں جو بالکل خلاف واقعہ ہے وہ اپنے تین آدمیوں کو یعنی مولانا اسمٰعیل، حافظ ابراہیم اور سعید الدین کو جماعت کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر گانگرس کے ساتھ مل گئے تھے اپنا کہہ کر ہماری سیٹوں کو کم کر کے دکھاتے ہیں" (5)

یوپی والے واقعے کے بارے میں چوہدری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں تفصیلی نظر دوڑائی کیونکہ یوپی میں چوہدری خلیق الزماں ہی مسلمانوں کو لیڈ کر رہے تھے۔ پوری کہانی ان کی زبانی "شاہراہِ پاکستان" سے پڑھتے ہیں۔

"میں 12 مئی کو الہ آباد گیا۔ جس دن پنڈت جواہر لال نہرو بخار میں مبتلا تھے دن بھر ان سے کوئی گفتگو نہ ہو سکی مگر رات کو میری ان سے بالتفصیل باتیں ہوئیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی کہ میں انھیں مسلم یونٹی بورڈ اور مسلم لیگ کے مفاہمت کے متعلق کچھ بتاتا کیونکہ ان کو میں اس سے پہلے سب کچھ بتلا چکا تھا لہٰذا اس وقت میں نے ان سے صرف یہ کہا کہ گانگرس اور لیگ کی مفاہمت سے ملک کو فائدہ پہنچے گا آپ اس میں بلاشبہ نہ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ خود مسلم لیگ کا ایک علیحدہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے رہنا جمہوری اصولوں کے منافی ہے مگر اب تم اسے قانون ساز اداروں میں بھی دیکھنا چاہتے ہو جس کے نتائج کبھی اچھے نہیں ہو سکتے اسپین کو دیکھو جہاں ایسے ہی نظریات کی بدولت ملک کے دو گروہوں میں باقاعدہ جنگ ٹھنی ہوئی ہے اور مغربی دنیا میں جمہوریت نے ایسی تفریق کہیں قبول نہیں کی ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ مغربی دنیا میں کوئی حکومت ہندوستان جیسی مثال پیش نہیں کر سکتی جہاں کی اقلیت اتنی کثیر تعداد میں ہو اور اس کی پشت پر ایک شاندار ہزار برس کی ماضی کی تاریخ موجود ہو۔ بسا اوقات جسامت کا فرق نوعیت کا فرق ہو جاتا ہے اور ہندوستان کی اقلیت تو ایسی ہے کہ وہ کئی صوبوں میں خود اکثریت ہے ایسی اقلیت کے لیے آپ باہر کی تمثیلوں سے موازنہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ ہندوستان میں صرف ایک پارٹی ہو ہندوستان کے حالات کے لیے سازگار نہ ہو گا اور اگر سو برس میں بھی آپ مسلمانوں کو اس پر راضی کر لیں تو آپ اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کر سکتے ہیں۔ یہ لڑائی بہت طول کھینچے گی اور اس کے نتائج ملک کے لیے اچھے نہ ہونگے۔ میری ان کی گفتگو ختم ہو گئی اور میں رات ہی کی گاڑی سے لکھنؤ واپس آگیا اس کے بعد سے میرا آج تک آنند بھون جانا نہ ہوا۔" (6)

یہ تو ہوا نہرو سے ملاقات کا تذکرہ۔ آگے امام الہند کے رول اور بے بسی کی کہانی پڑھتے ہیں جس میں موصوف ایک معاہدہ لیکر آتے ہیں جس کی سادہ لفظوں میں تشریح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ لیگ اپنے آپ کو خود پھانسی پر چڑھا کر کانگرس کے ساتھ مل جائے۔

"5 جولائی 1937ء کو کانگرس نے عہدے قبول کرنا طے کر لیا اور مولانا ابو الکلام آزاد 12 جولائی کو لکھنؤ پہنچ کر برلنگٹن ہوٹل میں ٹھہرے اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی دوران گفتگو انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر کانگرس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے اور اس کے بعد کسی سیاسی مسئلہ پر کانگرس گورنمنٹ سے لڑائی لڑ کر عہدوں سے مستعفی ہو جائے اور اسمبلی کا بائیکاٹ کر دے تو اس حالت میں مسلم لیگ کا کیا روّیہ ہو گا؟ میں نے کہا سیاسی مفاہمت محض جزئیات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس کی پشت پر کچھ اخلاقی اصول اور فرائض بھی ہوتے ہیں اس لیے اگر کانگرس کسی سیاسی مسئلہ پر گورنمنٹ سے ٹکر لیتی ہے تو مسلم لیگ اس کا ساتھ دے گی اس کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ حافظ ابراہیم کو مسلم وزرا میں شامل کر لیں گے۔ میں نے کہا میرے شریک کار نواب اسمٰعیل خان صاحب ہونگے انھوں نے کہا وہ تو نواب ہیں۔ میں نے کہا مولانا یہ تو آپ کے علم میں ہونا چاہیئے کہ ان کو کوئی برٹش خطاب نہیں ملا ہے بلکہ وہ نواب اس لیے کہلاتے ہیں کہ وہ نواب شیفتہ کے جو غالب کے بڑے دوستوں میں تھے پوتے ہیں۔ مولانا نے مجھ سے کہا کہ آپ نے جس حالت میں استعفیٰ کا ذکر کیا ہے اس کو آپ لکھ کر مجھے دیں گے؟ میں نے کہا کہ مولانا میرا زبانی بیان کافی ہونا چاہیئے تھا۔ مگر آپ تحریر چاہتے ہیں تو لیجئے یہ لیتے جایئے کہ اگر کسی ملکی مفاد کی خاطر کانگرس حکومت سے مستعفی ہو گی تو مسلم لیگ کے وزرا بھی جو کانگرس میں شریک ہونگے، مستعفی ہو جائیں گے۔"

مزید لکھتے ہیں کہ:

"مولانا لکھنؤ سے بہت خوش خوش الٰہ آباد گئے شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ جمعیت العلما کو جو امید انھوں نے لیگ سے مفاہمت کی امید دلائی تھی وہ اب پوری ہوتی ہوئی انھیں نظر آرہی تھی اور چونکہ وہ یوپی اور بہار وغیرہ کے کانگرس کی طرف سے اسمبلیوں اور کانگرس وزرا کی سیاسی پالیسیوں اور اعمال کی نگرانی کے لیے واردھا کی ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں حلقہ ڈکٹیٹر مقرر ہو چکے تھے اور ان کی یہ امید ناجائز بھی نہ تھی مگر انھیں الٰہ آباد پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خود بہت دھوکہ میں تھے۔ بہر صورت تین دن کے بعد وہ لکھنؤ پھر واپس

آئے اور مجھے اس مرتبہ وہ اکیلے نہیں بلکہ پنڈت پنتھ کے ساتھ برلنگٹن ہوٹل میں ملے اور عجیب معذرتی انداز میں انھیں نے مجھے شرائط صلح ایک کاغذ پر لکھی ہوئی پیش کئے۔ وہ ملاحظہ ہوں۔

"صوبہ یوپی کی اسمبلی مفاہمت کے بعد ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت سے مسلم لیگ گروپ قائم نہ رہے گا اس پارٹی کے اسمبلی کے ممبر گانگرس پارٹی میں ضم ہو جائیں گے اور ان کے وہی حقوق اور ذمہ داریاں ہونگی جو گانگرس پارٹی کی ممبروں کی۔ اسی طرح ان کو پارٹی کے مباحث میں حصہ لینے کا حق ہو گا اور ان کے اوپر گانگرس پارٹی کی ممبروں کی طرح گانگرس کا ڈسپلن اور کنٹرول عائد ہو گا اور گانگرس پارٹی کے فیصلے مجلس قانون ساز میں کام چلانے کے لیے قابل پابندی ہونگے۔ تمام معاملات کے فیصلے ووٹ سے ہونگے اور پارٹی کے ہر ممبر کا ایک ووٹ ہو گا۔ گانگرس ورکنگ کمیٹی کے پالیسی سے متعلق فیصلے اور ہدایات جو گانگرس کی ذمہ دار جماعتوں سے اسمبلی کے کام کے متعلق جاری ہوں ان پر سچائی سے ہر ممبر گانگرس پارٹی عمل کرے گا۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ ختم کر دیا جائے اور اس کی طرف سے کوئی نمائندہ الیکشن میں نہ کھڑا ہو اور جس امیدوار کو گانگرس اپنا نمائندہ بنا کر کھڑا کرے اس کی ساری گانگرس پارٹی اور اس کے ممبر تائید کریں۔ گانگرس پارٹی کے تمام ممبر گانگرس قوانین کے پابند ہونگے اور سچائی کے ساتھ اپنا کام گانگرس کے مفاد کی ترقی میں پورے دلی تعاون کے ساتھ کریں گے۔ اگر گانگرس پارٹی وزارت یا اسمبلی سے استعفیٰ دینا طے کرے تو دوسرا گروپ بھی اس کا ساتھ دے"

مذکورہ بالا ٹائپ نوٹ کے ساتھ مولانا کا ایک مختصر نوٹ بھی چسپاں تھا جو حسب ذیل تھا:

"امید کی جاتی ہے کہ اگر یہ تمام شرائط مسلم لیگ گروپ قبول کر کے گانگرس پارٹی کے ساتھ پورے ممبر کی طرح شریک ہو جائے اور کوئی علیحدہ وجود اپنا باقی نہ رکھے تو صوبہ کی وزارت میں اس گروپ کی شرکت پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔"

یہ سب پوتھی پڑھ کر میں نے مولانا سے کہا کہ یہ آپ کیا واہیات باتیں لکھ کر لائے ہیں آج آپ مجھ سے یوپی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے لیڈر کی حیثیت سے باتیں کر رہے ہیں اور یہ کہنے آئے ہیں کہ میں اس بورڈ کو پھانسی پر لٹکا دوں اور مسلم لیگ کو جہنم واصل کر دوں یہ نوٹ آپ اپنی جیب میں رکھیں میں اس کو دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ اس کے بعد میں کھڑا ہو گیا۔

مولانا نے کہا "میرے بھائی آپ خفا ہو گئے بیٹھئے ذرا میری بات بھی تو سنیے۔ میں ان کے کہنے سے بیٹھ

گیا۔ انھوں نے اس کے جزئیات کے متعلق گفتگو شروع کی، میں اس کی تردید کرتا رہا۔ دوسرے دن بابو موہن لال سکسینہ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ آپ شرائطِ صلح پر دستخط کر دیجئے حالاتِ موجودہ میں یہی مناسب ہے کیونکہ مولانا اپنی کوشش کے باوجود اس سے بہتر شرائط کانگرس سے نہ منوا سکے۔ میں نے ان سے کہا اگر میں ایسا کروں تو میں خود اپنی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا اور اگر تم ایک ایماندار آدمی ہو تو میری اس حرکت کے بعد مجھے تمھاری نظروں سے بھی گر جانا چاہیئے۔"

امام الہند اپنی کتاب میں یہ تاثر دیتے نظر آتے ہیں جیسے انھیں اس پورے معاملے کی خبر ہی نہ ہو حقیقت یہ ہے کانگرس کی طرف سے پیامبری کا کام کرنے والے مولانا خود ہی تھے اور اس پورے معاملے میں ملّوث تھے۔ چوہدری خلیق الزماں آگے لکھتے ہیں کہ:

"پھر معلوم نہیں کیوں، 24 جولائی کو جب میں راجہ محمود آباد کے یہاں بیٹھا ہوا تھا بابو جگدمبا پرشاد میرے عزیز دوست مولانا کا پیغام لیکر آئے کہ وہ آپ سے کچھ مزید گفتگو کرنا چاہتے ہیں میں ان سے پنتھ جی کے ہاں جاکر ملا جن کو گورنمنٹ نے اپنی طرف سے رہائش کے لیے یہ مکان دیدیا تھا مولانا اس درمیان اس شرائط نامہ سے کچھ لفظ اوپر نیچے کرکے اور کچھ کاٹ کے مجھے دکھا کر کہنے لگے کہ میرے بھائی دیکھو میں نے اس میں بہت سی ترمیمات کر دی ہیں اب اس کو تمھیں قبول کر لینا چاہیے میں نے اس کو پڑھ کر کہا کہ آج شام میں میرٹھ جارہا ہوں وہاں اس کے متعلق نواب اسمٰعیل خان سے بھی بات کرونگا، اس کے بعد آپ کو جواب دونگا۔ نواب اسمعیل خان نے میرٹھ میں یہ شرائط نامہ پڑھ کر مجھ سے کہا کہ یہ تم نے خوب کیا کہ اس کو ٹھکرا دیا۔ پھر ہم نے آپس میں گفتگو کر کے طے کیا کہ کانگرس کے اس ڈھونگ کا اور کچھ پول کھولا جائے تاکہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ مسلم لیگ کانگرس کی معاشی پروگرام سے گھبراتی ہے اس لیے اس کو صاف کر دیا جائے کہ ہمارے اختلافات صرف مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ہیں اور کانگرس کے معاشی پروگرام سے ہمارا کوئی شدید اختلاف نہیں ہے لہٰذا میرٹھ ہی سے میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ کمیونل یا فرقہ واری مسائل میں مسلم لیگ پارٹی کے ممبران کو اپنے ضمیر کی روشنی میں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا یا نہیں؟ مولانا نے گھبرا کر جواب دیا کہ بھئی یہ تو بہت غور طلب مسئلہ ہے میں سوچ کر اس کا جواب دونگا۔ شام کو چھ بجے پنتھ جی نے لکھنؤ سے ٹیلیفون پر مجھ سے پوچھا کہ کمیونل معاملات سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اور آپ کو تو اس لفظ کے معنی بخوبی معلوم ہونے چاہئیں بہر نوع آپ کی اطلاع کے لیے

میں ان میں مذہب، مذہبی روایات، زبان، ملازمتوں اور دیگر سیاسی حقوق کو شامل سمجھتا ہوں۔ پھر انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لکھنؤ کب آ رہے ہیں؟ میں نے کہا میں اور نواب صاحب کل صبح لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔"

26جولائی 1937ء کو نواب اسمٰعیل خان اور میں دونوں صبح کی گاڑی سے لکھنؤ پہنچ گئے اور لوگ پنتھ جی کے گھر چلے گئے جہاں مولانا صبح کی چائے پی رہے تھے۔ سلام اور دعا کے بعد میں نے جیب سے مولانا کا شرائط نامہ نکال کر ان کے ہاتھ میں دیا اور ان سے کہا کہ مولانا آپ کو معلوم ہے کہ یہ گفتگو میں مسلم قوم کی طرف سے گانگرس سے کر رہا تھا اس میں میرا کوئی ذاتی سوال نہ تھا۔ اس لیے آپ کو سوچنا چاہیئے تھا کہ ان شرائط سے آپ پوری مسلم قوم کی تذلیل کر رہے ہیں۔ بہر نوع کل میں اپنی پارٹی کو لیکر آپ کا مقابلہ کرونگا۔ ہم اپنے گھر چلے آئے اور گانگرس کی طرف سے رفیع احمد قدوائی کی وزارت کا بھی اعلان ہو گیا گویا چار ہندو وزرا، اور دو مسلم یو پی کی کیبنٹ کے وزراء قرار پائے (7)

مولانا کے کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے چوہدری خلیق الزماں لکھتے ہیں کہ:

"اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں مولانا ابو الکلام آزاد نے میرے اور جواہر لال کے اختلافات کو پاکستان کی تعمیر کا ذمہ دار قرار دیا ہے مگر ان اختلافات کی معنویت کو انھوں نے وزارت کے کوزے میں محدود کر دیا ہے میری خط و کتابت سے واضح ہو جائے گا کہ دراصل اختلافات کے جڑ نہ برٹش سامراجیت کے سلسلہ میں تھی نہ گانگرس کے معاشی پروگرام میں۔ نزاع کی بنیاد مسلمانوں کی ہندوستان میں وجود کی معنویت سے تھی۔ یوں تو آج بھی تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ مسلمان ہندوستان کے شہری ہیں۔ سوال یہ تھا کہ کیا کل دس کروڑ مسلمان آزاد ہند میں ایک بے بس اقلیت ہو جائیں جیسی کہ دوسری اقلیتیں۔۔۔ مولانا نے اپنی کتاب میں کہیں اس قسم کے سوالات اٹھا کر اپنے آپ کو جنجال میں نہیں پھنسانا چاہا۔"(8)

کانگرس کے اس متکبرانہ روّیے کا موجدار، سیروائی، منصور احمد اور کانجی سمیت سب نے اپنی کتابوں میں تذکرہ کیا کہ کانگرس نے کس حقارت سے لیگ اور جناح کے تعاون کی پیشکش کو ٹھکرا دیا، ایسے میں نہرو نے متکبرانہ انداز میں کہا کہ ملک کے سیاسی ارتقا میں صرف دو فریق ہیں۔ کانگرس اور انگریز۔ مسلم لیگ کے اس حقارت سے استرداد پر جناح نے فوری جواب دیتے ہوئے کہا ایک تیسری طاقت بھی ہے۔۔۔ مسلمانوں کی ایچ ایم سیروائی اپنی کتاب میں "ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"واضح طور پر کہا جاسکتا ہے کہ گانگرسی لیڈروں کا یہ فیصلہ نہایت غیر دانشمندانہ تھا اور اس کے سنگین نتائج نکلنے تھے۔ مسلمانوں کو اب شدت سے احساس ہوا کہ بحیثیتِ قوم ان کا ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں ہے۔ گانگرس کی اس حرکت کا لازمی مطلب راستوں کا الگ الگ ہونا تھا اور بالآخر یہی صورت پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی۔"

نہرو کی سوانح حیات میں بریچر نے لکھا ہے:

"گانگرس کی فتح کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ اور گانگرس کے درمیان خلیج وسیع تر ہوگئی۔ گانگرس نے فتح کے نشے میں دوسری سیاسی جماعتوں سے غیر مناسب روّیہ اختیار کیا جسے ہمالیہ جیسی غلطی کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ گانگرس کو اس روّیے کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ خود نہرو نے بڑے مغرور لب و لہجے میں 1937ء میں یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں فقط دو قوتیں ہیں ایک برطانوی امپیریلزم اور دوسری ہندو نیشنل ازم، جس کی نمائندگی گانگرس کرتی ہے۔ جناح نے فوراً جواب دیا ایک تیسری پارٹی بھی ہے، وہ ہیں مسلمان۔ تاریخ نے جناح کو سچا ثابت کر دیا۔"(9)

سر پرسول گرفتھ (Percival Griffiths) نے جو ایک زمانے میں مرکزی مقننہ میں یورپین پارٹی کے لیڈر تھے، کانگرس کی اس فاش اور سنگین غلطی پر یوں تبصرہ کیا۔

"گانگرس کے اربابِ حل و عقد مسلم لیگ کو حکومت میں اپنے ساتھ شریک کرنے پر تیار نہ ہوئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جن صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں کانگرس نے بلاشرکت غیرے اقتدار حاصل کر لیا۔ صوبہ متحدہ (حالیہ اترپردیش) میں مسلم لیگ کے لیڈروں کو وزارت میں شرکت کی دعوت دی گئی، لیکن اس شرط پر کہ وہ کانگرس کی رکنیت قبول کر لیں اور مسلم لیگ کا وجود ہی ختم کر دیں۔ دوسرے صوبوں میں بھی اسی قسم کی شرطیں لگائی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کو چھوڑ کر مسلم لیگ کے کسی ممبر کو وزارت میں شامل نہ کیا گیا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آئین اور قانون کی رُو سے کانگرس کو یہ حق پہنچتا تھا کہ جہاں اس کی اکثریت ہو وہاں وہ کسی اور جماعت کو شریک اقتدار نہ کرے اور پارلیمانی طرز حکومت کا عام رواج بھی یہی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عملی نکتہ نظر سے یہ بڑی زبردست غلطی تھی۔ سماجی اور معاشی مسائل میں کانگرس اور لیگ کے درمیان کوئی ایسے بنیادی اختلافات نہ تھے جن کے باعث حکومت میں ان کا اشتراک نامناسب یا ناممکن

ہو۔ بہر حال مسلمانوں نے یہی سمجھا کہ انھیں اقتدار میں اس لیے شریک نہیں کیا گیا کہ کانگرس دراصل ہندوؤں کی جماعت ہے۔"(10)

سیر وائی مزید لکھتے ہیں:

" گانگرس نے ہتک آمیز روّیہ اختیار کیا۔ حالانکہ انتخابات کے دوران دونوں پارٹیوں نے ایک دوسرے سے کسی حد تک تعاون کیا تھااور خاص طور پر یوپی میں تو امید تھی کہ مخلوط حکومت ضرور بنے گی۔ یہ الیکشن سے پہلے کی بات ہے جب گانگرس کو واضح اکثریت کی امید نہیں تھی۔ لیکن انتخابات کے بعد گانگرس سے مسلم لیگ کی تعاون کی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس پیشکش کو ایک دم مسترد کرنے کے بجائے ناقابل قبول شرائط رکھی گئیں۔"

[بریچر نہرواے پولیٹیکل بائیوگرافی صفحہ نمبر 231(11)]

موجمدار کے مطابق جناح صاحب صرف اس وقت تلخ ہوئے جب انھیں پتہ چلا کہ ان کی مصالحتی کوششوں کو حقارت سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جب تک ان کی عزت نفس مجروح نہ ہوئی تھی۔ ان کی تقاریر میں کبھی کسی تلخی کا شائبہ تک نہ گزرا تھا لیکن ساتھ ہی وہ دلائل سے دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش بھی کرتے رہے جیسا کہ ان کی تقریر سے ظاہر ہے جو انھوں نے اپریل 1936ء میں جمیعت العلما کانفرنس منعقدہ دہلی میں کی۔

انھوں نے اپنی تقریر میں بڑی محنت سے واضح کیا کہ نئے آئین میں اقلیتوں کے لیے تحفظات کیوں ضروری ہیں انھوں نے کہا:

"پہلی مرتبہ ہندوستان میں کوئی نمائندہ حکومت قائم کی جارہی ہے۔ جس کا مفہوم ہے اکثریت کی حکومت۔ فطری طور پر اقلیتیں خوف محسوس کر رہی ہیں کہ اکثریت کیا کرے گی۔ اکثریتیں عموما استبدادی روّیہ رکھتی ہیں۔ طاقت اور اختیارات سے عام طور پر لوگوں کو نشہ ہو جاتا ہے۔۔ چنانچہ جمہوری آئین کے کسی بھی منصوبے میں اقلیتوں کے لیے تحفظات کی فراہمی بے حد ضروری ہے۔"

موجمدار لکھتے ہیں کہ آج کے تجربات کی روشنی میں یہ الفاظ کس قدر الہامی ہیں۔ اسی تقریر میں انھوں نے مندرجہ ذیل عمدہ الفاظ کہے:

"ہندوستان کے 8 کروڑ مسلمان مادر ہندوستان کی آزادی کی خاطر دیگر مذاہب کے پیروکاران کے ہمراہ دست بدست لڑنے کے لیے ہر مذہب کے افراد سے زیادہ رضامند بلکہ بے تاب ہیں۔"(12)

منصور احمد، بندوپادھیائے کی کتاب سے ایک کٹر کانگرسی شری وچترنارائن شرما کا حوالہ بھی ان انتخابات کے بارے میں پیش کرتے ہیں جس کے مطابق پاکستان بنانے کے ذمہ دار ہم ہیں یعنی ہندو ' کانگرس ' وہ لکھتے ہیں:

"اس موضوع پر ایک پکا عقیدت مند کانگرسی جو دیانتدار بھی تھا اور جوان دنوں کی واردات کا ذاتی طور پر شاہد تھا اور جو کسی زمانے میں یوپی میں ایک منسٹر بھی تھا، اس شخص نے اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے، میرے ایک سوالیہ خط کے جواب میں اس شخص نے اور باتوں کے ساتھ لکھا ہے۔

کانگرس نے انتخاب میں اکثریت حاصل کرلی تھی، اس کے ساتھ کانگریس کی خود غرضی بڑھ گئی، جواہر لال بھی اس دھارے میں بہہ گئے، یا مجھے کہنا چاہئے کہ ان کے اندر کانگرس کی انا اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی، اس کے شدید نتائج برآمد ہونے لازمی تھے، پاکستان کے وجود میں لانے کی اصلی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے، یعنی ہندو فرقہ پر "دوسرے لفظوں میں کانگریس پر"

یہ ہے بندوپادھیائے کی ایک خط کے جواب میں لکھے گئے شری وچترنارائن شرما (جوشری گاندھی آشرم کے بانیوں میں ایک ہیں اور دم تحریر اس کے سیکریٹری بھی) کے ایک خط مورخہ 14 جولائی 1984ء سے ایک اقتباس۔ بحوالہ بندوپادھیائے، صفحہ 132۔"(13)

کانگرس اور نہرو کے اس ہتک آمیز روّیے پر جناح صاحب نے ردِّ عمل دیتے ہوئے کہا:

"ہمیں کسی دوسرے کے اشاروں پر چلنا ہرگز گوارا نہیں۔ ہم ہر ایسی جماعت یا گروہ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں جو آزاد اور ترقی پسند ہو اور جس کے اصول اور پروگرام ہمارے لیے قابل قبول ہوں۔ لیکن کسی جماعت کی حاشیہ برداری ہمیں منظور نہیں۔ ملک کی بھلائی اور ترقی کے لیے ہم ہر جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کو تیار ہیں، لیکن اسی صورت میں جب ہمیں برابری کا درجہ ملے"

مخلوط حکومت سے انکار کے بعد جناح صاحب نے لکھنؤ میں ایک تقریر کی۔ اس کے بعد جناح اور گاندھی اور جناح اور نہرو میں خط وکتابت شروع ہوگئی جسے سیروائی بد قسمتی قرار دیتے ہیں کہ اس خط وکتابت سے تلخی میں

مزید اضافہ ہو گیا۔ لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا:

"اس قدر معمولی طاقت اور اختیارات ملنے پر اکثریتی فرقے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ کانگرس صرف اس ڈھونگ کا مظاہرہ قوم پرستی کے نام پر کر رہی ہے جب کہ ہندو مہاسبھا الفاظ کا یہ کھیل نہیں کھیلتی۔ میں یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہوں کہ کانگرس کی موجودہ پالیسی کا نتیجہ طبقاتی تلخی، فرقہ وارانہ تصادم اور استعمار کی طاقت میں اضافہ ہی ہو گا۔"

اس تقریر میں مزید جناح صاحب نے مزید کہا کہ "نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ ہم مصیبت اور ظلم کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور ہر ممکن قربانی دینے کو تیار رہیں ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے۔"

پھر انھوں نے اپنی وہ نصیحت دہرائی جو وہ اکثر لوگوں کو کیا کرتے تھے "فیصلہ کرنے سے پہلے کئی بار سوچ لو لیکن جب ایک دفعہ فیصلہ کر لو تو ایک ہو کر اس پر قائم رہو اور کسی حال میں اور کسی قیمت پر قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔"

جناح صاحب کی اس تقریر کو گاندھی نے اعلان جنگ قرار دے دیا۔ سیر وائی اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"بلاشبہ یہ اعلان جنگ تھا، لیکن جیسا کہ جناح نے گاندھی کے جواب میں کہا کہ یہ اعلانِ جنگ اپنے دفاع کے لیے کیا گیا ہے۔ جناح کی تقریر سے ظاہر تھا کہ وہ ترغیب اور دلائل کے تمام ذرائع ختم کرنے کے بعد اس پر مجبور ہوئے تھے۔ دلائل کی ناکامی کے بعد جناح نے مسلمانوں کے اتحاد پر زور دینا شروع کیا، ان کی معاشی، سماجی اور ثقافتی ترقی کی ضرورت کو اجاگر کیا تاکہ مسلمان اپنے قدموں پر کھڑے ہوں۔ گاندھی کے برعکس، جناح نے مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے بہت کم مذہبی جذبات کا سہارا لیا۔"(14)

پھر خط وکتابت کا یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

5 نومبر کو جناح نے اس خط کا جواب دیا جس میں گاندھی نے ان کی لکھنؤ کی تقریر پر اعتراض کیا تھا اور گہرے رنج والم کا اظہار کیا تھا۔ جناح نے لکھا کہ:

"انھیں یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ گاندھی نے ان کی تقریر کو اعلان جنگ سمجھ لیا۔ دراصل ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کے مفاد اور حقوق کا تحفظ کیا جائے اور اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے وہ تقریر کی تھی۔ انھوں نے گاندھی سے درخواست کی کہ "براہِ مہربانی آپ میرا خط ایک بار پھر پڑھیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔۔۔۔ مجھے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ سال کے سیاسی واقعات سے آپ اچھی طرح باخبر نہیں رہے۔"

اس خط کا جواب گاندھی نے تین مہینے بعد دیا:

"آپ یہ نہیں مانتے کہ آپ کی تقریر جنگ کا اعلان تھی۔ لیکن اس تقریر کے بعد آپ کے جوارشادات میری نظر سے گزرے وہ میری رائے کی تائید کرتے ہیں۔۔۔

آپ کی تقریروں میں اب مجھے اس پرانے قوم پرست کی آواز سنائی نہیں دیتی جس سے کبھی ہمارے کان آشنا تھے۔ 1915ء میں جب میں جنوبی افریقہ سے واپس آیا تو آپ کی قوم پرستی کا چرچا سارے ہندوستان میں تھا۔ ہر شخص کہتا تھا کہ آپ سچے اور پکے وطن پرست ہیں اور آپ ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی امیدیں وابستہ ہیں۔ کیا آپ آج بھی وہی پرانے مسٹر جناح ہیں؟ اگر آپ اپنی حالیہ تقریروں کے باوجود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے تو مجھے آپ کی بات پر اعتبار ہے۔"

جناح نے اس خط کا جواب جلد دے دیا اور اس میں بڑی صاف گوئی سے کام لیا:

"آپ فرماتے ہیں کہ قوم پرست جناح کی آواز اب آپ کو نہیں سنائی دیتی۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں بحث کی تلخی کو بڑھانا نہیں چاہتا، ورنہ بتاتا کہ 1915ء میں لوگوں کی رائے آپ کے بارے میں کیا تھی اور اب وہ آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ وطن پرستی کسی شخص کی میراث نہیں اور فی زمانہ وطن پرستی کی تعریف بھی خاصی مشکل ہے۔ بہر حال اس موضوع پر میں مزید بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

گاندھی کا جواب تھا:

"جہاں تک میرا سوال ہے تو ہندو مسلم اتحاد پر ڈاکٹر انصاری میری رہنمائی کر رہے تھے اور اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اب میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا ہے۔ اس لیے آپ کو میرا مشورہ ہے کہ آپ کے اور مولانا صاحب کے درمیان بات چیت پہلی فرصت میں شروع ہو جانی چاہیئے، اور ہر معاملے میں آپ مجھے اپنے ساتھ سمجھئے۔"

03 مارچ 1938ء کو نئی دہلی سے ارسال کردہ جناح صاحب کا جواب کچھ اس طرح تھا:

"میں دیکھتا ہوں جب آپ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ ڈاکٹر انصاری نہیں ہیں اس لیے آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی ہدایت پر چلیں آپ کے رویے اور ذہنیت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی

ہے۔ آپ اگر اس راستے پر چلتے ہیں تو پھر اس المیے کا اعادہ کریں گے جس کا اظہار آپ نے اپنی بے چارگی ظاہر کرتے وقت کیا تھا۔ کیوں کہ کٹر خیالات والے ڈاکٹر انصاری متفق نہیں تھے اور آپ کو کہنا پڑا کہ ' آپ راضی تھے لیکن آپ کہہ بھی کیا سکتے تھے؟ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ بات گول میز کانفرنس میں آپ کے جانے سے پہلے ہوئی تھی، گول میز کانفرنس میں آپ نے یہی المیہ دہرایا تھا۔ جب آپ تو چاہے عارضی طور پر ہی سہی، کچھ شرائط تسلیم کرنے کے خواہش مند نظر آرہے تھے، لیکن وہاں بھی آپ نے کہا کہ چوں کہ ہندوؤں کی خواہش نہیں ہے، اس لیے آپ لاچار ہیں، لیکن اگر ہندو اور مسلمان کسی سمجھوتے پر پہنچ جاتے ہیں تو کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

15 اپریل کو دہلی سے گاندھی نے جناح صاحب کو لکھا:

"کسی بھی حالت میں کیا مولانا ابوالکلام آزاد میرے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں؟ براہ کرم واردھا کے پتے پر لکھنے، جہاں میں کل پہنچ رہا ہوں۔"

اس پر جناح صاحب نے اختصار سے کام لیتے ہوئے صاف گوئی سے کہا:

"میں آپ سے تنہا ملنے کو ہی ترجیح دونگا۔"

جناح صاحب اور نہرو کے درمیان بھی اسی قسم کی خط و کتاب ہوئی 25 فروری 1938ء کو نہرو نے اصل مسئلے سے "لاعلمی" کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا کہ:

"سچ تو یہ ہے کہ میں اب تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ جھگڑا کس بات پر ہے، اسی لیے میں آپ سے درخواست کر تا رہا ہوں کہ آپ اختلافات کی وضاحت فرمائیں۔ لیکن اب تک اس بات میں آپ نے میری کوئی مدد نہیں فرمائی۔۔۔"

چھ روز بعد جناح نے جواب دیا:

"۔۔۔ مجھے آپ کی بے خبری پر حیرت ہے۔ 1925ء سے لے کر 1935ء تک ملک کے ممتاز ترین رہنماؤں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی، لیکن آج تک کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ بہ غور اس مسئلے کا مطالعہ کریں اور حقائق سے چشم پوشی کر کے اپنے آپ کو خوش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ واقعی بات سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو بہ آسانی یہ معلوم ہو جائے گا کہ بنیادی اختلافات کیا ہیں۔ ان

اختلافات کا ذکر مدت سے اخباروں اور سیاسی رہنماؤں کی تقریروں اور بیانات میں آرہا ہے۔"

6اپریل کونہرو نے کانگرس کے نمائندے کی حیثیت سے یہ جواب دیا:

یہ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ خاصی اہم فرقہ وارانہ جماعت ہے اور کانگرس اسی اعتبار سے اس سے تعلق رکھ سکتی ہے۔ مگر کانگرس کو اور بھی بہت سی جماعتوں اور افراد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور ان سب سے تھوڑا بہت تعلق ضرور رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم ان کی اضافی اہمیت کا تعین کریں جس کی جس قدر اہمیت ہے ہم اس کا اتنا ہی لحاظ کرتے ہیں، مگر کوئی فرد یا جماعت کسی دوسری جماعت کے اعتراف کے بل پر اہمیت حاصل نہیں کر سکتی۔ اسے اتنی ہی اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کی وہ اپنی قوت بازو کی بنا پر مستحق ہو۔ ملک میں لیگ کے علاوہ جو سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان میں اکثر ان کی نسبت چھوٹی اور کم عمر ہیں، لیکن انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

چھ روز بعد جناح نے جواب دیا:

معلوم ہوتا ہے کہ آپ میرا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھے۔ آپ کے الفاظ اور انداز بیان سے تحکم اور جنگ جوئی کی بو آتی ہے اور آپ کا خط پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس ہندوستان کی فرماں روا بن چکی ہے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار ہا سر عام اس کا اظہار کر چکا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب تک کانگرس مسلم لیگ کو برابری کا درجہ نہیں دیتی اور ہندو مسلم مصالحت کے لیے اس سے گفت وشنید کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی، اس وقت تک ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انتظار کریں اور اپنی اس قوت بازو پر بھروسا کریں جس کے مطابق بالآخر مسلم لیگ کو اہمیت حاصل ہوگی۔ آپ کی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ میں اپنی بات سمجھانے کی مزید کوشش کروں۔"(15)

1938ء میں اپنی ایک ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کانجی لکھتے ہیں کہ جناح اس بدسلوکی کے بعد بہت تلخ ہو چکے تھے۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ پرشوتم داس سے بات کریں مگر جناح نے انکار کیا اور کہا اس کا فائدہ نہیں کیونکہ اس کا ہندوؤں پر اثر نہیں۔ ہندوؤں پر گاندھی کا اثر ہے اور پٹیل کا بھی لیکن منفی کیونکہ پٹیل نقصان تو کر سکتے ہیں مگر فائدہ نہیں۔ اس ملاقات پر اپنا تبصرہ کرتے ہوئے کانجی لکھتے ہیں کہ:

"اس دن میں نے محسوس کیا کہ جناح میں پہلی سی بات نہیں رہی میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دل میں اس قدر تلخی نہ پیدا ہونے دیں کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ ان کی گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کانگرس نے ان کو بری طرح جھنجھوڑ دیا ہے اور وہ اس بد سلوکی کو نہ تو بھلانے کو تیار تھے اور نہ معاف کرنے پر آمادہ۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جناح بے حد دکھی اور بیزار ہو گئے تھے۔"(16)

موجمدار کے مطابق جناح اب جنگ کے راستے پر چل نکلے تھے کانگرس اور گاندھی سے شدید نفرت نے ان کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ پٹنہ میں ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں انھوں نے بانگ دہل کہا تھا کہ:

"انھیں یہ کہتے ہوئے ہرگز کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ کانگرس کے اس روّیے کے پس پردہ کام کرنے والا دماغ موہن داس کرم چند گاندھی کے سوا اور کسی کا نہیں جو ان تمام آدرشوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے جن کے ساتھ کانگرس کا آغاز ہوا تھا۔ انھوں نے مزید کہا۔۔۔۔۔ گاندھی وہ واحد ذمہ دار شخص ہے جس نے کانگرس کو ہندوستان میں ہندو مت کے احیا اور رام راج کے قیام کے لیے آلہ کار بنا کر استعمال کیا اور وہ کانگرس کو اسی مقصد کے حصول کے لیے استعمال کر رہا ہے۔"(17)

منصور احمد (انڈین مسلم) کے مطابق ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بنیادی دھارے سے مسلمانوں کی برگشتگی اور لاتعلق کے ڈرامے کا یہ تیسرا ڈراپ سین تھا اور اس کا الزام براہ راست، کانگرس پر (بالخصوص پنڈت نہرو پر) جاتا ہے، مسلمانوں کے ساتھ یوپی میں Coalition منسٹری بنانے سے کانگرس کے انکار کو مسلمانوں نے بد عہدی اور وعدہ خلافی سے تعبیر کیا، نہرو کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان ان کو راغب کرنے کے لیے چلائے گئے mass contact پروگرام نے (جس کا کوئی مثبت اثر نہیں تھا) اور الجھن پیدا کر دی تھی، یوپی اور یوپی سے باہر بھی بہت سارے مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ مسلم لیگ کے وجود کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا اس لیے کانگرس کے mass contact پروگرام کے مقابلے میں ایک زبردست جوابی پروپیگنڈہ مسلم لیگ کیڈر کے ذریعے شروع کیا گیا جو اتنا کارگر ہوا کہ متعدد مسلم حلقہ انتخاب کے بائی الیکشنوں میں کانگرس امیدواروں کی شکست ہوئی، شیوا راؤ نے لکھا ہے کہ یہ شکستیں اس بات کی مظہر تھیں کہ نہرو اور کانگرس شدید مصافیاتی 'Tactical' غلطیوں کے مرتکب ہوئے تھے۔"(18)

کانگرسی وزارتیں اور مسلم لیگی کمیٹیاں

کانگرسی وزارتیں بنیں ان پر مسلمانوں کو بہت ساری شکایتیں پیدا ہوئیں کانگرسی وزارتوں سے مسلمانوں کی انھی شکایتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے منصور احمد بندو پادھیائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"""اگرچہ اس گیت (بندے ماترم) کو اس وسیع تاریخی پس منظر سے باہر نکال کر جس میں ناول نگار بنکم چندر چٹو پادھیائے نے اس کی تخلیق کی تھی، دیکھنے پر اس اینٹی مسلم (مسلم مخالف) قرار دینا غیر معقول ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بت پرستی کے کسی مخالف کے سامنے اس کی مقبولیت دشوار ہے۔۔۔"(19)

منصور احمد کے مطابق "بندو پادھیائے نے اس پس منظر کو پوری اہمیت نہیں دی ہے، یہ پس منظر ہی تو مسلمانوں کی نظر میں اس کی کراہیت اور نامقبولیت کا باعث ہے۔"

بندے ماترم گیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"بندے ماترم ہندو احیا پرست ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کی تخلیق ہے جسے انھوں نے اپنی کتاب آنند مٹھ تصنیف 1888 میں شامل کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی تصور یہ ہے کہ ایک گروہ ہے مذہبی جنون والے سادھوؤں کا، جس نے ایک تحریک چلا رکھی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو بھی ملک سے کھدیڑ دیا جائے، کتاب میں مسلمانوں کے لیے بدترین مغلظاتی الفاظ جیسے ملیچھ، یون، دِدھرم، زانی، لٹیرے وغیرہ کا استعمال بہ کثرت کیا گیا ہے۔ یہ سادھو اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کو متاثر کرنے کے لیے بندے ماترم گیت کا جابجا استعمال کرتے ہیں، ایک جگہ تو مصنف، بھارت ماتا کے سپوت سے کہلواتا ہے" بھائی وہ دن کب آئے گا جب ہم مسجدوں کو مسمار کریں گے اور ان کی جگہ رادھا اور مہادیو کے مندر بنائیں گے"

گیت میں وطن یا ماتر بھومی کو دیوی کالی کا پرتیک بتایا گیا ہے اور کالی ماتا کی پوجا کی طرح اس کی بندنا کی گئی ہے (گو آج کل اسے مقبول بنانے کی کوشش میں بندے ماترم کے اصل معنی ماں میں تیری پوجا کرتا ہوں، کی جگہ پر ماں تجھے سلام، بتایا جا رہا ہے) یہ گیت یا انتھم ظاہر ہے مسلمانوں کے لیے صرف کراہیت انگیز ہی نہیں بلکہ اس کے پس منظر پر نظر رکھی جائے تو دل آزار بھی ہے، بنگال کی تقسیم کے خلاف چلائی گئی تحریک میں یہ بکثرت استعمال ہوتا تھا اور نعرے کا بھی کام دیتا تھا، ایسا ہی کانگرس کے جلسوں میں بھی ہوتا تھا، بلکہ مسلمانوں کے اعتراض کے باوجود اس سے احتراز نہیں کیا گیا (گو بعد میں اس کے کئی بند جو کچھ زیادہ ہی مکروہ تھے انھیں

حذف کر کے گایا جانے لگا)(20)

بندو پادھیائے کے نزدیک اور دوسرے معاملے بھی تھے جس پر مسلمانوں نے اعتراضات کیے تھے، اس میں معاملے تھے قومی جھنڈے کے، کانگرسی وزارتوں والے صوبوں میں سرکاری تقریبوں کے افتتاح کے، جو ہندو مذہبی رسومات سے ہوتا تھا اور جس سے مسلم تمدن دوسرے درجے کا متعین ہوتا تھا۔

پادھیائے کے مطابق:

> "یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ آج جبکہ ہندوستان کو ایک سیکولر ملک قرار دیا جا چکا ہے سرکاری تقریبوں میں ان رسموں کو پورے طور پر ترک نہیں کیا جا سکا ہے گو یہ بات سب پر عیاں ہے کہ ان ہندووآنہ رسموں پر زور متعلقہ تقریبوں میں شریک کئی مذہبی اقلیتوں کے لیے باعث الجھن ہو سکتا ہے۔"(21)

مسلم لیگ نے اس بارے کچھ کمیٹیاں بنائیں جن کا کام کانگرسی وزارتوں سے مسلمانوں کی شکایتوں کو اکٹھا کرنا تھا۔

منصور احمد اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "مسلم لیگ اور کانگرس میں مخاصمانہ جذبات تو پیدا ہو ہی گئے تھے اب جب کہ نئی وزارتیں اپنا اپنا کام سنبھال چکی تھیں تو وقت گزرنے کے ساتھ کانگرسی وزارتوں کی کوتاہیاں اور غلطیاں رفتہ رفتہ اکٹھی ہوتی گئیں، یہ شکایتیں کچھ تو سچ تھیں لیکن کچھ منظر عام پر اس لیے لائی گئی کہ مسلم لیگ اس کی تاک میں لگی رہی تھی، مسلم لیگ نے ان کوتاہیوں اور غلطیوں کا ریکارڈ ترتیب دینے اور شکایتوں کی جانچ کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے اپنی کئی کمیٹیاں بنائی تھیں ان کمیٹیوں نے بالترتیب اپنی اپنی رپورٹیں مرتب کیں۔
>
> پیرپور رپورٹ (شائع شدہ نومبر 1938ء)

فضل الحق رپورٹ برائے بنگال

بہار سے متعلق شریف رپورٹ (سید شریف بار ایٹ لا نائب پرنسپل لا کالج پٹنہ، وقف شمس الہدیٰ پٹنہ کے متولی، شریف کالونی مصلح پور کے مالک مشہور شخصیت تھے یہاں کے روّیہ سے عاجز ہو کر 1953ء کے بعد پاکستان چلے گئے۔

قابل ذکر ہے ان رپورٹوں میں مسلمانوں کی شکایتوں کی تفتیش شدہ تفصیلات تھیں، تاہم کانگرس نے

کثرو بیشتر شکایات کو مسترد کر دیا۔

مولانا آزاد اپنی کتاب آزادی ہند کے صفحہ نمبر 27 میں ان الزامات کی یوں تردید کرتے ہیں:

"میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمام الزامات مطلقاً بے بنیاد تھے۔ مسلم لیگ کی پھیلائی ہوئی زیادتیوں کی کہانیاں خالصتاً ذہنی اختراع تھیں۔"

مولانا آزاد کے اس دعوے پر منصور احمد (انڈین مسلم) یوں جواب دیتے ہیں:

"تاہم اسی صفحہ پر مولانا خود ناانصافی کا رونا روتے ہیں، جس کا ارتکاب ان کی کانگرس پارٹی، (پارسی) نریمن کو ممبئی میں اور (مسلمان) ڈاکٹر محمود، کو بہار میں وزیر اعلیٰ نہ بنا کر کر چکی تھی اور جو غیر ہندوؤں کے ضمن میں نگرس کی بے حسی کا زبردست ثبوت تھا۔ مولانا آزاد ہی کے لفظوں میں (اسی صفحہ):

"بہر حال ایک حقیقت مجھے واضح کر دینی چاہیے، بہار اور ممبئی کی صوبائی کانگرس کمیٹیوں نے ڈاکٹر سید محمود اور نریمن کو مقامی قیادت سے محروم رکھ کر غلطی کی تھی اور ورکنگ کمیٹی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اس غلطی کا تدراک کر سکے۔"

متذکرہ بالا اقتباس مولانا آزاد کی کتاب 1959ء والے ایڈیشن کا ہے بعد والے یعنی 1988ء کے ایڈیشن میں صفحہ 16-17 پر جو آزاد کے ذریعے کھل کر بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے:

ممبئی میں مسٹر نریمن مقامی کانگرس کے مصدقہ لیڈر تھے، جب صوبائی حکومت کے قیام کی بات آئی تو عام طور پر یقین کیا گیا کہ مسٹر نریمن کو ہی (ان کے شہرت اور ریکارڈ کے بنا پر) اس کی سربراہی کرنے کو کہا جائے لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک پارسی کو چیف منسٹر بنایا جاتا جب کہ اسمبلی میں کانگرسی ممبران کی کثریت ہندوؤں کی تھی، سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اس پر اپنے کو راضی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا ایسا کرنا کانگرس کے ہندو حامیوں کے حق میں نامناسب ہو گا، انھیں اس سرفرازی سے محروم رکھا گیا، لہٰذا بی۔جی کھیر کو منظر عام پر لایا گیا اور وہی کانگرس اسمبلی پارٹی کے سربراہ "یعنی چیف منسٹر منتخب ہوئے"۔

اسی طرح 1988ء ایڈیشن میں ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

"اسی طرح کا ایک واقعہ بہار میں پیش آیا، ڈاکٹر سید محمود کانگرس کے سربراہ لیڈر تھے، وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک جنرل سیکریٹری بھی تھے، اس طرح اس صوبے میں اور اس کے باہر بھی ان کا اپنا ایک مقام تھا، بہار میں جب کانگرس قطعی اکثریت لے آئی تو سبھوں نے یہ مان لیا تھا کہ ڈاکٹر سید محمود ہی لیڈر منتخب کیے جائیں گے، اور وہی بہار کے پہلے چیف منسٹر بنیں گے، لیکن ایسا نہ کر کے شری کرشن سنہا جو مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے

انھیں بہار میں واپس بلایا گیا اور چیف منسٹر شپ کے لیے تیار کیا گیا، بہار میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی رول ادا کیا جو ممبئی میں سردار پٹیل نے کیا تھا، بہار اور ممبئی میں فرق صرف یہ تھا کہ جب شری کرشن سنہا نے یہاں سرکار بنائی تو ڈاکٹر سید محمود کو کیبنٹ میں جگہ دی گئی۔"

مولانا کے دونوں متنوں کو آمنے سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو مولانا کے قول کی قلعی کھلتی ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ فضل الحق رپورٹ، شفیع رپورٹ اور پیرپور رپورٹ میں درج مسلمانوں کی شکایتیں مطلقاً بے بنیاد تھیں اس سے مولانا آزاد کی جو شخصیت سامنے آتی ہے، وہ بہت حسین نہیں ہے (22)

کانگرسی وزارتوں کا استعفیٰ

3 ستمبر 1939ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم نیویل چیمبرلین نے ریڈیو پر اعلان کیا کہ برطانیہ اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی ہے۔ تقریباً اسی وقت وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے بھی اعلان کیا کہ ہندوستان بھی جنگ میں شریک ہو گیا ہے۔ دو روز کے بعد، بولتھو کے مطابق، گاندھی نے وائسرائے سے ملاقات کی اور دوران گفتگو انھوں نے برطانیہ کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ جرمنوں کی بمباری سے برطانوی پارلیمنٹ اور ویسٹ منسٹر ایبے کی تباہی کا تصور کر کے وہ رو پڑے۔ پھر اس طرح کی باتیں انھوں نے وائسرائے کو ایک خط میں لکھیں:

"اس وقت مجھے ہندوستان کی نجات کے مطلق فکر نہیں۔ ہندوستان کو آزادی تو ایک نہ ایک دن مل ہی جائے گی، لیکن اگر برطانیہ اور فرانس شکست کھا گئے یا انھوں نے تباہ و خوار ہو کر جرمنی پر فتح پائی، تو ہندوستان کی آزادی کس مصرف کی ہو گی"؟

ٹنڈولکر گاندھی کے الفاظ یوں بیان کرتے ہیں:

"I hope that it is clear to my critics that my sympathy for England and France is not a result of momentary emotion or, in cruder language, of hysteria."

"انگلینڈ اور فرانس سے میری ہمدردی کسی وقتی جذباتیت یا بھونڈے الفاظ میں، ہسٹیریا کا نتیجہ نہیں ہے۔"(23)

"انگلستان اور فرانس سے اپنی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے گاندھی جی نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ ذاتی حیثیت میں اس سے ملنے آئے ہیں اس ضمن میں انھیں ورکنگ کمیٹی کا آشیرباد حاصل نہیں۔

8 ستمبر کو پنڈت جواہر لال نہرو نے برطانیہ کو یقین دلایا کہ "کانگرس کا ہرگز یہ ارادہ نہیں کہ وہ برطانیہ کی موجودہ مصیبت سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ اس جنگ میں ایک طرف آزادی اور جمہوریت ہے اور دوسری طرف فسطائیت اور ہوس ملک گیری۔ اس صورت میں ہندوستان کو پوری طرح جمہوریت کا ساتھ دینا چاہیئے۔"

بولتھو اس پر لکھتے ہیں کہ "لیکن جمہوریت سے یہ ہمدردی زیادہ دن باقی نہ رہی۔"

15 ستمبر 1939ء کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ:

"ورکنگ کمیٹی بلا ہچکچاہٹ جرمنی کی نازی حکومت کی پولینڈ کے خلاف تازہ ترین جارحیت کی مذمت کرتی ہے اور اس کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔۔۔ لیکن ہندوستان خود کو کسی ایسی جنگ سے وابستہ نہیں کر سکتا جو جمہوری آزادی کے نام پر لڑی جارہی ہو جبکہ ہندوستان کو خود اس آزادی سے محروم رکھا گیا ہے اور جو محدود سی آزادی اس کے پاس ہے وہ بھی اس سے چھین لی گئی ہے۔"

ورکنگ کمیٹی کے اندر گاندھی جی نے سرکار برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کے لیے تنہا جنگ لڑی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے مندرجہ بالا قرارداد پر گاندھی جی نے کچھ یوں تبصرہ کیا:

"The Working Committee's statement on the world crisis took four days before reeived it final shape. Every member expressed his opinion freely on the draft that was, at the committee's invitation, prepared by Pandit Jawaharlal Nehru. I was sorry to find myself alone in thinking that whatever support was to be given to the British should be given unconditionally.

"عالمی بحران پر ورکنگ کمیٹی کے بیان کو حتمی شکل اختیار کرنے میں چار روز لگے۔ ہر رکن نے اس خاکے پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کیا جسے کمیٹی کی دعوت پر پنڈت جواہر لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ مجھے خود کو برطانوی حکومت کی غیر مشروط حمایت کے معاملے پر خود کو تنہا پاکر بے حد رنج پہنچا۔"(24)

عدم تشدد کے دیوتا کی ایسی قلابازیوں پر دوسرے باب میں تفصیلی نظر ڈالی جائے گی۔ یہ وہی جنگ عظیم دوم ہے جس میں بعد میں موصوف نے اپنا معروف خط ہر برطانوی کے نام لکھا کہ وہ نازیوں کے تشدد کا جواب عدم تشدد سے دیں۔

مسلم لیگ نے بھی جنگ پر اپنی قرارداد موجمدار کے مطابق کچھ اس طرح منظور کی کہ اس میں اتحادیوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا گیا تھا اور کانگرسی قرارداد کے برعکس اس میں حکومت سے یہ یقین دہانی طلب کی گئی تھی کہ ہندوستان میں دستوری پیش رفت سے متعلق کوئی اعلان نامہ جاری نہ کیا جائے اور نہ مسلم لیگ کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی آئین تیار کیا جائے۔

خیر، 25 نومبر تک، کانگرس کی ساتوں وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ کانگرسی وزارتوں کے ختم ہونے پر جناح صاحب نے مسلم لیگ کو حکم دیا کہ 22 دسمبر کو سارے ملک میں یوم نجات منایا جائے۔

کانگرسی وزارتوں کے استعفیٰ سے، موجمدار کے مطابق، وائسرائے کا روّیہ کانگرس کے تئیں تبدیل ہو گیا کیونکہ صوبوں میں تمام اختیارات گورنروں کے کنٹرول میں چلے گئے۔

موجمدار کے مطابق:

> "جناح نے اس موقعے کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ جناح کے نام 23 دسمبر 1939ء کو لکھے گئے ایک خط میں وائسرائے نے لیگ کو مطلوبہ یقین دہانی کرائی "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تاجدار برطانیہ کی حکومت مسلم فرقے کے اطمینان کی اہمیت سے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہے۔"

اگرچہ وائسرائے کے ساتھ پہلے مذاکرات میں جو جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہوئے گاندھی جی نے انگلستان اور اس کے اتحادیوں کے لیے گہری جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ اور انھیں غیر مشروط حمایت کی پیشکش کی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے روّیے میں تبدیلی آگئی۔ بعد میں انھوں نے وضاحت کی کہ غیر مشروط حمایت کا مفہوم خالصتاً عدم تشدد کی بنیاد پر اخلاقی تائید کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے روّیے میں یہ سختی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس پٹنہ منعقدہ 28 فروری 1940ء کو نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ یہ اجلاس اس پالیسی قرارداد کا خاکہ تیار کرنے کے لیے بلایا گیا تھا جسے کانگرس کے آئندہ اجلاس رام گڑھ میں پیش کیا جانا تھا۔ اس کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ یہ قرارداد ہندوستان میں برطانوی راج پر کڑی نکتہ چینی سے شروع ہوئی اور اس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس میں کسی ایسی جنگ میں شرکت سے معذروی ظاہر کی گئی تھی جو استعماری مقاصد کے حصول کی خاطر لڑی جا رہی ہو۔ آخر میں اس میں دھمکی دی گئی کہ کانگریس وزارتوں سے استعفی کے منطقی نتیجے کے طور پر سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کر دے گی۔

غیر کانگریسی حلقوں نے ہندوستان بھر میں قرارداد رام گڑھ کی منظوری پر افسوس کا اظہار کیا۔ لبرل رہنماؤں نے اسے قومی بین الاقوامی صورتحال سے مکمل لاتعلقی پر مبنی قرار دے کر نکتہ چینی کی۔ جناح نے اس قرارداد

کو سیاسی فہم و دانش سے یکسر محروم قرار دیا۔ انگلستان اس وقت حیات و موت کی صورتحال سے دوچار تھا۔ اس نازک موقعے پر جناح نے انگلستان کو تعاون کی پیشکش کی جب کہ گاندھی جی پہلے تو بہت پسیجے تھے لیکن بعد میں سول نافرمانی کی دھمکیاں دینے لگے۔"(25)

مطالبہ پاکستان کی وکالت

1940ء کا سال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے انتہائی اہمیت کا سال تھا جس میں مسلم لیگ نے ہندوستان میں ایک علیحدہ آزاد اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ 23 مارچ 1940ء سے کچھ عرصہ پہلے، بولتھو کے مطابق، انگلستان کے دو رسائل میں دو مضامین شائع ہوئے تھے جو مطالبہ پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مضمون ایک انگریز اخبار نویس کا تھا جو انھی دنوں مسٹر جناح سے ملا تھا دوسرا مضمون خود جناح کا تھا اور 9 مارچ 1940ء کو مشہور انگریزی ہفت روزہ "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" میں شائع ہوا تھا۔

"ہندوستان کا سیاسی مستقبل کیا ہے؟ جہاں تک حکومت برطانیہ کا تعلق ہے وہ اپنے اس مقصد کا اعلان کر چکی ہے کہ ہندوستان کو جلد از (statute of Westminiter) کے مطابق دولت مشترکہ کے دوسرے ارکان کے برابر آزادی دی جائے گی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ جلد ہندوستان میں اسی قسم کا جمہوری آئین نافذ کرنا چاہتی ہے جس کا اسے خود تجربہ ہے اور جسے وہ سب سے بہتر سمجھتی ہے۔ اس طرز کے آئین کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو سیاسی جماعت انتخاب میں کامیاب ہو اسی کے ہاتھ میں عنانِ حکومت ہو۔

یہ ارادہ بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن ہندوستان کے مخصوص اور غیر معمولی حالات کو دیکھتے ہوئے نہایت غیر مناسب ہے، بات یہ ہے کہ ہندوستان میں حکومت کے اتنے طویل تجربے کے باوجود برطانیہ اس ملک کے حالات سے اچھی طرح واقف نہیں۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ کے اکثر ممبر بھی اس معاملے میں بالکل بے خبر ہیں۔ اسی لاعلمی کے باعث اب تک یہ بات برطانیہ کی حکومت اور اس کے عوام کی سمجھ میں نہ آسکی کہ برطانوی طرز کا پارلیمانی آئین ہندوستان کے لیے ہرگز مناسب نہیں۔ برطانوی قوم صحیح معنوں میں ایک یک رنگ اور متحد قوم ہے اور وہاں جس طرز کی جمہوریت رائج ہے وہ اسی قومی یک رنگی اور اتحاد کی بنیاد پہ قائم ہے۔ مگر ہندوستان میں حالات بہت مختلف ہیں اور قومی یک رنگی یہاں مفقود ہے۔ لہٰذا برطانوی طرز کی جمہوریت اس ملک کے لیے بالکل موزوں نہیں۔ ہندوستان

کی آئینی الجھنوں کا بنیادی سبب یہی ہے کہ یہاں اس ناموزوں اور ناموافق طرز حکومت کے قیام پر اصرار کیا جارہا ہے۔"

پھر مسٹر جناح نے اس پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ میں سے ایک اقتباس پیش کیا جس نے چھ سات برس پہلے ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے مسائل کا جائزہ لیا تھا:

"ہندوستان میں متعدد نسلوں کے لوگ بستے ہیں۔ ان میں سے بہت سی نسلیں اپنی روایات اور طرز زندگی میں ایک دوسرے سے اسی قدر مختلف ہیں جتنی یورپ کی قومیں۔ اس ملک کے دو تہائی باشندے ہندو مت کے پیرو ہیں اور پونے آٹھ کروڑ کے قریب مسلمان ہیں۔ ان دو فرقوں کا باہمی اختلاف صرف مذہبی معاملات تک محدود نہیں، ان کے کلچر اور قانون بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ہندو مت اور اسلام دو مختلف تہذیبوں کے مظہر ہیں۔ ہندو مذہب اور سماج کا بنیادی اصول ذات پات کی تفریق ہے اور یورپ سے تعلقات وروابط کا اس تفریق پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اس کے برعکس انسانی مساوات کا تصور فلسفہ اسلام میں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اقتباس کے متعلق جناح نے لکھا کہ "اتنے مختصر الفاظ میں ہندوستان کی اس سے زیادہ صحیح تصویر شاید کہیں اور نہ ملے" آگے چل کر انھوں نے لکھا:

"برطانیہ کے باشندے عیسائی ہیں۔ وہ اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں ان کے ملک میں بھی مذہبی جنگیں ہوئی ہیں اور آج وہ مذہب کو محض ایک ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں جو خدا اور بندے کے تعلقات تک محدود ہے، لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے اس قسم کا روّیہ اختیار کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ ہندو مت یا اسلام محض مذہب نہیں بلکہ ایک نظام حیات ہے جو صرف خدا اور بندے کے تعلقات تک محدود نہیں بلکہ اپنے اپنے پیروؤں کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر پہلو پر محیط ہے۔ وہ ان کے باہمی تعلقات، ان کے کلچر اور قانون اور ان کی تمام معاشرتی زندگی پر حاوی ہے۔ یہ دونوں مذاہب بنیادی طور پر ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ ان کے پیروؤں میں وہ باہمی یک رنگی اور ہم خیالی پیدا نہیں ہو سکتی جس کے بغیر مغربی طرز کی جمہوریت کا تصور بھی ممکن نہیں۔"

ہیکٹر بولتھو مزید لکھتے ہیں کہ:

"اس سے چند ہی دن قبل سر پرسول گرفتھزرات کے کھانے پر مسٹر جناح کے مہمان تھے۔ وہاں دوران گفتگو میں انھوں نے سر پرسول سے کہا: جب تک ہندوستان کی خود مختاری کا

مسئلہ نہ اٹھا انگریزوں نے اتنی خوبی سے حکومت کی کہ تاریخ میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ لیکن جب قوم کی سیاسی آرزوئیں بیدار ہوئیں اور آئینی اصلاحات کا دور آیا تو حکومت برطانیہ ہندوستان کی محکوم قوموں کی ذہنیت اور احساسات کو بالکل نہ سمجھ سکی۔ آپ ہندوستان کی جس وحدت کا ذکر کرتے ہیں اس کا وجود صرف آپ کے تصور میں ہے۔ اس وحدت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ انگریزوں نے دانشمندی سے اس ملک پر ایک متحدہ حکومت مسلط کر دی۔ آپ پارلیمانی جمہوریت کی حمایت کرتے ہیں لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی کامیابی کی جو بنیادی شرائط ہیں وہ اس ملک میں پوری نہیں ہو سکتیں۔"(26)

سر پر سول گرفتھز کے مطابق کہ اس تمہید کے بعد جناح نے بڑے معقول اور مؤثر انداز میں دو قومی نظریے کی وضاحت اور مطالبہ پاکستان کی تشریح کی... میں نے اور دوسرے مہمانوں نے انھیں تصویر کا دوسرا پہلو بھی دکھانے کی کوشش کی اور ان مشکلات و مسائل کی طرف اشارہ کیا جو تقسیم ملک سے پیدا ہوں گے، مثلاً ملک کے اقتصادی نظام میں گڑبڑ کا خطرہ، سرحدوں کی حفاظت کا مسئلہ اور انتظامی دقتیں۔ لیکن جناح نے ان سب اعتراضات کو نظر انداز کر دیا اور اپنی تجویز کی تفاصیل پر بحث کرنے سے انکار کر دیا۔ جناح میں اس بات کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ اگر وہ کسی واضح تصور کو ایک مرتبہ قبول کر لیے تو اس پر قائم رہتے اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں جن دقتوں اور رکاوٹوں کا اندیشہ ہوتا ان کا قطعاً خیال نہ کرتے۔ اسی یک جہتی اور پامردی میں ان کی قوت و اعتماد کا راز پنہاں تھا۔ قریباً نصف صدی تک جناح ہندوستان کے قومی اتحاد کے پیامبر رہے تھے اور اس اتحاد کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ لیکن اب ان کے خیال میں انقلاب آچکا تھا اور وہ ہندوستان کو تقسیم کرانے کا تہیہ کر چکے تھے۔

اس نصب العین سے نہ انھیں دھمکیاں دے کر ہٹایا جا سکتا تھا نہ خوشامد کر کے۔"(27)

کانگرس نے اپنے رام گڑھ اجلاس میں 19 مارچ 1940ء جو ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں اس نے ہندوستان کی فوری آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے صاف لفظوں میں یہ بھی کہا کہ ہندو مسلم تعلقات کے مسائل حصول آزادی کے بعد منعقد ہونے والے قانون ساز اسمبلی میں طے ہوں گے۔

کانگرس کی اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے منصور احمد (انڈین مسلم) لکھتے ہیں کہ:

"ظاہر ہے کانگرس کے اب تک کے قول و فعل کے ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ باور کرنا حماقت ہی ہوتی کہ کوئی ہوشمند مسلمان کانگرس کی فراخدلی کا انتظار کرنے کا حوصلہ اس

وقت تک بر قرار رکھ سکتا تھا، جب ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد قائم ہونے والی آئین ساز اسمبلی یہی کانگر سی ان کی قسمت کے فیصلے کرنے بیٹھتے۔"(28)

یہ تھا وہ پس منظر میں جس میں مشہور زمانہ قرار داد لاہور پاس ہوئی۔ اس قرارداد میں ابتداً لفظ پاکستان شامل نہیں تھا۔ اس پر چوہدری خلیق الزماں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"مسلم عوام کو نیشنلسٹ پریس نے ایک Concentrated یعنی مرکب شدہ نعرہ فراہم کر دیا جس نے بڑی سرعت سے ان کے دل و دماغ میں ایک مملکت کا تخیل پیدا کر دیا مسلمان رہنماؤں کو لاہور ریزولیوشن کی تشریح اور اس کے اصل مقصد و مطلب کو ذہین نشیں کرنے میں وقت لگتا۔ ان کی برسوں کی محنت (جو اس پر کرنی پڑتی) اس طرح کم ہو گئی، کیونکہ ہندو پریس نے جانتے بوجھتے طنزاً لاہور ریزولیوشن کو پاکستان کہہ کہ پیش کیا تھا اس پر جناح نے کہا تھا ہم نے لفظ پاکستان کو داخل نہیں کیا تھا وہ تو ہندو پریس نے اس لفظ کو ہمیں عنایت کر دیا ہے۔ لاہور ریزولیوشن کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے انھوں (ہندو پریس) سے پاکستان ریزولیوشن بناڈالا۔ یہ نام اس وجہ سے مشہور ہو گیا اور اس کے لیے جناح ان کے مشکور ہی ہوئے۔ (نوٹ: لاہور ریزوریشن کا نام بدل کر ایک برس بعد مسلم لیگ کے مدراس اجلاس میں 15 اپریل 1941ء کو پاکستان ریزولیوشن کیا گیا) ہندو پریس اور ہندوؤں کے اس روّیے میں بڑے گہرے مضمرات دیکھے جاسکتے ہیں اور بہت سارے مواقع پر پچھلے دنوں (اور بعد میں بھی) انھیں کی وجہ سے مسلمانوں کے روّیے میں بھی سختی آتی گئی۔"

منصور احمد لکھتے ہیں کہ ان وجوہات اور شکایتوں کے پس منظر میں لاہور ریزولیوشن پاس ہوا۔ کانگرس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ 'لاہور ریزولیوشن' کو 'پاکستان ریزولیوشن' کہہ کر اس کا مذاق اڑایا، الٹا کانگرس اس بات پر زور دیتی رہی کہ پہلے ہندوستان آزاد ہو جائے پھر ہندو مسلم معاملات سے نمٹا جائے گا۔ منصور احمد کے مطابق، جبکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلم سوچ کی بنیادی اور نفسیاتی ہیئت کو مد نظر رکھ کر ان شکایات کو وسعت قلبی سے دیکھا جاتا۔ ایک مقتدر کانگر سی شری اجیت پر ساد جین نے تقسیم کے اسباب اور اس موضوع پر اپنی کتاب (جو تقسیم کے بعد لکھی گئی ہے) "رفیع احمد قدوائی" میں یوں نظر ڈالی ہے۔

"اس وقت بھی جب مسلمان اپنے عروج کی منزل پر تھے ہندوؤں نے ان کے ساتھ سمتا اچھوت کا برتاؤ کیا تھا براہمن (مسلم جاگیر داروں اور زمینداروں کے آگے) جھک کر آداب بجالا سکتا تھا لیکن وہ مسلمان کا چھوا ہوا کھانا نہیں کھا سکتا، جودھابائی نے اکبر سے شادی

کیا تھا اس کے ساتھ زن و شو کے تعلقات تھے لیکن 'ممبو دیری' بیوی کی طرح وہ اپنے شوہر کے ہاتھوں کا چھوا ہوا کھانا نہیں کھا سکتی تھی۔"

منصور احمد کہتے ہیں کہ انگریز مؤرخوں اور تبصرہ نگاروں کے بارے میں تو باتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا الزام دیا جا سکتا ہے۔ اجیت پرشاد جین کے بارے میں ایسا کہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔

ترک خاتون مصنفہ، خالدہ ادیب خانم کا حوالے دیتے ہوئے منصور احمد لکھتے ہیں کہ:

ترک خاتون مصنفہ خالدہ ادیب خانم (جن کے سیکولرزم اور گاندھی، نہرو کے مداح ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا) اپنی مشہور کتاب 'انسائیڈ انڈیا' میں لکھتی ہیں۔

> "ابھی تک ہندوؤں کی غالب ذہنیت کا سچا منظر یہ فرقہ پرستی ہے، ہندو فرقہ پرست جہاں اکثریت سے گھرے ہوئے ہیں وہاں اعلانیہ غیر ملکی حکومت کے قائم رہنے کی وکالت کر تے ہیں لیکن جہاں وہ اکثریت کا جزو ہیں (جیسا کہ اکثر مقامات پر ہے) وہاں وہ وطن پرست ہیں مگر ان کے ذہن میں ہندوستان ایک ہندو ملک ہے جس میں مسلمانوں کو کوئی جگہ نہیں ملنی چاہیے، صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ جب تک مسلمان یا عیسائی موجود ہیں اس وقت تک ہمیں قرار نہیں آسکتا، ان کی قوم پرستی ایک مذہب آمیز نسلی فاشسیت ہے، مسلمان جب آئندہ ہندوستان میں ہندو فرقہ پرستوں کی حکمرانی کے امکان کا ذکر کر تے ہیں تو اس کا لب لباب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اگر ان کی حکومت ہوئی تو زمانہ مستقبل کے اچھوت ہم ہوں گے۔"

منصور احمد، پندو پادھیائے کے کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ "ہندوؤں کے مقابلے میں مثبت رشک یا حسد (Positive Envy) اور ان کے تئیں خوف نے ایک ایسی زرخیز زمین تیار کر رکھی تھی جس میں علیحدگی پسندی کی نشو نما ہوئی۔ ان دو عناصر کا محرک یہ ڈر تھا کہ اسلام اور اسلامک کلچر خطرے میں نہ پڑ جائیں۔"

منصور احمد کے مطابق گاندھی نے اوّل تو ان باتوں کا نوٹس نہیں لیا دوم اگر لیا بھی تو ان کو اتنی اہمیت نہیں دی۔(29)

گاندھی مسلم خدشات کو کس قدر اہمیت دینے کو تیار تھے اس کا اندازہ ان کی اس گفتگو سے ہوتا ہے جو انھوں نے 1942ء میں امریکی صحافیوں سے کی۔

> Two American Journalists interviewed Gandhi that week in "but what does a free India mean, if as Mr

Jinnah said , Muslims will not accept Hindu rule?"

The Mahatma replied: 'I have not asked the British to hand over to the Congress or to the Hindus. Let them entrust India to God or in modern Parlance to anarchy. Then all parties will fight one another like dogs, or will, when real responsibility faces them, come to a reasonable agreement. I will expect non violence to arise out of that chaos'.

Gandhi was reminded by a reporter for 'the Hindu' that until recently he had always said there could be no swaraj without Hindu Muslim unity and then he was asked why he had of late insisted there would be no unity until India has achieved independence! The seventy three years old Mahatma answered:

I have come to there sultant conclusion that the two communities will come together almost immediately after the British power comes to a final end in India.

"اپریل 1942ء دو امریکی جرنلسٹوں نے اس ہفتے واردھا میں مہاتما گاندھی کے انٹرویو لیے تھے ایک جرنلسٹ نے سوال کیا تھا۔ "لیکن ایک آزاد ہندوستان کے معنی کیا ہوں گے؟ جبکہ جیسا کہ مسٹر جناح کہتے ہیں مسلمان ہندو حاکیت کو منظور نہیں کریں گے۔"

مہاتما نے جواب دیا "میں نے برٹش حکومت سے ہندوستان کو کانگرس کے ہاتھوں سونپ دینے کو نہیں کہا ہے وہ اسے بھگوان کے حوالے کر دیں یا آج کی زبان میں انارکی کے حوالے۔تب سبھی پارٹیاں ایک دوسرے سے کتوں کی طرح لڑیں گی جب اصل ذمہ داری کا انھیں احساس ہو گا تب وہ حقیقت پسندانہ تصفیہ پر پہونچیں گی، میری امید ہے ایسے افراتفری کے بیچ سے عدم تشدد ابھر کر سامنے آئے گا۔"

"گاندھی جی کو اخبار، ہندو کے ایک رپورٹر نے یاد دلایا کہ اب تک تو وہ یہ کہتے رہے تھے کہ جب تک ہندو اور مسلمان میں اتحاد نہیں ہو گا، سوراج نہیں آئے گا، اور پوچھا کہ بعد میں انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اتحاد اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کو آزادی نہیں مل جاتی، اس پر 70 سالہ مہاتما نے جواب دیا۔۔۔

اس لیے کہ میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ دونوں قومیں اس وقت تقریباً یکایک قریب آجائیں گی، جب برطانوی عملداری کا ہندوستان میں خاتمہ ہو جائے گا۔ "(30)

منصور احمد گاندھی کے اس روّیے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"ناظرین از خود دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح گاندھی جی کا یہ روّیہ جو مبہم الفاظ میں بھی(جو شاید ان کا اپنا سٹائل تھا) عیاں ہے، مسلمانوں کے شبہات اور اندیشوں کو یکجا کرنے اور ان کے ردِ عمل کو سخت تر کرنے کا حامل تھا (مسلمان یہی تو ڈر رہے تھے کہ اگر ہندو مسلم تنازعات حل ہوئے بغیر ہندوستان آزاد ہو گیا تو ہندو اپنی سٹیم رولر میجارٹی کے بوتے پر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے مغلوب کر کے رکھنے کا اہل ہو جائے گا۔"

والپوٹ اسی رو میں لکھتے ہوئے پنڈرل مون کی کتاب سے اقتباس میں کہتے ہیں۔ (انگریزی سے ترجمہ از مصنف)

"لیکن ویول، گاندھی جی سے پورے طور پر بدل ہو چکے تھے کیونکہ ان کی رائے میں وہ (گاندھی جی) ایک انتہائی چالاک، اپنی بات پر اڑیل، جابرانہ خصلت والے، ناپختہ گو، یک رخے سیاستدان تھے اور (ویول کے خیال میں) گاندھی جی کے اندر حقیقی درویش صفتی نہ ہونے کے برابر تھی۔"

پنڈرل مون کی کتاب "ویول" صفحہ 314 پر ویول کی ذاتی ڈائری سے اقتباس:

Wavell, however, was thoroughly disenchanted with Gandhi whom he judged to be an exceedingly shrewd, obstinate, domineering, double tongued, singled minded politician, and there is little true saintliness in him."

منصور احمد گاندھی جی کے بارے میں آگے کہتے ہیں کہ "اس بات پر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ گاندھی جی کے شاگرد رشید بھاوے جی نے بھاگلپور میں اردو روزنامہ "دعوت" (ان دنوں یہ روزنامہ ہی تھا) کے مدیر مسلم صاحب کے استفسار پر فرمایا تھا کہ "مذہب گاندھی جی کا عقیدہ نہیں بلکہ ایک پالیسی تھی۔" یہ تقریباً 1968ء کی بات ہے۔(31)

'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک اور جناح گاندھی مذاکرات

گست 1942ء میں کانگرس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کر دی۔ گاندھی کا خیال تھا کہ ہندوستان میں برطانوی تسلط جاپانیوں کو اس ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر آج انگریز ہندوستان چھوڑ دیں تو

جاپانیوں کو ہمارے ملک پر حملہ کرنے کی ہوس نہیں رہے گی۔ حکومت نے اس تحریک کے خلاف سخت کاروائی کرتے ہوئے کانگرس کے تمام بڑے بڑے رہنما قید کر لیے۔

موجمدار نے اچاریہ کرپلانی کی 4 دسمبر 1961ء کی لوک سبھا میں کی گئی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا " کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بیشتر ارکان 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک کے خلاف تھے۔ پھر گاندھی جی نے کہا کہ آپ کانگرس کے ارکان ایک قابل احترام اور بہت ذمہ دار تنظیم ہیں۔ آپ یہ جُوا نہیں کھیل سکتے لیکن میں نے تمام عمر جوا کھیلا ہے اور میں اسے تنہا کھیل لونگا۔"

موجمدار کے مطابق گاندھی یہ جُوا اس لیے کھیلنا چاہتے تھے تاکہ وہ اپنی زندگی کا مشن پورا کرنے کے قابل ہو سکیں۔ انھیں اس کا پہلا موقع تحریک خلافت کے دوران اور دوسرا اب نظر آیا۔

موجمدار مزید لکھتے ہیں کہ:

"1920ء سے اب تک وہ متواتر فتح مند ہوتے آئے تھے اور تمام مخالف قوتوں نے ان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، سوائے جناح کے جو ان کی راہ کی واحد رکاوٹ تھے۔ جناح اب ایک قلعہ بند حیثیت حاصل کر چکے تھے کیونکہ سرکارِ برطانیہ اور برطانوی حکام مضبوطی سے ان کی پشت پر کھڑے تھے۔ ایک مرتبہ یہ ہندوستان سے نکل جاتے تو گاندھی جی ایک لمحے میں جناح کو کچل کر رکھ دیتے اور پورا ہندوستان ان کے قدموں پر گر جاتا اور وہ ملک کے طول و عرض میں ہر شے کے مالک ہوتے۔ راج چکرورتی یا ہندوستان میں مقدس گاندھی سلطنت کے پوپ۔ اس طرح گاندھی ازم ہندوستان میں پوری طرح مستحکم ہو جائے گا۔ اور ہر شخص کو گاندھی جی کے فرامین کے اطاعت کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ان کے مبلغین پوری دنیا میں گاندھی ازم کے پیغام کی تبلیغ کریں گے جو پھر دنیا بھر میں گونجے گا۔ ان کے "ہندوستان چھوڑ دو" جوئے کا غالباً یہی مقصد تھا یہ وہ عظیم خیال تھا جس نے انھیں متحرک کیا اور اس وقت ان کے مزاج کو پاگل پن کے قریب پہنچا دیا۔ جب انھوں نے اپنی ہندوستان چھوڑ دو تحریک کا آغاز کیا۔ یہ ناممکن تھا کہ محض غیر ملکی تسلط کے خاتمے کی خواہش ان کے مزاج کو اس نہج تک پہنچاتی۔ بعد ازاں جب گاندھی جی نے کیبنٹ مشن کو سبوتاژ کیا اور ورکنگ کمیٹی کی اکثریت کی ہدایت کو مسترد کر دیا اس وقت بھی وہ اسی محرک کے زیر اثر تھے۔

اگر عین اس دن سے گاندھی جی کے لائحۂ عمل کی کڑی جانچ کی جائے جب وہ 1915ء میں سرزمین ہندوستان پر وارد ہوئے تھے تو علم ہوگا کہ اپنی گوناں گوں سرگرمیوں کے باوجود

انھوں نے اس امر کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا جسے وہ اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتے تھے۔۔۔یہی کہ ان کے پاس پوری دنیا کے لیے ایک پیغام ہے۔اس ضمن میں گاندھی جی کا وہ جواب دہرانے کے قابل ہے جو انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو دیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے 1921ء کی تحریک عدم تعاون میں گاندھی جی کی کچھ سرگرمیوں پر احتجاج کیا تھا جس پر گاندھی جی نے لکھا تھا۔

"میرے انکسار نے مجھے گھر کی چھت پر چڑھ کر یہ اعلان کرنے سے روک رکھا ہے کہ عدم تعاون اور عدم تشدد کا پیغام پوری دنیا کے لیے ایک پیغام ہے۔ اگر یہ اس مٹی میں ثمر آور نہ ہو جس میں پیدا ہوا ہے تو پھر یہ لازماً ناکام ہو جائے گا"۔

موجمدار گاندھی کے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی جی کی 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک مکمل طور پر ناکام ٹھہری اور ہندوستان کو گاندھی جی کے عالمی نجاتِ دہندہ بننے کی کوشش کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ سزا ہندوستان کی تقسیم تھی۔ اس لمحے سے جب کانگرس نے 1937ء میں وزارتیں قبول کی تھیں گاندھی جی ہی گانگرس کے سب سے بڑے رہنما اور مشیر تھے اور وہ کانگرس کی ہائی کمان کے ذریعے اپنی بالادستی اور طاقت کا اظہار کرتے رہے۔ اس عرصے کے دوران ہونے والی ہر غلطی کی حتمی ذمہ داری لازماً مشیر اعلیٰ ہی کو قبول کرنی چاہیے۔ گانگرس کے وزارتیں قبول کرنے کے وقت خصوصاً اعلان جنگ کے بعد اس کا ہر ہر اقدام غلط اور سمجھ بوجھ سے عاری تھا کیونکہ اس نے حقائق اور خاص طور پر صورتحال کو کبھی پیشِ نظر نہیں رکھا۔ جناح نے گانگرس کی غلطیوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور حکومتِ برطانیہ اور مسلم عوام دونوں کی نظر میں اپنی حیثیت کو مضبوط اور مستحکم کر لیا۔ جناح اور مسلم لیگ دونوں اب نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ رہے تھے۔"(32)

انھی دنوں کانجی کی جناح صاحب سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ ہندو مسلم مسئلے کے متعلق جناح صاحب کی طرف سے کی گئی کوششوں پر اپنے تحفظات اور جناح صاحب کے جواب کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

" 28اگست 1942ء کو جناح سے میری 90 منٹ تک ملاقات رہی۔ میں نے ان سے شکایت کی کہ بالفرض ان کے خیال کے مطابق گانگرس غلطی پر تھی پھر بھی ان کی ضد اور لڑنے کا انداز میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ جناح کو مجھ جیسے دوست ان سے گانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل کی توقع رکھتے تھے۔ اس کے جواب میں جناح نے الٹی شکایت کرتے

ہوئے کہا کہ گانگرس جب کبھی ان سے بات چیت کرنا چاہتی ہے تو گاندھی جی کے مشورے سے کسی غیر اہم شخصیت کو بھیجنے کا فیصلہ کرتی ہے۔جناح کا کہنا تھا کہ دراصل گانگرس کی ذہنیت ہی سراپا غلط تھی۔ وہ صورت حال کی حقیقتوں کو سمجھ نہیں رہی تھی، اس لیے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے مشترک فریق مقابل، یعنی برطانیہ کو ہندوستان پر اپنا اقتدار جمائے رکھنے کا موقع ملتا جارہا تھا۔جناح نے بڑی شدومد کے ساتھ کہا کہ حصول آزادی کی تمنا میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ملک میں برطانوی راج جاری رکھنے کی ذمہداری گانگرس پر ہے۔"

کانجی اس ملاقات کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"اس گفتگو کے دوران مجھے ایسا لگا کہ جناح مضمحل، رنجیدہ اور اپنے آپ کو بڑی حد تک تنہا محسوس کر رہے تھے۔مجھے ان کی صاف گوئی پسند آئی۔ میں نے اور سوالات کیے کیونکہ میں مجوزہ پاکستان کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ اس پر اس نے بڑی حسرت سے جواب دیا "مائی ڈیئر کانجی، میں گانگرس کی طرف سے ایک اشارہ چاہتا تھا۔ صرف ایک دوستانہ اشارہ! لیکن مجھے وہ بھی حاصل نہ ہوا۔اگر یہ اشارہ مل جاتا تو ہمارے مسائل کا حل ہو جاتا کوئی دشوار بات نہ تھی"(33)

1944ء میں کانجی کی جناح صاحب سے ایک اور ملاقات ہوتی ہے جس میں کانجی، ہندو لیڈرشپ، پریس اور پروپیگنڈے کے رویے سے نالاں جناح صاحب کے اندرونی کرب کو یوں بیان کرتے ہیں:

" 14 جنوری 1944ء جمعہ کا دن تھا۔ جناح سے میری پون گھنٹے تک بات چیت ہوئی۔ اس روز کی گفتگو سے میری وضاحت کیے بغیر وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔پھر میں نے ان سے وہ سوال کیا جو مطالبہ پاکستان کے معاملے میں بار بار کیا جاتا تھا۔ اگر پاکستان بن گیا تو دفاع یا بیرونی حملے کی صورت میں اس کی خارجہ پالیسی کیا ہو گی؟ اس مرتبہ بھی ان کا جواب وہی تھا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ پھر بڑے درد بھرے انداز میں جناح نے مجھ سے پوچھا "مائی ڈیئر کانجی! یہ تو بتاؤ آخر جناح کا قصور کیا ہے، جس کی سزا میں اس کے خلاف اتنا زہر اگلا جارہا ہے اور غلط بیانیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں؟ ہندو پریس کیوں میرا دشمن ہو گیا ہے؟ تمھارے ہندو دوست کیوں میری نیت پر حملے کر رہے ہیں؟ کیوں مجھے وہ غدار بتارہے ہیں؟ وہ میرے پچھلے کارناموں کا ریکارڈ کیوں فراموش کر رہے ہیں؟ وہ مجھے اتنا احمق کیوں سمجھ رہے ہیں کہ میں برطانوی حکومت کے ہاتھوں کھیل کر اس برصغیر کو

آزادی سے دور دھکیل رہا ہوں؟ میں نے کیا مانگا؟ میرے مطالبے میں کون سی غیر معقول بات ہے؟ میں نے پاکستان مانگا، لیکن یاد رکھو، میں تو پاکستان کا صرف اصول تسلیم کرانا چاہتا ہوں۔ کون سی برائی میں نے کی؟ کیا ہندو گانگرس اور ہندو اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر وہ اور ہم ایک دوسرے سے تعاون کریں تو اپنے مشترکہ دشمن کو اپنے ملک سے باہر نکال سکتے ہیں۔ اگر ایک بار باہمی تعاون کے اصول پر اتفاق کر کے ہم انگریزوں کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر دوسری تفصیلات بھی آپس میں طے کرتے۔

اس کے بعد جناح نے 1936ء کی اس بات چیت کا ذکر کیا جو بھولا بھائی دیسائی، ستیا مورتی اور گووند ولبھ پنت کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ سب مرکزی اسمبلی میں گانگرس پارٹی کے ارکان تھے۔ وہ سب کسی ایسے متفقہ سمجھوتے کے لیے کوشاں تھے، جو نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے حق میں منصفانہ ہو بلکہ جس کی وجہ سے آگے چل کر ان دو بڑے فرقوں میں مل کر کام کرنے کی صورت پیدا ہو سکے۔ بھولا بھائی، ستیا مورتی اور پنت نے یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے توثیق کے لیے پیش کیا لیکن گاندھی جی اور نہرو نے اس طرح کی باتیں سننے سے انکار کر دیا۔ پھر جناح نے مجھے بتایا کہ وہ کئی نامور ہندوؤں کی زبان سے سنتے رہے ہیں کہ گانگرس سراسر غلطی پر تھی لیکن سب کے سامنے یہی بات کھل کر کہنے کی ہمت ان میں نہ تھی۔ جناح نے کہا "اب بھی وقت نہیں گیا ہے جیل سے باہر بہت سے گانگرسی لیڈر موجود ہیں، جو اس معاملے کو آگے بڑھا کر مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، صرف ہمت کی ضرورت ہے، گاندھی جی کی تھوڑی سی مخالفت کرنے کی ہمت "(34)

ان دنوں گاندھی جی آغا خان کے ایک محل میں نظر بند تھے۔ ان کی صحت کی خرابی کی بنا پر حکومت نے انھیں مئی 1944ء میں رہا کر دیا۔ جیل سے رہا ہوتے ہی اس نے جناح صاحب کو درج ذیل خط لکھا:

"رہائی کے بعد سے لیکر اب تک میں نے آپ کو کوئی خط نہ لکھا، لیکن اب میرا دل کہتا ہے کہ میں آپ کو خط لکھوں۔ جب آپ کہیں ہم دونوں مل بیٹھیں۔ آپ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں کہ میں اسلام کا یا ہندوستان کے مسلمانوں کا دشمن ہوں۔ میں صرف آپ کا نہیں بلکہ ساری دنیا کا دوست اور خدمت گزار ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔"

جناح صاحب ان دنوں سری نگر میں قیام پذیر تھے وہیں سے اس نے گاندھی کو جوابی خط لکھا کہ "میں غالباً وسط اگست تک بمبئی واپس پہنچ جاؤں گا۔ امید ہے کہ اس وقت تک آپ روبہ صحت ہونگے اور بمبئی پہنچ جائیں گے۔ پھر آپ بڑی خوشی سے میرے مکان پر تشریف

لائیے۔باقی عند لملاقات۔ مجھے اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔امید ہے کہ بہت جلد آپ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔"

گاندھی جی، جناح مذاکرات پر مولانا آزاد اپنی کتاب میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ اس موقع پر مسٹر جناح کی طرف گاندھی جی کا بڑھنا ایک بہت بڑی سیاسی غلطی تھی، اس نے مسٹر جناح کو ایک نئی اہمیت عطا کر دی جس کا انھوں نے بعد میں بھرپور فائدہ اٹھایا، گاندھی جی نے جناح کی طرف شروع سے ہی ایک عجیب وغریب روّیہ اپنار کھا تھا، دوسری دہائی میں کانگرس سے علیحدگی کے بعد جناح اپنی سیاسی اہمیت خاصی حد تک کھو بیٹھے تھے، جناح نے بعد میں ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اپنی اہمیت پھر سے حاصل کر لی اس کی بہت بڑی وجہ گاندھی جی کے بعض اقدامات اور فروگذاشتیں تھیں۔ واقعتاً اس بات میں شک ہے کہ گاندھی جی کے روّیہ کے بغیر جناح کو کبھی بھی برتری حاصل ہو پاتی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے وسیع حلقے مسٹر جناح اور ان کی پالیسی کے متعلق شکوک رکھتے تھے، لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ گاندھی جی ان کے پیچھے مسلسل بھاگ رہے ہیں۔اور انھیں خوش کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو بہتوں کے دلوں میں جناح کے لیے ایک نئی عزت پیدا ہو گئی۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ گاندھی جی ہی تھے جنھوں نے مسٹر جناح کے لیے سب سے پہلے قائداعظم، یعنی بہت بڑے قائد کے خطاب کو رواج دیا۔ گاندھی جی کے کیمپ میں ایک بیوقوف لیکن نیک نفس خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا انھوں نے بعض اردو اخبارات میں جناح کا ذکر "قائداعظم" کے طور پر دیکھا تھا۔ جس وقت گاندھی جی ملاقات کے لیے جناح کے نام خط لکھ رہے تھے خاتون نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات جناح کو قائداعظم لکھتے ہیں، چنانچہ گاندھی جی کو بھی ان سے اسی طرح خطاب کرنا چاہیے اس اقدام کے مضمرات پر ایک لمحے کے لیے بھی غور کیے بغیر، گاندھی جی نے جناح سے قائداعظم کے طور پر خطاب کیا۔۔۔۔ یہ خط جلدی اخباروں میں چھپ گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جب دیکھا کہ گاندھی جی بھی جناح کو قائداعظم کہتے ہیں، تو انھوں نے سوچا کہ وہ سچ مچ کے قائداعظم ہیں۔۔۔جولائی 1944ء میں جب میں نے یہ رپورٹ پڑھی کہ گاندھی جی جناح سے خط وکتاب کر رہے تھے اور ان سے ملاقات کے لیے بمبئی جا رہے تھے، تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ فعل مسئلوں کو حل نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کے برخلاف

ہندوستانی سیاسی صورت حال کو کو دشوار تر بنادے گا۔۔۔ جناح نے اس صورت حال سے
پورا فائدہ اٹھایا اور خود اپنی پوزیشن بنالی، لیکن انھوں نے ایک بھی ایسی بات نہ تو کی نہ کہی جو
کسی بھی طرح ہندوستانی آزادی کے مقصد میں معاون ہو سکتی"(35)

گویا جناح سے قائد اعظم کا سفر مسلم عوام کے اپنے لیڈر پر اعتماد اور محبت کے بجائے گاندھی کے ایک خط کے ذریعے طے ہوا۔ آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہو تو انسان ایسے تجزیے کرکے ایسے ہی نتائج اخذ کرتا ہے۔ آزاد کی اس رائے پر منصور احمد (انڈین مسلم) تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مولانا آزاد کے اس سخت روّیے میں ایک نفسیاتی پہلو کار فرما ہے مولانا آزاد کانگرس کے ایک وفادار سپاہی اور متعدد ہندو لیڈروں کے بیچ میں ایک اہم مسلمان لیڈر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس انسانی کمزوری پر قدرت نہیں پا سکے کہ کانگرس سے اپنی وفاداری کو اجاگر کرنے کے لیے ایک دوسرے بڑے مسلم رہنما کو (جو بالخصوص کانگرس میں نہیں تھے) قوم پرستی سے عاری اور پست قد بتائیں۔

جناح اور مسلم لیگ کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کی مولانا آزاد کی جسارت کو بھی شاید اسی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے ایسے ہی موقع کے لیے تو شاید انگریزی کا مقولہ ہے۔

"The King's servant is more loyal than the king"(36)

چوہدری خلیق الزماں "شاہراہ پاکستان میں جناح صاحب کی طرف سے آزاد کو شو بوائے کہنے پر افسوس کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"ہاں یہ ضرور قابل افسوس ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس واقعہ سے بیس برس بعد اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں اپنی نامعقول تلخی کا اظہار کیا کہ گاندھی جی نے ان کو قائد اعظم کیوں لکھا۔ اگر گاندھی جی ان کو قائد اعظم نہ بھی لکھتے تو مسٹر جناح کا کچھ نہیں جاتا کیونکہ ہندوستان میں مسلمان ان کو 1943ء سے اسی نام سے یاد کرتے تھے اور آج تک وہ اس نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب میں ایسی لچر بات کہہ کر جناح صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا مگر خود اپنے کو نیچا کر دکھایا۔"(37)

جب گاندھی جناح مذاکرات کی خبر سامنے آئی تو اس وقت کانجی نے جناح صاحب کے نام ایک خط میں اُن کی وطن پرستی اور جذبہ حریت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"گاندھی جی اور آپ کی ملاقات کے موقع پر، ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو آزادی سے قریب لانے کے عظیم مشن کی کامیابی کے لیے آپ کی خدمت میں اپنی نیک تمنائیں پیش کرتا

ہوں۔ گزشتہ جنوری کی گفتگو مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے بھی کہا کہ جہاں تک آپ کا تعلق ہے کسی بھی باعزت سمجھوتے کی راہ میں آپ ہر گز رکاوٹ نہیں بنیں گے۔"

آگے لکھتے ہیں

"مجھے بھروسا ہے کہ مالویہ، شاستری اور بعض دوسرے لیڈروں کی مخالفت اور فری پریس جرنل کے حمایتی، گانگرسی سوشلسٹوں کے سخت احتجاج کے باوجود گاندھی جی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے اس کا بھی پورا امکان ہے کہ آپ انھیں اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔ جب میں آپ کے بارے میں لوگوں سے کہتا ہوں کہ وطن پرستی اور حریت پسندی کے جذبے میں آپ بڑے سے بڑے گانگرسی لیڈر کے بھی مقابلے میں کم نہیں ہیں تو میں کوئی نئی بات نہیں کہتا ہوں۔"(38)

گاندھی جناح مذاکرات 9 ستمبر کو جناح صاحب کی رہائش گاہ پر شروع ہوئیں۔ یہ ملاقاتیں اٹھارہ دن تک جاری رہیں۔ دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ہر ملاقات کے بعد وہ ایک دوسرے کو خط لکھیں جس میں اس دن کی زبانی گفتگو کی تصدیق کی جائے۔ 15 ستمبر کی شام گاندھی نے جناح صاحب کو لکھا:

"دوران گفتگو آپ نے بڑے جوش سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قوم ہیں اور ہندوستان میں دونوں کے وطن الگ الگ ہیں۔ آپ اپنی دلیلوں کی جتنی وضاحت کرتے ہیں آپ کا نصب العین مجھے اتنا ہی خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اگر آپ کے مفروضے صحیح ہوتے تو آپ کا نصب العین واقعی قابل قبول ہوتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کے مفروضے بالکل بے بنیاد ہیں۔ ہندوستان کے اکثر مسلمان ہندوؤں کی اولاد ہیں، ان کے آباؤ اجداد نے ہندو مت چھوڑ کر مذہب اسلام اختیار کیا تھا۔ تاریخ میں مجھے کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ نو مذہبیوں کے کسی گروہ نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی قوم سے الگ ایک قوم ہیں۔ اگر مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں ایک قوم بستی تھی تو آج بھی تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں، باوجود اس کے کہ ان میں سے بہتوں نے اپنا مذہب بدل دیا ہے۔

آپ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ اس بنا پر نہیں کرتے کہ انھوں نے ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اس لیے کہ ہندوستان کے بہت سے باشندوں نے اپنا پرانا مذہب چھوڑ کر اسلام

قبول کر لیا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کل اگر سارا ہندوستان مسلمان ہو جائے تو یہ دو قومیں پھر مل کر ایک قوم بن جائیں گی؟"

دو روز بعد جناح نے یہ جواب دیا:

"ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ لفظ قوم کی ہر معقول تعریف اور قومیت کے ہر صحیح معیار کی رو سے ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان دس کروڑ کی ایک مستقل قوم ہیں۔ ہم ایک مختص تہذیب و تمدن کے وارث ہیں۔ ہماری اپنی زبان ہے اور اپنا ادب۔ ہمارے فنون لطیفہ اور ہمارا فنِ تعمیر، ہمارے نام اور نظام تسمیہ دوسروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہماری اقدار، ہمارا ضابطہ اخلاق اور ہمارے قوانین، ہماری رسمیں اور نظام تقویم، ہماری تاریخ اور روایتیں، ہماری آرزوئیں اور صلاحیتیں، سب دوسروں سے الگ ہیں۔ اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ زندگی کے مسائل سے متعلق ہمارا نکتہ نظر اور انداز فکر دوسروں سے یکسر مختلف ہے۔ بین الاقوامی قانون کے ہر اصول کی رُو سے ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔"

24 ستمبر کو گاندھی نے جناح کو درج ذیل طویل خط لکھا:

"میں یہ تو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں دو یا دو سے زیادہ قومیں آباد ہیں، ہاں اتنا ماننے کو تیار ہوں کہ ہندوستانی قوم ایک خاندان ہے جو بہت سے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں سے وہ مسلمان جو ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں بستے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی ہندوستان سے الگ ہو کر رہیں۔ یہ علاقے بلوچستان، سندھ اور سرحدی صوبے پر اور پنجاب، بنگال اور آسام کے ان حصوں پر مشتمل ہیں جہاں مسلمان دوسرے تمام فرقوں کی نسبت تعداد میں زیادہ ہیں۔"

جناح نے اس شرط کا جواب یہ دیا:

"اگر آپ کی بات مان لی جائے تو ان صوبوں کی موجودہ سرحدیں بری طرح مسخ ہو جائیں گی اور وہ بالکل نکمے ہو کر مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے۔"

مہاتما کی دوسری شرط یہ تھی:

"ان علاقوں کی نشاندہی ایک ایسے کمشن کے سپرد کی جائے جو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کو قبول ہو۔ پھر ان علاقوں کے باشندوں کی رائے لی جائے (کہ وہ ہندوستان سے الگ ہونا

چاہتے ہیں یا نہیں)۔ یہ استصواب عام رائے شماری کے ذریعے ہو سکتا ہے جس میں تمام بالغ شہریوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو یا اسی قسم کے کسی اور طریقے سے۔"

جناح نے اس پر یہ اعتراض کیا:

"صوبائی سرحدوں کو مسخ کرنے کے بعد جو علاقے (مسلمانوں کے لیے) رہ جائیں گے ان میں بھی حق خود ارادیت صرف مسلمانوں کو نہ ملے بلکہ ان علاقوں کے تمام باشندے مل کر ان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کریں گے"

گاندھی کی تیسری شرط یہ تھی:

"اگر ان علاقوں کے باشندے علیحدگی کے حق میں رائے دیں تو (کانگرس اور لیگ میں) یہ معاہدہ ہو جائے کہ وہاں ایک آزاد مملکت قائم کر دی جائے گی۔ لیکن اس معاہدے پر عمل اس وقت ہو سکے گا جب ہندوستان غیر ملکی حکومت سے آزاد ہو۔"(39)

جناح، گاندھی مذاکرات اس تیسرے نکتے پر ناکام ہو گئے۔ گاندھی چاہتے تھے پہلے دونوں فریق مل کر برطانویوں کو یہاں سے نکال دیں جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو پھر باہمی سمجھوتے کے تحت دو علیحدہ ریاستیں قائم کی جائیں گی لیکن جناح صاحب گاندھی کے الفاظ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے انھیں یقین نہیں تھا کہ انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد ہندو لیڈر شپ انھیں بخوشی پاکستان دے دیں گے اس لیے جناح صاحب چاہتے تھے کہ علیحدگی ہر حال میں پہلے ہونی چاہیئے اور بعد میں مشترکہ مفادات کے امور ایک معاہدے کے ذریعے کیے جائیں گے۔

یہ بات تسلسل سے گاندھی اور ہندو لیڈر شپ کی طرف سے نظر آتی ہے جس میں وہ جناح صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کرتے نظر آئے کہ پہلے انگریز یہاں سے رخصت ہوں اس کے بعد ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ ڈھونڈا جائے، جس پر جناح صاحب، ہندو لیڈر شپ کے ماضی کے روّیے کو دیکھتے ہوئے کبھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔(40)

ہیکٹر بولتھو کے مطابق مذاکرات کی ناکامی کے بعد جناح صاحب نے لندن کے اخبار 'نیوز کرانیکل' کے ایک نمائندے سے درج ذیل گفتگو کی:

"گاندھی نے مصالحت کے لیے اس قسم کی شرائط پیش کر کے ہماری فراست کی توہین کی۔ ہندو مسلم اختلافات کو طے کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ موجودہ ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے جو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہوں اور

پاکستان میں سرحدی صوبہ، بلوچستان، پنجاب، بنگال اور آسام اپنی موجودہ شکل میں شامل ہوں۔ پھر ہندوستان میں ہندو اور پاکستان میں مسلمان اپنی اقلیتوں کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں۔ ڈھائی کروڑ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے ہم ہندوؤں پر بھروسا کرنے کو تیار ہیں اور انھیں چاہیئے کہ وہ بھی ہم پر بھروسا کریں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہندو ایسا سمجھوتہ چاہتے ہیں جس کی رُو سے مسلمان اکثریت کے علاقے ان کے قابو میں رہیں۔ ہماری مکمل آزادی انھیں کسی صورت منظور نہیں" (41)

مذاکرات کی ناکامی پر کانجی دوارکاداس جناح صاحب سے ملتے ہیں اور ان کا ردِ عمل جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں اس ناکامی پر جناح کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 17 اکتوبر 1944ء کو ان سے ملاقات کی اور اپنی عادت کے مطابق اس دن کی گفتگو گھر آکر نوٹ کر لی۔ میں نے جناح سے دریافت کیا کہ آئندہ وہ کونسا قدم اٹھائیں گے؟ برطانوی حکومت کے مقابلے میں ان کا روّیہ کیا ہو گا؟ جناح جب بولنے لگے تو میں نے ان میں ایک نئی چیز پائی۔ وہ باتیں کرتے کرتے نچلے ہونٹ کو دباتے رہے، ان کے ہونٹوں میں ارتعاش تھا۔ یہ علامتیں تھیں ان کی اعصابی بے چینی اور احساسِ تنہائی کی۔ میں ان سے ڈھائی فیٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا پھر بھی ان کی آواز سننے اور سمجھنے کے لیے کانوں کو معمول سے زیادہ متوجہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ اتنا آہستہ بول رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ ہی سے بول رہے ہوں۔ بولتے وقت وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ بلکہ ان کی کھوئی کھوئی سی آنکھیں کہیں دور ٹکٹکی لگائے تھیں۔ بات چیت کی ناکامی سے جناح کو جو رنج پہنچا تھا اس کے تکدر اور تکلیف کے آثار ان کے چہرے سے عیاں تھے۔"

جناح بہت ہلکی اور نحیف آواز میں بولے "گاندھی کیوں آئے تھے؟ جب وہ مجھے دینے کے لیے کچھ ساتھ نہیں لائے تھے، تو پھر میرے پاس کیوں آئے؟

ان کی آواز سے ایسا لگتا تھا جیسے یہ سوال اپنے آپ سے پوچھ رہے ہوں۔ انھوں نے یہ سوال کوئی دس بار سے کم نہیں دہرایا۔

"میں نے ان سے پوچھا کیا آپ کے خیال میں گاندھی جی کوئی شاطرانہ چال چلنا چاہتے تھے؟ کیا آپ کو وہ ایسی پوزیشن میں ڈال دینا چاہتے تھے کہ جہاں رائے عامہ آپ کے خلاف ہو جاتی؟

جناح نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا" نہیں، نہیں ہر گز نہیں۔ میں یہ بات ہر گز نہیں کہہ سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے بڑی صاف صاف بات کی۔ اس بارے میں مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں"

کانجی اس دن کی ملاقات کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"میں نے جناح سے پوچھا "اب کیا ہو گا؟ جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے اپنے خیال کا اظہار کر دیا کہ برطانوی حکومت، بات چیت کی ناکامی سے پورا پورا فائدہ اٹھائے گی، اس پر خوش ہو گی، بیرونی ممالک میں ہندوستان کے بارے غلط فہمیاں پھیلائی گی اور اس طرح استبدادی حکومت جمائے رکھے گی۔"

جناح نے جواب دیا" میں تم سے اتفاق کرتا ہوں، لیکن تم مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ چونکہ برطانوی حکومت صورتحال سے فائدہ اٹھانے والی ہے اس لیے میں خود کشی کر لوں؟ یاد رکھو میں خود کشی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے جان دینا زیادہ پسند کرتا ہوں"(42)

ہندو مسلم تضاد کے متعلق بیورلے نکولس اور ڈاکٹر امبیڈکر کی رائے

برطانوی صحافی بیورلے نکولس اپنی کتاب میں ہندو مسلم تضاد کے متعلق اعداد و شمار کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے خدشات درست اور ان کا مطالبہ پاکستان برحق ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے کہیں "یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ دنیا کی دوسری قوموں نے بھی اپنے اختلافات دور کیے ہیں تو ہندوستانی قوم میں ایسی کیا بات ہے جو وہ ان اختلافات کا حل تلاش نہ کر سکے۔"

اس سوال کا جواب صحت کے ساتھ دینے کے لیے ہمیں قوم کی تعریف کرنی ہو گی۔ رینن نے قومیت کے بارے میں اپنے مشہور مضمون میں قوم کی اس قدر عمدہ تعریف کی ہے کہ ہم بھی اس کی اس سے بہتر تعریف تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے:

"قوم کس چیز سے بنتی ہے" رینن کہتے ہیں۔

"قوم ایک جیتی جاگتی روح ہے۔ ایک روحانی اصول ہے اور یہ روح دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ماضی اور حال۔ ماضی میں ہماری مشترکہ یادوں کا ورثہ شامل ہوتا ہے اور دوسرے حصے میں ایک ساتھ رہنے کی خواہش اور اس کا برملا اظہار شامل ہوتا ہے۔ اپنی غیر

منقسم وراثت کو قائم رکھنے کی خواہش شامل ہوتی ہے۔ماضی میں مشترک عظیم کارناموں کا
حامل ہونا اور حال میں ایک مشترکہ عزم کا مالک ہونا۔ماضی میں عظیم کام اکٹھے کرنے کی
یادیں اور حال میں ایسا ہی کرنے کی خواہش، یہ ہیں وہ بنیادی شرائط جن سے کوئی قوم تشکیل
پاتی ہے"

ہندوستان کیا اس امتحان پر پورا اترتا ہے۔سب سے پہلے ہم رینن کی پہلی شرط۔۔۔۔یادوں کے ایک ورثے کی مشترکہ ملکیت کو لیتے ہیں۔ مسلمان کیا یاد کرتے ہیں۔وہ یہ یاد کرتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل وہ آٹھ سو برس تک سارے ملک کے مالک بنے رہے اور ہندوؤں کو اپنی ذہنی اور جسمانی طاقت سے مطیع رکھا اور ہندو اس غلامی کی ناگوار تفصیلات کو فراموش نہیں کر سکے۔

اپنے کتابچے، "دی ہندو نیشنل موومنٹ" میں بھائی پرمانند لکھتے ہیں:

"ہندو اپنی تاریخ میں پرتھوی راج، پرتاب، شیوا جی اور بیراجی بیر جیسے لوگوں کی یاد مناتے ہیں، جو اپنے ملک کے وقار اور آزادی کے لیے مسلمانوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے، جبکہ مسلمان محمد بن قاسم اور اورنگ زیب جیسے بادشاہوں کو اپنا قومی ہیرو مانتے ہیں۔

ہاں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے پاس یادوں کا ورثہ موجود ہے۔۔۔لیکن یہ یادیں نفرت و حقارت کی یادیں ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ نفرت کی یہ یادیں صرف ماضی کا حصہ نہیں بلکہ آج بھی ان کے درمیان نفرت موجود ہے"۔

آگے وہ 1935ء کے الیکشن کے بعد بننے والی کانگرسی وزارتوں اور ہندو لیڈرشپ کے مسلمانوں سے متعلق مجموعی روّیے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "واقعات کچھ اس طرح ہیں۔1935ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں آزادانہ انتخاب کے ذریعے سیلف گورنمنٹ کے ادارے قائم کرنے کی تجویز تھی۔ یہاں ہم واقعات کو اس ایکٹ کی تفصیلات بیان کرکے الجھانا نہیں چاہتے۔صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ اقدام، اگرچہ اس میں چند ضروری حفاظتی انتظامات کی گنجائش رکھی گئی تھی، ترقی کی جانب ایک اہم قدم تھا۔اگست 1935ء کو اس ایکٹ کی شاہی منظوری دی گئی اور 37-1936ء کی سردیوں میں نئی اسمبلیاں منتخب کی گئیں۔گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگرس نے قطعی اکثریت حاصل کرتے ہی اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔

اس نے مسلمانوں کو عہدوں کا حصہ دینے، اور کسی طرح کی مخلوط حکومت قائم کرنے سے انکار کر دیا۔اس نے اپنی یہ مطلق العنانی سیاسی امور تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ مسلمانوں کی مادی، اور روحانی زندگی کی ہر شاخ پر

حملے کرنے شروع کر دیے۔

فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کی جگہ سنسکرت رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کے حق میں بڑے پیمانے پر مہم شروع کر دی گئی۔ سکولوں پر اس ظالمانہ انداز سے قبضہ کیا گیا کہ اسے اگر نازی بھی دیکھ لیتے تو عش عش کر اٹھتے۔ مسلمان بچوں کو اٹھ کر گاندھی کی تصویر کو سلام کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ کانگرس کے جھنڈے کو اس طرح عزت دی جاتی جیسے کہ وہ سارے ملک کا جھنڈا ہو۔"

یہ تھارینن کی پہلی شرط یادوں کے مشترکہ ورثے، لوگوں کے محبت کے رشتے میں منسلک ہونے، اور اس پر فخر کرنے "کا انجام۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان کسی ایسے ورثے کے امین ہونے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔

اور اب رینن کی دوسری شرط کی باری ہے "اکٹھا رہنے اور اکٹھے عظیم کارنامے انجام دینے کی خواہش" اس سوال کا جواب تو بڑی حد تک ان واقعات سے بھی مل سکتا ہے جن کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے، لیکن ان جوابات میں زور پیدا کرنے کے لیے ہم تھوڑی دیر تک رک کر مزید واقعات کا جائزہ لیتے ہیں ہندو اور مسلمان کے ساتھ اکٹھے رہنے کی خواہش بالکل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح فرانسیسی باشندے، جرمنوں کے ساتھ رہنے کی، یا امریکی لوگ جاپانیوں کے ساتھ۔"(43)

ڈاکٹر امبیڈکر "تھاٹس آن پاکستان" میں لکھتے ہیں کہ:

"It is likea race in armaments between two hostile nations. If the Hindus have the Benares University, the Musalmans must have the Aligarh University. If the Hindus have the R. S. S.°, theMuslims must reply by organizing the Khaksars. This race in social armament and equipment is run with the determination and apprehension characteristic of nations which are on the war path. The Muslims fear that the Hindus are subjugating them. The Hindus feel that the Muslims are engaged in reconquering them. Both appear to be preparing for war and each is watching the "preparations" of the other."

یہ صورت حال ایسی ہی ہے جیسے دو متحارب ممالک کے درمیان اسلحہ کی دوڑ۔ اگر ہندوؤں کی بنارس یونیورسٹی ہے تو مسلمانوں کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنا لازمی ہے۔ جو نھی

ہندو ایک تحریک شروع کرتے ہیں مسلمان کوئی دوسری تحریک شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہندوؤں کی آر ایس ایس ہے تو مسلمانوں نے خاکسار تحریک منظم کر کے اس کا جواب دے دیا ہے۔ سماجی ہتھیاروں اور سازو سامان کی دوڑ اسی طرح عوام کے ساتھ جاری ہے، جس کا مظاہرہ دو ملک جو جنگی تیاریوں میں مصروف ہوں، اسلحہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ہندو انھیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں اور ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوبارہ ان پر غالب آنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دونوں جنگ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔" (44)

ڈاکٹر امبیڈکر بمبئی شہر کے حوالے سے اپنی کتاب میں کچھ اعدادوشمار بھی بیان کرتا ہے جو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے مقابلے زیادہ پڑھا لکھا، پرامن اور مہذب ہے اور جن کا حوالہ بیورلے نکولس اپنی کتاب میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندو مسلم تضاد کا اس پڑھے لکھے اور پرامن شہر میں یہ حال ہے تو باقیوں بارے بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں کس قسم کے حالات ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے مطابق 1929ء میں یہاں دو فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ پہلے میں 149 افراد ہلاک اور 739 شدید زخمی ہوئے۔ یہ فسادات 36 دن تک جاری رہے۔ دوسرے میں 35 افراد ہلاک اور 109 زخمی ہوئے۔ یہ فساد 22 دن تک جاری رہے۔

1930ء اور 1932ء میں بھی دو فسادات ہوئے۔ ان میں بھی ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تقریباً اتنی ہی تھی۔ ہمارے پاس صرف 1932ء میں ہونے والے دوسرے فساد کے اعداد وشمار ہیں۔ یہ فساد 49 روز تک جاری رہا، 217 افراد ہلاک ہوئے اور 2713 لوگ شدید زخمی ہوئے۔

1933- 1934ء اور 1935ء میں بھی فسادات ہوئے لیکن ان میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ 1936ء میں جو بڑا فساد ہوا، وہ 65 دن تک جاری رہا۔ اس میں 94 افراد ہلاک اور 632 زخمی ہوئے۔ 1937ء نسبتاً خاموش سال تھا، اس سال کے بڑے فساد میں صرف 11 لوگ ہلاک اور 85 زخمی ہوئے اور یہ صرف تین ہفتے میں ختم ہو گیا۔ لیکن 1938ء میں ایک ہی فساد میں جو صرف ڈھائی گھنٹے جاری رہا، 12 افراد ہلاک اور 100 شدید زخمی ہو گئے۔

ان فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے بیورلے نکولس لکھتے ہیں کہ یہ ہے ان (ہندو مسلم) کی اکٹھا رہنے کی خواہش۔ بیورلے نکولس کے مطابق قدامت پسند ہندو کھل کر اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں مسلمانوں کو الگ لیکن وہ اس کے عملی اظہار کی اجازت مسلمانوں کو دینے کے لیے اس لیے تیار نہیں کہ وہ پاکستان کے

شدید مخالف ہیں۔

وہ لکھتے ہیں:

"حال ہی میں مسٹر وی دی ساور کرنے اپنے صدارتی خطاب میں یہ بات کہہ کر بہت داد وصول کی تھی:

"ہم ہندو، بذات خود ہندوستان میں آباد ایک مستقل قوم ہیں۔ ہمارا آبائی وطن ایک ہے، ہم میں علاقائی اتحاد ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو۔ ہمارے تمام مقدس مقامات ہمارے آبائی وطن میں ہی ہیں۔ اس طرح وطن کے ساتھ ہماری محبت دوگنی ہو گئی ہے۔ ہمارے درمیان بہت سے مشترک رشتے ہیں، ثقافتی، مذہبی، تاریخی، لسانیاتی اور نسلی، صدیوں کے ساتھ نے ہمیں ایک قوم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ہندو قوم کسی سمجھوتے کے تحت وجود میں نہیں آئی، بلکہ اسی علاقے کی پیداوار ہے۔"

(ہندو مہاسبھا کے کلکتہ سیشن میں تقریر جو دسمبر 1939ء میں منعقد ہوا تھا۔)

اس تصویر میں جو کچھ یک طرفہ دکھائی دیتی ہے، مسلمان کہاں فٹ ہوتے ہیں؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ وہ فٹ نہیں ہوتے۔

چلیں یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ ایک ذمہ دار ہندو رہنما سے یہ اعتراف کرانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ساور کر ایک علیحدہ قوم ہونے کے سلسلے میں مسلمانوں کا دعویٰ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن انھیں اس کے عملی اظہار کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اور ان کی جماعت پاکستان کے شدید مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ مسلمان بھی ہماری طرح ایک قوم ہیں، لیکن ہم انھیں رہنے کے لیے کوئی علیحدہ جگہ دینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔

نکولس آگے لکھتے ہیں:

ہم آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

مسلمان نہایت جوش و خروش کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک علیحدہ اور خود مختار قوم ہیں اور ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے ہندو۔۔۔۔۔ یا ان کی بھاری اکثریت۔۔۔ بھی اسی قدر جوش و خروش سے، علیحدہ اور خود مختار قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ وہ بھی درست ہے لیکن جب مسلمان اپنی خواہشات کو منطقی شکل دینا چاہتے ہیں اور اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندو اس کے خلاف احتجاج کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، گانگرسی

پریس کا توپ خانہ پوری طاقت سے پھٹ پڑتا ہے، ساری دنیا میں ہندو نوجوان، جنھیں پیسے دے کر باہر بھیجا جاتا ہے، اس کے خلاف بیان دینے لگتے ہیں اور گاندھی برت رکھ کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔ آخر اس سارے عمل کا مطلب کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب مخصوص مفادات ہیں۔۔۔۔"

ان مخصوص مفادات پر بیورلے نکولس اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"وہ شخص اس سچ کی حقیقت کو تسلیم کرے گا، جس کو اس بات کا ذرا سا بھی علم ہے کہ بڑے بڑے کاروباری حضرات نے کانگرس پر کس طرح قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ ہندو سرمایہ دار اپنے گھر میں ہر چیز کا مالک بننا چاہتا ہے اور ان کی قدرتی خواہش ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں عوام خصوصاً مسلمان کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر دیا جائے۔ وہ اپنے اقتصادی کنٹرول کو برقرار رکھنے، اور اسے ان علاقوں تک پھیلانے کے لیے، جو قیام پاکستان کی صورت میں اس کے حلقہ اثر سے باہر ہو جائیں گے، لڑے گا اور قیامت تک لڑتا رہے گا۔ ان علاقوں میں بہت دولت ہے اور مزید دولت دریافت ہو رہی ہے۔ بنگال صنعت کاری کے لیے سنہری موقع فراہم کرتا ہے، اور مغربی صوبوں کی زرعی پیداوار کے لیے بہت اچھی منڈی ثابت ہو گا۔ اس کے علاوہ مغربی صوبوں میں بہت سے وسائل ایسے ہیں، جن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ وہاں دھاتیں ہیں، معدنیات ہیں، جنگلات ہیں اور ہندوستان کی بہترین زرعی زمین ہے، خاص کر پنجاب میں۔"

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"ہاں ہندو سرمایہ دار اپنے مخصوص مفادات کے لیے آخری وقت تک جدوجہد کرتے رہیں گے۔ وہ مادر طن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے خلاف احتجاج کریں گے اور اس کے لیے سفارت کاری اور پروپیگنڈہ کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ اس احتجاج کی آواز دنیا بھر میں گونجے۔ وہ اس مقصد کے لیے آہ و زاری کریں گے، گریہ و فریاد کریں گے، رشوت دیں گے اور ڈرانے دھمکانے سے بھی گریز نہیں کریں گے اور اس مقصد کے لیے ان کے پاس ایسے لوگ ہونگے جن کا کردار شک وشبہ سے بالاتر ہو گا لیکن جو ہندو قوم پرستی کے نشے میں اتنے دھت ہونگے کہ انھیں واقعات اپنے صحیح رنگ میں نظر ہی نہیں آئیں گے۔ ایسی ہی ایک شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے، جنھوں نے ایک ایسے وقت میں جب ہندوستان کی گلی گلی میں خون بہہ رہا تھا اور سارا ملک ایک نہایت بڑی اور خوفناک خانہ جنگی کے دھانے

پر کھڑا تھا، نہایت آرام سے امریکہ کو تار بھیجا تھا کہ "چند مٹھی بھر لوگوں کے سوا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا کوئی نسلی، ثقافتی یا لسانی اختلاف نہیں ہے"
(ملاحظہ ہو نیویارک ٹائمز میگزین مورخہ 19-جولائی 1942ء)

اس حیران کن بیان پر جتنے بھی استعجابیہ نشان لگائے جائیں کم ہیں، اور نہ ہی اس کے بعد آنے والے اس تعجب خیز بیان پر جس میں انھوں نے واقعات کو نہایت کم کر کے بیان کیا ہے۔ "اب چند مسلمانوں کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مطالبہ صرف چار سال پرانا ہے اور بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں"

ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کے لیے "کچھ" کے لفظ کا استعمال آپ کو عجیب نہیں لگا۔ اور "بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں" کے الفاظ ایک عظیم قوم کے زندگی اور موت کے بڑھتے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرنے کا نرالا طریقہ نہیں ہیں۔

خیر، آپ کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں خوابوں کی اس ریاست کا خاکہ سامنے آئے گا، اور دنیا کی نگاہوں میں اس کی شکل واضح ہو گی، اس وقت کے واقعات کا آپ کو پہلے سے علم ہو گیا ہے۔ پاکستان پر ہر طرح سے حملے کیے جائیں گے، اس کے بارے میں جھوٹی افواہیں پھیلائی جائیں گی اور اس کے بارے میں اس قدر غلط بیانات دیے جائیں گے کہ اس کی مثال ملنی محال ہے لیکن تمام باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ اس امتحان میں پورا اترے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ریاست وجود میں آئے گی۔"(45)

جناح صاحب کا بیورلے نکولس کو دیا گیا انٹرویو

بیورلے نکولس نے جناح صاحب کا ایک انٹرویو بھی کیا جو ان کی کتاب کے باب "ایک عظیم شخصیت سے ملاقات" میں شامل ہے۔ یہ انٹرویو 1943ء میں ہوا۔ جناح صاحب کی اس وقت کی سوچ سے آگاہی کے لیے آیئے دیکھتے ہیں جناح صاحب اس انٹرویو میں کیا کہتے ہیں:

"میری ان سے پہلی ملاقات 18 دسمبر 1943ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ میرے لیے آدھا گھنٹہ نکال سکتے ہیں۔ لیکن یہ ملاقات تین گھنٹے تک جاری رہی۔

مصنف: میرے پہلے سوال کا تعلق اقتصادیات سے ہے۔ پاکستان میں مسلمان امیر تر ہو جائیں گے یا غریب تر؟ اور کیا آپ باقی ہندوستان کے خلاف ٹیرف کی پابندیاں عائد کریں گے؟

جناح: اس کے جواب میں، میں بھی تم سے ایک سول پوچھنا چاہوں گا۔ کیا تم جرمنی کے ماتحت ایک امیر انگلینڈ کو پسند کرو گے یا ایک غریب لیکن آزاد انگلینڈ کو۔

مصنف: اس سوال کا جواب تو ظاہر ہے، مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔

جناح: بالکل ٹھیک۔ لیکن کیا اس کے بعد تمھارا سوال قدرے دقیانوسی نہیں لگ رہا۔ یہ عظیم آیئڈیل، ذاتی آرام یا عارضی آسائشوں کے سوال سے بدرجہ بلند تر ہے۔ مسلمان لوگ ایک سخت جان، پتلی دبلی اور جفاکش قوم کے افراد ہیں۔ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ زیادہ سخت جان ہو جائیں تو انھیں اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ لازمی طور پر ایسا ہی ہو گا۔ اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ قومیت کا تحفہ، اقتصادی مشکلات کا باعث بنے۔ اس میں شک وشبہ نہیں کہ مسلمان قوم صنعتی اعتبار سے بہت پیچھے ہے اور وہ فوری طور پر خود کفیل بھی نہیں ہو گی۔ لیکن دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ان کی اقتصادی حالت، ان حالات سے بدتر نہیں ہو سکتی، جس میں اس کے افراد بکھرے بکھرے اور غیر منظم ہوں گے، جہاں وہ 25 کروڑ ہندوؤں کے غلام ہونگے، جو ان کا استحصال کرنے پر مصر ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ورسیلز کے معاہدے کے بعد، یورپ کے کسی ملک کا باشندہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کیسے کر سکتا ہے کہ پاکستان اقتصادی طور پر ایک ناکام ملک ثابت ہو گا۔ جن عظیم دماغوں نے یورپ کو مغربی اور متحارب سرحدوں میں تقسیم کر کے، اسے پیوند کاری کے ایک مضحکہ خیز نمونے میں تبدیل کر دیا تھا، ہمیں اقتصادیات کا درس دینے کے اہل نہیں ہو سکتے، خاص کر اس صورت میں جبکہ ہمارا مسئلہ، ان کی نسبت بہت سادہ ہے۔

انٹرویو کے سوال وجواب کے دوران جناح کہتے ہیں:

"اور اس پر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس ایک چیز ہے جو میں تمھیں دکھانا چاہوں گا۔"

مصنف لکھتا ہے "مسٹر جناح مجھ سے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور انتظار کرنے لگا اور مجھے یک دم احساس ہوا کہ ایک بات ہو رہی ہے۔ بلکہ نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے غصہ نہیں آرہا تھا۔ جناح نے تقریباً تقریباً، وحشیانہ الفاظ میں برطانوی پالیسیوں پر تنقید کی تھی۔ (میں نے اس مکالمے میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے)

لیکن ان کی تنقید نہایت واضح اور تخلیقی تھی۔ ہندوؤں کی تنقید کی طرح گرما گرم الفاظ کا مجموعہ یا نفرتوں اور غلط

باتوں کا معجون مرکب نہیں تھی۔ ان کی تنقید کسی مرض کی تشخیص کی مانند تھی۔ جناح اور ایک مثالی ہندو سیاستدان کے درمیان اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ ایک سرجن اور جن نکالنے والے ایک عامل کے درمیان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناح ایک ایسے سرجن ہیں جس پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں، خواہ اس کا فیصلہ کتنا ہی سنگ دلانہ ہو۔"

کچھ دیر بعد مسٹر جناح کمرے میں ایک کتاب لے کر داخل ہوئے:

جناح: تمھیں یاد ہوگا کہ ایک منٹ پہلے میں نے کہا تھا کہ انگریزوں کو بہت زیادہ غور و فکر کرنا پڑے گا۔ لیکن، انگریز اس عادت کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پاتے۔ وہ آرام کرنے اور اس انتظار میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہر چیز، آخر میں، خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے باوجود جب وہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں، تو ان کی فکر اتنی ہی واضح اور تخلیقی ہوتی ہے جتنی دنیا میں کسی شخص کی ہو سکتی ہے۔ ان کے عظیم مفکروں میں۔۔۔۔۔۔ کم از کم ہندوستان کے مسئلے کے بارے میں جان برائٹ بھی شامل ہیں۔ تم نے ان کی تقریروں کا مجموعہ پڑھا ہے؟

مصنف: کم سے کم سکول سے نکلنے کے بعد تو نہیں پڑھا

جناح: اچھا تو اسے پڑھو۔ یہ پچھلے دنوں مجھے اتفاق سے مل گئی تھی۔ انھوں نے کتاب میرے ہاتھ میں دی۔ یہ کتاب "دی سپیچز آف جان برائٹ" کا ایک بوسیدہ اور پرانا نسخہ تھا، اور جس جگہ سے کتاب کھول کر مجھے دی گئی تھی وہاں دنیا کے اس عظیم ترین مقرر کی یہ تقریر درج تھی جو انہوں نے دارالعوام میں 4 جون 1858ء کو کی تھی۔

"برطانیہ، ہندوستان پر کب تک راج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکتا لیکن یہ مدت خواہ کتنی بھی ہو پچاس سال، سو سال یا پانچ سو سال، سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص، جس کے ذہن میں شعور کی ہلکی سی رمق بھی ہو، اس بات پر یقین کر سکتا ہے، کہ اتنے بڑے ملک کو۔۔۔۔۔ جس میں 20 قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں، اور 20 مختلف زبان بولتے ہوں، کبھی بھی یک جا کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کو ایک منظم، مضبوط اور پائیدار اسلطنت کی شکل دی جا سکتی ہے؟ مجھے تو یقین ہے کہ ایسا ہونا قطعاً ناممکن ہے"

میں نے کتاب انھیں واپس کر دی۔

جناح: جو بات برائٹ نے اُس وقت کہی تھی، وہ آج سچ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ بات آج پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سچ ہو گئی ہے، اگرچہ آج کل ہمارا زور

20 قوموں پر نہیں بلکہ صرف دو قوموں پر ہے۔ہندو اور مسلمان۔اور یہ بات پہلے سے زیادہ سچ کیوں ہو گئی ہے۔وقت نے ہمیں قریب تر کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ آج کا مسلمان بیدار ہو چکا ہے۔اس نے تلخ تجربات سے یہ جان لیا ہے کہ "متحدہ ہندوستان" میں ہندو، مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھیں گے۔ایک "متحد ہندوستان" کا مطلب ایک ایسا ہندوستان ہے جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو۔اس کے معنی صرف یہی ہیں۔اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہے۔اس کو کوئی اور معنی پہنانے کی کوشش قطعاً لایعنی ہے۔ "ہندوستان" برطانیہ کی ایجاد ہے۔یہ ایک انتظامی یونٹ ہے جس پر بیوروکریسی تلوار کے زور پر راج کر رہی ہے۔یہ ایک کاغذی تخلیق ہے، جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مصنف: اس سلسلے میں ستم ظریفانہ بات یہ ہے کہ آپ کے ناقد کہتے ہیں کہ پاکستان خود بھی برطانیہ کی تخلیق ہے۔۔۔وہ پاکستان کو "تقسیم کرو اور راج کرو" کا اصول منطبق کرنے میں برطانیہ کی ذہانت کی مثال قرار دیتے ہیں۔

جناح: (قدرے گرمی سے) جس شخص نے یہ بات کہی ہے، اس نے میری دیانت داری پر شک کرنے کے علاوہ برطانوی ذہانت کی بھی توہین کی ہے۔اگر کوئی چیز برطانیہ کو ہندوستان میں رکھتی ہے تو وہ "متحدہ ہندوستان" کا وہ غلط تصور ہے جس کا پرچار گاندھی کرتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ متحدہ ہندوستان، ایک برطانوی تخلیق ہے، یہ ایک خیالی وجود ہے۔۔۔۔ایسا خطرناک خیالی وجود جو کبھی ختم نہ ہونے والے جنگ و جدل کا باعث بن سکتا ہے۔جب تک یہ جنگ جاری رہے گی انگریزوں کے پاس ہندوستان میں رہنے کا ایک بہانہ موجود رہے گا۔یہاں تقسیم کرو اور راج کرو کے اصول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

مصنف: اور آپ کی خواہش ہے "تقسیم کرو اور چلے جاؤ"

جناح: آپ نے یہ بات، بہت خوبصورت الفاظ میں پیش کی ہے۔

مصنف: کیا آپ کو احساس ہے کہ یہ بات برطانوی ووٹروں کو چونکا دے گی؟

جناح: سچ اکثر چونکا دینے والا ہی ہوتا ہے۔پھر اس سچ کی تخصیص کیوں؟

مصنف: کیونکہ ایک اوسط، شائستہ اور آزاد خیال ووٹر، چاہتا ہے کہ برطانیہ اپنے وعدوں کو نبھائے ۔اور ہندوستان کو آزادی دے، لیکن اسے اس سلسلے میں صرف کانگرس کا نکتہ نظر معلوم ہے۔مغرب میں مسلمانوں کی ترجمانی کرنے والا کوئی شخص ہے ہی نہیں۔

جناح: (تلخی سے) مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے۔ ہندوؤں کے پاس نہایت مؤثر اور طاقتور پریس ہے۔ کانگرس اور مہاسبھا کی پشت پر ہندو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی دولت ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔

مصنف: اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی ووٹر یہ سمجھتے ہیں کہ کانگرس اور ہندوستان ایک ہی ہیں اور کیونکہ کانگرس اس بات کو دہراتے نہیں تھکتی کہ ہندوستان ایک اور ناقابل تقسیم ہے، لہٰذا برطانوی ووٹر سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کو تقسیم کرنا آزاد خیالی کے منافی، رجعت پسندی اور دغابازی پر مبنی ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات ان کی سوچ کے خلط ملط ہونے کی نشاندہی کرتی ہے لیکن ہماری طرح کی ہر جمہوریت میں، جہاں ووٹروں کو نہایت پیچیدہ مسائل کے بارے میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں، اس قسم کی سوچ اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ابھی ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ واحد آزاد خیال، غیر متعصبانہ اور اس بات میں اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کو چھوڑ دیں اور عنان حکومت۔۔۔۔۔

جناح: آپ اس میں ان الفاظ کا بھی اضافہ کر سکتے "اور واحد محفوظ راستہ ہے۔"

جناح اور مصنف بیک وقت "پاکستان"(46)

اس انٹرویو کے بعد بیورلے نکولس اس وقت پاکستان کے متعلق مغرب میں کانگرسی پروپیگنڈے پر لکھتے ہیں کہ:

"مغرب کے زیادہ تر آزاد خیال لوگ اس پروپیگنڈے کا بری طرح شکار ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً ہمیں یہ غیر معمولی نظارہ، دیکھنے کو مل رہا ہے کہ "ترقی یافتہ "انگریز سیاستدان، دارالعوام میں کھڑے ہو کر انتہائی خلوص کے ساتھ، ہندوستان کی آزادی کے مشترکہ نصب العین کے حصول کے لیے، ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں دلیلیں دے رہے ہیں۔ وہ اس بات سے قطعاً نا آشنا ہیں کہ ہندوستان کا یہ نام نہاد اتحاد ہی ہندوستان میں برطانوی راج کا سب سے بڑا سبب ہے۔

متحد رکھو اور حکومت کرتے رہو۔

تقسیم کرو اور نکل جاؤ۔

جو اشخاص ہندوستان اور اس کے مسائل کے متعلق اپنی رائے دے رہے ہیں، ان کی میزوں پر یہ الفاظ نمایاں طور پر نظر آنے چاہیں۔

کانگرسی پروپیگنڈے کی کامیابی کا ایک اور بھی زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اسے ایسے مردوں اور عورتوں کے انبوہ کثیر نے تسلیم کیا ہے، جو ہندوستان کے سوا، دنیا کے ہر خطے میں مظلوم اقلیتوں کی شکایتیں سن کر فی الواقع بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اگر شبہ بھی ہو جائے کہ کسی شخص نے سلواک باشندوں کی توہین کی ہے تو اس پر بحث کے لیے کمیٹیوں کے ہنگامی اجلاس بلانے شروع کر دیتے ہیں۔ شمالی اٹلی کے آسٹرین باشندوں یا رومانیہ میں ہنگری کے باشندوں کے بارے میں وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتے ہیں لیکن ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اس پر بالکل خاموش رہتے ہیں حالانکہ ان کا قومیت اور آزادی کا دعویٰ انتہائی قدیم اور فوری توجہ کا طالب ہے۔ اگر یہ لوگ حقیقتاً اتنے مخلص نہ ہوتے تو ان پر ایسے ریاکارانہ نسلی امتیاز کا الزام عائد ہوتا جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔"

میرے ایک دوست نے جنھوں نے یہ باب پڑھا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "جناح، جیسا کہ آپ نے ان کی تصویر پیش کی ہے، ایک قابل یقین شخصیت معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا واقعی مسلمانوں کے نکتہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں؟ کیا مسلم لیگ اور مسلم ہندوستان واقعی یکساں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پاکستان واقعی جیتتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے، اگر مسلم لیگ کے مخالف لوگوں کی تعداد بھی کافی ہے، تو آپ کی تمام دلیلیں بے کار اور ناکام ثابت ہوں گی۔"

یہ ایک اہم نکتہ اور جواب کا مستحق۔ اس کا جواب نہایت مختصر الفاظ میں دیا جا سکتا ہے۔

اگر مسلم لیگ، مسلم ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی، تو ہم آہستہ سے، شائستہ انداز میں، سوال کر سکتے ہیں کہ کون کرتا ہے؟

اگر کوئی دوسری جماعت مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی دعویدار ہے تو وہ کون سی ہے؟ وہ کہاں چھپی بیٹھی ہے اور اگر مسلمانوں کی صفوں میں مسلم لیگ کی مخالفت کا ذرا سا شائبہ بھی ہے تو کانگرس اس کے وجود سے کیوں ناواقف ہے۔ کانگرس اپنی تمام شکایتیں، بلند آواز اور تلخ، مسلم لیگ تک ہی کیوں محدود رکھتی ہے۔ کانگرس ہر روز یہ اعلان کیوں کرتی رہتی ہے کہ ہمیں مسلم لیگ کے ساتھ کسی تصفیے پر پہنچنا ہو گا؟ گاندھی اپنی تمام دلیلوں، ہر تنبیہ، ساری ڈانٹ ڈپٹ میں، مسلم لیگ کے رہنما جناح کو ہی اپنا مخاطب کیوں بناتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً واضح ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلم ہندوستان ہے۔ اس کے خلاف کوئی مخالفانہ آواز بلند نہیں ہوتی کیونکہ مسلم لیگ مسلمانوں کے عزم کا مکمل اظہار ہے۔"(47)

مفاہمت کی کچھ مزید کوششیں اور الیکشن ڈیسائی لیاقت معاہدہ

گاندھی جناح مذاکرات ناکامی کے بعد مفاہمت کی کچھ اور کوششیں بھی ہوئیں۔ ان میں ایک لیاقت ڈیسائی معاہدہ تھا:

"اس سکیم کے مطابق وزارت کے لیے مسلم لیگ اور کانگرس نے ایک جتنے اراکین نامزد کرنے تھے، جن کا مرکزی قانون ساز اسمبلی کا رکن ہونا ضروری نہ تھا۔ وزارت میں سکھوں اور اچھوتوں کو بھی نمائندگی دی جانی تھی۔ کمانڈر انچیف نے بھی وزارت میں شامل ہونا تھا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اگر ایسی وزارت بنی تو پہلے قدم کے طور پر کانگرسی ورکنگ کمیٹی کے اراکین کو رہا کیا جائے گا۔ دوسرا اقدام صوبوں سے گورنر راج ہٹا کر وہاں مخلوط وزارتیں بنانا ہو گا۔ لگتا ہے کہ مخلوط وزارتوں کے قیام کا مقصد ہندو مسلمان تعلقات کی بحالی تھا جو کانگرس کے مخلوط وزارتوں میں شرکت کے انکار سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ اگرچہ ڈیسائی لیاقت ایڈہاک انتظام تھا، لیکن اس طرح یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ مخلوط وزارت کی صورت میں مسلم لیگ اور کانگرس کو برابر حصہ ملے گا۔"(48)

سپرو کمیٹی رپورٹ

لیاقت ڈیسائی کوششوں کے دوران سپرو کمیٹی بھی لیگ اور کانگرس کے درمیان ڈیڈلاک ختم کرنے کے لیے حل دھونڈ رہی تھی۔ سپرو کمیٹی ایسے ممتاز افراد پر مشتمل تھی جن کا تعلق نہ مسلم لیگ سے تھا اور نہ ہی کانگرس سے۔ سپرو کمیٹی نے بھی مسئلے کا حل برابری ہی میں دیکھا۔ سیر وائی لکھتے ہیں کہ:

"سپرو کمیٹی اور خود سپرو نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کے آزاد اور متحدہ ہندوستان میں اپنے مستقبل کے بارے خدشات درست ہیں۔ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو آئینی تحفظات مہیا کیے جائیں۔"(49)

46-1945ء کے انتخابات اور مولانا آزاد کی طرف سے پیش کردہ حل

لیبر پارٹی انتخابات جیت کر برسر اقتدار آگئی۔ ایٹلی وزیر اعظم بن گئے اور لارڈ پیتھک لارنس سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان مقرر ہوئے۔ 1945ء میں جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تو ہندوستانی سیاسی جماعتوں نے مطالبہ کیا کہ چونکہ جنگ ختم ہو چکی اس لیے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کروائے جائیں۔

سیر وائی کے مطابق "انتخابات کا انعقاد کانگر سی نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ ڈیسائی لیاقت معاہدہ اور سپر و کمیٹی کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ہندی مسلمانوں کے اپنے مستقبل کے بارے میں خدشات مبنی بر حقیقت ہیں اور ان کا سدِ باب کیا جانا اہم ضرورت ہے۔ معاہدے اور رپورٹ دونوں نے اس صورت حال کے حل کے طور پر مرکزی حکومت میں مساوی نمائندگی پر زور دیا تھا۔ ان کی ناکامی کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد نے 1945ء میں اپنی طرف سے بھی اس مسئلے کا حل پیش کیا، جس کا مقصد متحدہ ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کے خدشات کو رفع کرنا تھا۔"

سیر وائی آگے لکھتے ہیں کہ:

> "نیشنلسٹ مسلمان کی حیثیت سے آزاد تو یہ ماننے کو تیار تھا کہ مسلمانوں کے اپنے سیاسی مقدر کے بارے میں خدشات درست ہیں، لیکن اس کے گانگرسی رفقا یہ ماننے پر تیار نہیں تھے، تاہم وہ جناح کی زبان میں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ برادر گاندھی کے تین ووٹ ہیں جبکہ میرا صرف ایک ووٹ ہے (بحوالہ والپرٹ کی کتاب جناح صفحہ نمبر 181 جناح نے یہ الفاظ گاندھی کی اس تقریر کے جواب میں کہے جو اس نے آزاد کی صدارت میں ہونے والے کانگرس کے اجلاس (بتاریخ 20 مارچ 1940ء بمقام رام گڑھ) میں کی اس کے باوجود وہ ان الفاظ کے پس پردہ حقیقت کو تسلیم کرتا تھا۔ جمہوریت محض اکثریت کی حکومت کا نام نہیں بلکہ اسے عوامی حمایت حاصل ہونی چاہیے۔ کوئی ایسی تھیوری جس کی بنیاد بندوں کو گننے پر ہو، اقلیتوں کو اقتدار سے محرومی کے خلاف کوئی ضمانت نہیں دے سکتی جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت دیے گئے تحفظات ناکام ہو گئے۔ غور و خوض کے بعد آزاد نے 2 اگست 1945ء کو ہندو مسلم مسئلے کا حل گاندھی کو بھجوایا سارا خط پڑھے بغیر بات نہیں بنتی۔ تاہم موجودہ بحث کے لیے کچھ حصے ہی کافی ہیں۔ آزاد نے اپنے خط میں لکھا۔ (بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد پنجم صفحہ نمبر 155-57)

"مسلمان کی حیثیت سے اس نے پاکستان کو مسترد کر دیا ہے کیونکہ وہ اسے مسلمانوں کے مفاد کے منافی سمجھتا ہے۔ پاکستان کو ماننا شکست خوردگی کی علامت ہے، تاہم مسلمانوں کے خدشات رفع کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہ حقیقی ہیں آزاد نے جو تجاویز گاندھی کو بھجوائیں ان کا نقشہ قابلِ توجہ ہے

1. ہندوستان کے مستقبل کا آئین وفاقی طرز کا ہونا چاہیے جس میں مرکزی حکومت کے پاس صرف وہی شعبے ہونے چاہئیں، جنھیں وفاقی یونٹ دینے کے لیے تیار ہوں۔

2. یونٹوں کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہونا چاہیے۔
3. مرکز میں مخلوط انتخابات ہوں اور صوبوں میں بھی، لیکن صوبوں میں نشستیں مخصوص ہونی چاہئیں۔ جب تک پارٹیاں معاشی اور سیاسی بنیادوں پر منظم نہیں ہوتیں اور فرقہ وارانہ خدشات رفع نہیں ہوتے اس وقت تک مرکزی اسمبلی اور مرکزی ایگزیکٹو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے آزاد نے اپنا رف فارمولا پیش کرنے کے بعد اپنے ہندو دوستوں سے اپیل کی کہ وہ اسے مسلمانوں پر چھوڑ دیں کہ وہ ہندوستان کے آئندہ آئین میں اپنے لیے کیا مقام چاہتے ہیں اگر مسلمانوں کو یقین آجائے کہ غیر مسلمان ان پر اپنا فیصلہ مسلط نہیں کر رہے تو وہ تقسیم کا خیال ترک کر دیں گے اور انھیں یہ احساس ہو جائے گا کہ وفاقی متحدہ ہندوستان ان کے مفادات کی حفاظت کر سکتا ہے۔ بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد پنجم صفحہ نمبر 156"

گاندھی نے یہ خط ملتے ہی 16 اگست کو آزاد کو تار دیا۔

"میرے خیال میں آپ کے خط کو شائع نہیں ہونا چاہیے تفصیلی لکھوں گا"(بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد پنجم صفحہ 172)"

اسی دن گاندھی نے اپنے خط میں لکھا:

"I did not infer from your letter that you are writing about my Hindus. Whatever you have in your heart has not appeared in your writing. But don't worry. We will talk the matter over, when next we met, if you so desire. Whatever you want to say about communal problem, should not be said without consulting me and the Working Committee. I am also of the opinion that it will be better to keep quiet.... Party can give its opinion after consulting with you. They have the right to do so. Besides, it is their duty. My opinion differs from yours ... I do not feel the urge to do anything in a hurry."

"میں نے آپ کے خط سے یہ نتیجہ نہیں نکالا کہ آپ میرے ہندوؤں کے بارے میں لکھ رہے ہیں آپ کے دل میں جو کچھ ہے تحریر اس کی عکاسی نہیں کرتی، پریشان نہ ہوں اگلی ملاقات میں ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے اگر آپ کی خواہش ہو گی تب۔ آپ فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں جو کچھ بھی کہنا چاہیں میرے اور ورکنگ کمیٹی کے مشورے کے

بغیر ہر گز نہ کہیں۔ میری رائے میں خاموش رہنا بہتر ہے۔ پارٹی آپ سے مشورے کے بعد اپنی رائے دے سکتی ہے۔ انھیں اس کا حق حاصل ہے۔ یہ ان کا فرض ہے۔ میری رائے آپ سے مختلف ہے، میں کسی کام کو بھی جلدی میں کرنا پسند نہیں کرتا "

ایچ ایم سیر وائی آگے لکھتے ہیں کہ گانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے آزاد کے خط کا جو حشر کیا، ہمیں معلوم نہیں۔ البتہ گانگرس کے کسی ریزولیشن میں بھی آزاد کے اس فارمولے کا کوئی ذکر نہیں "(بحوالہ مینن صفحہ نمبر 224 مینن نے گاندھی کے جواب کا ذکر نہیں کیا۔ ٹنڈولکر کی کتاب مہاتما میں آزاد کے خط اور گاندھی کے جواب کا ذکر موجود ہی نہیں نہ ہی آزاد نے اپنی کتاب میں اس خط اور گاندھی کے جواب کا حوالہ دیا ہے)"(50)

لیاقت ڈیسائی معاہدہ ہو، سپرو کمیٹی رپورٹ ہو، حتیٰ کہ خود آزاد صاحب بھی مسلمانوں کے خدشات کو جائز سمجھتے ہیں اور آزاد صاحب بھی ڈیسائی اور سپرو کی طرح مسئلے کا حل مساوات میں دیکھ رہے ہیں۔ وہ مولانا آزاد، جسے دنیا کو دکھا کر کانگرس یہ ثابت کرتی آئی ہے کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے، اس بندے کی اتنی اہمیت نہیں کہ اس کے دیے گئے حل پر کانگرس کے کسی اجلاس میں گفت و شنید ہو اور وہ خود بھی اس ہمت کا مظاہرہ نہیں کرتے کہ بعد میں ہی سہی اپنے اس خط کا اپنی کتاب میں ہی تذکرہ تک کرتے۔

46-1945ء کے الیکشنز سے پہلے جناح صاحب نے کانجی کے سامنے پیشین گوئی کی کہ کانگرس ایک بھی نیشنلسٹ مسلمان کو کامیاب نہیں کرا سکے گی۔ ہر نشست پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو جائے گا۔

الیکشن کے نتائج پر سیر وائی لکھتے ہیں کہ:

"مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے انتخابات کے نتائج دسمبر 1945ء کے اواخر میں شائع ہوئے جن سے انکشاف ہوا" کہ گانگرس نے عام حلقوں میں بے پناہ کامیابی حاصل کی ہے اور گانگرسی امیدواروں کے مخالف امیدواروں نے عام طور پر شکست سے بچنے کے لیے میدان چھوڑ دیا تھا۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص تمام نشستیں جیت لیں اور عام طور پر نیشنلسٹ مسلمانوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں۔ کانگرس نے غیر مسلمان انتخابی حلقوں سے ڈالے گئے ووٹ کا 91.3 فیصد حاصل کیا اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کے حلقوں میں ڈالے گئے ووٹوں کا 86.6 فیصد حاصل کیا۔ (بحوالہ مینن صفحہ نمبر 228)

بقول منشی "نتائج نے ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں پر اسی طرح غلبہ حاصل کر لیا ہے جس طرح گانگرس نے ہندوؤں پر۔ ان نتائج نے ہمارے ان راہنماؤں کی آنکھیں

کھول دیں، جو نہیں مانتے تھے کہ مسلمان جناح کی مٹھی میں بند ہیں"بحوالہ منشی صفحہ نمبر (51)98

کیبنٹ مشن پلان

24 مارچ 1946ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔ اس میں لارڈ پیتھک لارنس، سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا، سر سٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزنڈر شامل تھے۔ مشن نے مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں سے طویل بات چیت کا آغاز کر دیا۔ سیر وائی مشن کے وفد کے سامنے آزاد کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اہم بیان ہے اور یہاں بھی آزاد نے بحیثیت مسلمان تقریباً وہی باتیں کیں جن کا اظہار گاندھی کے نام اپنے خط میں کر چکے تھے:

> "اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان میں تقسیم ہند کے خلاف ہوں، کیونکہ میں اسے مسلمانوں کے مفاد کے منافی سمجھتا ہوں۔ البتہ آزاد نے تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے خدشات درست ہیں اور ان کا ازالہ ضروری ہے۔ اس نے کہا جو فارمولہ میں نے کانگرس کی منظوری سے تجویز کیا ہے اس میں پاکستان سکیم کی ساری خوبیاں موجود ہیں، جب کہ اس میں سے نقائص رفع کر دیے گئے ہیں۔ پاکستان سکیم کی بنیاد اس خوف پر ہے کہ چونکہ کانگرس مرکز میں حکمران ہو گی اس لیے وہ مسلمان اکثریتی صوبوں کے معاملات میں دخل دے گی۔ کانگرس نے باقی ماندہ اختیارات دے کر اس خوف کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب مرکزی اختیارات کی دو فہرستیں ہو نگی ایک لازمی دوسری غیر لازمی، یعنی آپشنل۔ تاکہ صوبے کم سے کم اختیارات مثلاً دفاع، خارجہ تعلقات اور مواصلات کے علاوہ اگر چاہیں تو باقی تمام معاملات خود نمٹا سکیں۔"

اس کے بعد سیر وائی آزاد کے ذاتی حیثیت میں بیان کیے گئے خیالات لکھتے ہیں کہ:

> "ان کی ذاتی گفتگو کے اہم نکات یہ تھے "سپرو کمیٹی کی رپورٹ میں کم سے کم ایک ایسی تجویز موجود ہے جو قابل غور ہے جسے بحث و تمحیص کی گرمی میں پس پشت ڈال دیا گیا۔ رپورٹ کے مطابق مرکز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کے اصول پر حکومت بنائی جانی تھی اور انتخابات مخلوط ہونے تھے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اس تجویز پر مزید غور ہونا چاہیے۔"

آزاد اس سے پہلے اپنے گاندھی کو لکھے گئے 02 اگست 1945ء کے خط میں مرکز میں اسی مساوات کا ذکر رہے اب دوبارہ کیبنٹ مشن کے سامنے سپرو رپورٹ کا حوالہ دے کر اپنی اسی خواہش کو دہرا رہے ہیں۔ عملاً اس بات کا اعتراف ہے کہ جناح صاحب کے کہے گئے یہ الفاظ درست ہیں اور مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے خدشات جائز ہیں جہاں "برادر گاندھی کے تین ووٹ ہیں جبکہ برادر جناح کا صرف ایک ووٹ ہے"

سیر وائی ٹرانسفر آف پاور کا حوالہ دیتے ہوئے باقی نیشنلسٹ مسلمانوں کا موقف بھی بیان کرتے ہیں وہ بھی کرپس اور الیگزینڈر کے سامنے مرکز میں برابری کی بات کرتے ہیں۔

"کرپس اور الیگزینڈر نے نیشلسٹ مسلمانوں کے نمائندوں سے (مولانا حسین احمد مدنی، صدر آل انڈیا مسلم پارلیمنٹری بورڈ، اظہار الدین، صدر آل انڈیا مومن کانفرنس، شیخ نظام الدین، صدر آل انڈیا احرار، عبدالمجید خواجہ، صدر آل انڈیا مسلم مجلس، حسین بھائی لالجی صدر آل پارٹیز شیعہ کانفرنس) 16 اپریل 1946ء کو ملاقات کی۔ مولانا مدنی نے کہا کہ وہ ایک مرکزی حکومت اور ایک دستور ساز اسمبلی کے حق میں ہیں۔ مرکزی حکومت اور مرکزی دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو یکساں نمائندگی دی جائے۔ مخلوط انتخابات ہوں لیکن نشستیں مخصوص ہوں۔ اظہار الدین نے کہا کہ مرکزی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابری ہونی چاہیئے۔ حسین نے بھی اس تجویز کی حمایت کی۔
(بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد ہفتم صفحہ 87-286)(52)

لیکن اپنے پچھلے موقف کے برعکس آزاد 06 مئی 1946ء کو پیتھک لارنس کو ایک خط لکھتے ہیں۔ سیر وائی اپنی کتاب کے صفحہ 50 اور 51 پہ اس کے آخری پیرے کا حوالہ دیتے ہیں۔

"ایک اور اہم بات جو ہم واضح طور پر کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم حکومت یا قانون ساز اسمبلی میں گروہوں کی مساوی نمائندگی کی تجویز قبول نہیں کرتے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہر گروہ اور قومیت کے ذہن سے خدشات کے ازالے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ لیکن اس ضمن میں غیر حقیقی ذرائع استعمال نہ کیے جائیں جن سے جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی نفی ہوتی ہو کیونکہ ہم جمہوری اصولوں کی بنیاد پر ہی اپنا دستور بنانا چاہتے ہیں۔"

اسی طرح 09 مئی 1946ء کو آزاد کے لکھے گئے ایک اور خط کا سیر وائی حوالہ دیتے ہیں:

"ہم حکومت اور مقننہ دونوں میں مساوی نمائندگی کے سخت خلاف ہیں کیونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد میں واضح تفاوت ہے۔ یہ بے انصافی ہے اور اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ اس طرح کی شق تصادم کے بیج بونے کے مترادف ہے۔ اگر اس اصول یا کسی اور ایسے اصول پر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو ہم ان معاملات کو کسی ثالث کے سپرد کرنے کو تیار نہیں"

اس سے ایک دن قبل گاندھی کرپس کو اپنے لکھے گئے خط میں مساوی نمائندگی پر ان الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں:

"اصولی طور پر چھ ہندو اکثریتی صوبوں اور پانچ مسلمان اکثریتی صوبوں میں مساوی نمائندگی کی راہ میں ایک ناقابل عمل رکاوٹ حائل ہے۔ مسلمان اکثریتی صوبے صرف نو کروڑ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ چھ ہندو اکثریتی صوبے 19 کروڑ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ صورت حال پاکستان سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے مرکزی قانون ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو کو آبادی کی بنیاد پر تشکیل دیا جائے۔"(53)

یہ خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کانگرس میں آزاد صاحب کتنے "آزاد" تھے؟

سیروائی اپنی کتاب میں مساوی نمائندگی پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہیں۔ سیروائی جو کہ خود ایک ماہر قانون ہیں کانگرس کی برابری کی مخالفت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈیسائی لیاقت معاہدہ اور سپرو رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر بھولا بھائی ڈیسائی اور سپرو جیسے ممتاز ہندو قانون دان برابری کو ہندو مسلم مسئلے کا حل سمجھتے تھے اور اسی میں ہندوستان کے اتحاد کا امکان دیکھتے تھے تو پھر برابری کو غیر حقیقی اور غیر جمہوری قرار دینا غیر مناسب ہو گا۔"(54)

سیروائی آگے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس سوال کا اصولی جواب یہ ہے کہ کانگرس کے برابری پر مؤقف سے ان کے طریقہ آئین سازی کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے۔ کانگرس نے اس حقیقت سے صرفِ نظر کیا کہ حساب کے مطابق تو تین اور ایک برابر نہیں ہو سکتے، لیکن خالصتاً حسابی سوچ کی آئین سازی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ آئین سازی کے میدان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارا انتہائے مقصود کیا ہے اور ہم کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

بلاشبہ کانگرس کا اوّلین مقصد متحدہ ہندوستان کی آزادی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہی ذرائع استعمال کرنے چاہیں تھے، جن کی کامیابی یقینی تھی۔ یعنی طریقہ کار کو مقصد کے

سانچے میں ڈھالنا چاہیے تھا۔ اگر یہ مقصد مساوی نمائندگی کے ذریعے حاصل ہو سکتا تھا تو پھر برابری کو ہی تسلیم کرنا چاہیئے تھا جیسا کہ بھولا بھائی ڈیسائی، لیاقت معاہدے میں طے ہوا، سپرو کمیٹی نے سفارش کی، آزاد نے گاندھی کے نام اپنے خط میں زور دیا اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے کرپس اور الیگزینڈر کے سامنے مطالبہ کیا۔

جمہوری اصول خلاء میں جلوہ گر نہیں ہوا کرتے انھیں تو ان حالات کے موافق ڈھالنا پڑتا ہے جو آئین سازی کے مرحلے میں درپیش ہوں۔ حالات ہندوستان میں اس طرف نشاندہی کرتے تھے کہ ہندوستان کا اتحاد برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا تاوقتیکہ اس بات کو تسلیم نہیں کیا جائے کہ کچھ معنوں میں 9 کروڑ مسلمانوں کو 20 کروڑ ہندوؤں کے مساوی سمجھا جائے، کیونکہ ایک متحد ہندوستان میں یہ ایک اہم ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمان مفاہمت کے ساتھ، اور مسلمان کسی ہندو راج کے خوف کے بغیر مل جل کر رہیں"

اپنی اس دلیل کی وضاحت میں سیروائی نے اپنی کتاب میں تاریخ سے واقعات کا حوالہ بھی دیا وہ لکھتے ہیں کہ:

"اے کاش! کیبنٹ مشن پلان کے دوران گفتگو میں ان اصولوں اور اس جذبے کو ذہن میں رکھا جاتا جن کے تحت دنیا کا سب سے بڑا وفاقی دستور بنایا گیا یعنی امریکہ کا آئین بنا۔ جنگ آزادی کے بعد، امریکہ کی تیرہ ریاستوں نے مل کر وفاقی طرز کا دستور بنایا اور ان تمام مشکلات کو رفع کر لیا، جنھوں نے کنفیڈریشن کو تباہ کیا تھا۔ دوسرے مسائل کے علاوہ امریکہ کی آئین ساز کونشن کو دو اہم مشکلات درپیش تھیں۔

اوّل تو بڑی اور چھوٹی ریاستوں کو برابری کی سطح پر کیسے لایا جائے، کیونکہ اگر بڑی ریاستوں کے مطالبات مان لیے جاتے تو چھوٹی ریاستیں وفاق میں شمولیت سے انکار کر دیتیں اور اگر چھوٹی ریاستوں کی بات مانی جاتی تو بڑی ریاستیں انکاری تھیں۔ جب یہ طے کر لیا گیا کہ وفاق بہر حال بنانا ہے، یہی اہم ترین ضرورت ہے تو پھر مشترکہ مقصد کے حصول کے لیے اختلافات مٹا کر مصالحت کی راہ ڈھونڈ لی گئی۔

دوسرے مسئلے نے گمبھیر اصول اور اخلاقی الجھنیں پیدا کر دیں کہ کیا غلاموں کی درآمد پر آئینی پابندی لگادی جائے؟ اس مسئلے پر وفاق میں شامل ہونے والی ریاستوں میں گہرا اختلافِ رائے پایا جاتا تھا۔ ایک رائے یہ تھی کہ کہ غلاموں کی تجارت غیر اخلاقی کام ہے اس پر فوری طور پر پابندی لگادی جائے۔ اس کے برخلاف دوسری رائے یہ تھی کہ غلام بھی جائیداد ہیں اور جائیداد کے حق میں کبھی بھی مداخلت نہ کی جائے۔ چونکہ دونوں

گروہوں کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جاسکتے تھے اور وفاق کا قیام ضروری تھا، چنانچہ اصولی بحث کو پس پشت ڈال کر مصالحت کی راہ ڈھونڈ لی گئی۔ کنونشن کے مطابق امریکی دستور کے آرٹیکل نمبر 5 کے تحت دستور کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، لیکن اس میں دو اور اہم شقیں بھی شامل تھیں۔ پہلی شق آج تک موجود ہے، جب کہ دوسری شق جو غلامی سے متعلق تھی 1808ء میں ختم کر دی گئی۔ ہر چھوٹی بڑی ریاست کو سینٹ میں دو نمائندے بھیجنے کا حق دیا گیا اور ریاست کی مرضی کے خلاف اسے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

غلامی کے ضمن میں مصالحت کے بعد آرٹیکل نمبر 5 میں شامل کیا گیا، جس کے مطابق کانگرس کو آئندہ بیس سال کے لیے غلاموں کی درآمد پر پابندی لگانے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔"

سیر وائی اس بارے تاریخ سے ایک اور مثال یوں پیش کرتے ہیں:

"اصولی نظریات کو اصل مقاصد کے مطیع کرنے کی بہترین مثال وہ ہے جب انگلستان نے روس کو اسی روز امداد کی پیشکش کر دی، جس روز جرمنی نے روس کو فتح کر لیا۔ بھولا بھائی ڈیسائی جو اس وقت نظربند تھا اس نے بھی اس واقعے کی اہمیت پر اپنی ڈائری میں لکھا۔

"امریکہ اور انگلستان نے روس اور جرمنی کے درمیان جنگ میں روس کی جانب جو روّیہ اختیار کیا ہے، وہ سیاست میں حقیقت پسندی کی بہترین مثال ہے، جس کی ہم میں واضح کمی ہے اور جو ہم اپنے پست ذہنوں کے سبب کبھی بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ حالانکہ امریکہ اور انگلستان کمیونزم سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود فوری مقاصد کے تحت جرمنی کے خلاف روس کا ساتھ دے رہے ہیں، چونکہ وہ جرمنی کو فی الوقت زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں۔ اسے سیاست میں حقیقت پسندی کہتے ہیں۔"(55)

سیر وائی کے پیش کردہ تاریخی دلائل کے بعد ایک بار پھر جناح صاحب کے کلکتہ کانفرنس میں نہرو رپوٹ کے موقع پر 1928ء میں کہے گئے الفاظ دوبارہ ذہن میں لائیں اور سوچیں کہ وہ کس قدر حقیقت پر مبنی تھے۔

مثلاً جب وہ کہتے ہیں:

"ہمارا واسطہ سیاست سے ہے۔ ہم قانون کی عدالت میں نہیں۔ اس لیے موشگافیوں اور ذرا ذرا سے جھگڑوں کی تدبیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بڑے مسئلے ہیں جو تدبر کے اعلیٰ

ترین ضابطے اور سیاسی دانش سے ہی طے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے ایک بار پھر کہوں گا کہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس مسئلے پر انتہائی احتیاط سے غور کریں۔"

یا وہ کہتے ہیں کہ:

"میں ایک بار پھر دہراتا ہوں یقین کریں جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہیں ہو جاتے ہندوستان میں کوئی ترقی نہیں ہو گی۔ لہٰذا کسی منطق، فلسفہ یا تکرار کو اپنے سمجھوتے کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں۔ ہندو مسلم اتحاد سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی"

لیکن ان اپیلوں پر کان دھرنے کے بجائے اُس وقت ہندو لیڈر شپ کی جانب سے کہا گیا کہ یہ کچھ ایسے لوگوں کے مطالبات ہیں جو مشہور زیادہ ہیں اور ان کی مقبولیت کوئی نہیں اس لیے ایسے مطالبات حقارت سے ٹھکرا دینے چاہیں۔

اس تمام بحث میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کانگرس کا مؤقف انتہا پسندی پر مبنی تھا کانگرس اور ہندو لیڈر شپ اکثریت کے زعم میں مبتلا تھی اور وہ مسلمانوں کے جینوئن خدشات کو ایڈریس کرنے کو تیار نہیں تھے ااس حقیقت کے باوجود کہ تمام نیشنلسٹ مسلمان بشمول آزاد، مسلمانوں کے خدشات درست سمجھتے تھے اور اس کا حل مساوات کو سمجھتے تھے یہ اور بات ہے کہ آزاد بحیثیت کانگرس کے صدر اپنی کم ہمتی کی وجہ سے اس کے بالکل الٹ مؤقف اپناتے ہیں جو وہ خود مسلمانوں کے حق میں صحیح سمجھتے ہیں۔

شملہ کانفرنس کے دوران مشن کے ارکان اور وائسرائے اس خدشے کے پیش نظر کہ دونوں فریقوں کے مابین مفاہمت نہ ہو سکے ایک سکیم تیار کرنے میں مصروف رہے۔ اس سکیم پر گورنروں اور کمانڈر انچیف کی رائے بھی لی گئی اور 12 مئی کو شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اسے منظوری کے لیے برطانیہ بھیجا گیا۔ 14 مئی کو وزیر اعظم ایٹلی کی زیر صدارت کابینہ نے اس کی منظوری دی اور 16 مئی کو اس سکیم کا متن دہلی میں جاری کر دیا گیا جو "وزارتی مشن منصوبہ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

یئے اب دیکھتے ہیں کہ یہ سکیم کیا تھا اور اس سکیم پر مسلم لیگ اور کانگرس کا ردِ عمل کیا تھا؟ کس نے یہ قبول کیا کس نے نہیں کیا؟

اس سکیم کے دو حصے تھے ایک طویل المیعاد منصوبہ جس کا تعلق دستور سازی سے تھا اور ایک مختصر المیعاد منصوبہ جس کا تعلق ملکی انتظام چلانے کے لیے عبوری حکومت کی تشکیل سے تھا۔ طویل المدت منصوبے کی بنیادی صورت مندرجہ ذیل سہ نکاتی سکیم پر مشتمل تھی۔

ا۔ سب سے پہلے ایک یونین آف انڈیا(وفاقِ ہند) ہونی چاہئے جس میں برٹش انڈیا اور ریاستیں شامل ہوں۔ یہ خارجہ امور، دفاع اور مواصلات جیسے معاملات کی نگرانی کرے۔

ب۔ اس کے بعد صوبے اور ریاستیں ہوں گی۔ یونین کے زیرِ اثر نہ آنے والے تمام (علاقے) ہوں گے باقی ماندہ تمام اختیارات ان کے پاس ہوں گے۔

ج۔ لیگ کو پاکستان کا ماحصل صوبوں کی تین سیکشنوں میں گروہ بندی، کے ذریعے دیا جائے گا۔ یہ تینوں سیکشن کچھ اس طرح ہوں گے۔

سیکشن "ا" مدارس، بمبئی، صوبہ جات متحدہ، بہار، صوبہ جات متوسط اور اڑیسہ۔ ہندو اکثریتی صوبے

سیکشن ب، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان۔ مسلم اکثریتی صوبے

سیکشن ج بنگال اور آسام، مسلم اکثریتی صوبے

یاد رہے کہ وزارتی مشن کی طرف سے یہ اعلان صرف مشن کی طرف سے نہیں تھا بلکہ برطانوی حکومت سے توثیق کے بعد اسے بیک وقت دہلی اور لندن میں جاری کیا گیا۔

16 مئی کو مشن ارکان کی طرف سے لیگی نمائندوں کو وضاحت

16 مئی کو مسلم لیگی نمائندے نوابزادہ لیاقت علی خان، نواب محمد اسمٰعیل خان اور سردار عبد الرب نشتر مشن کے ارکان پیتھک لارنس اور کرپس سے ملے یہاں مسلم لیگی نمائندوں کی مشن کے ارکان سے کچھ اس طرح گفتگو ہوئی۔

نواب محمد اسمٰعیل نے پوچھا کہ گروپ کب اور کیسے تشکیل دیے جائیں گے؟

کرپس نے وضاحت کی کہ دستور ساز اسمبلی کے حصے (سیکشن) اجلاس منعقد کر کے اپنے گروپ کے اندر صوبائی دساتیر کی نوعیت کا فیصلہ کریں گے اور اس گروپ میں شامل صوبوں کے نمائندے اکثریتی ووٹ سے فیصلہ کریں گے۔

سردار عبد الرب نشتر نے پوچھا کہ کیا انھوں نے صحیح سمجھا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا ہر حصہ اپنے گروپ میں شامل تمام صوبوں کے لیے دستور بنانے کا مجاز ہو گا، چاہے وہ اجلاس میں آئیں یا نہ آئیں۔ اور یہ بھی فیصلہ کرے گا کہ کیا گروپ ہونا چاہیے اور گروپ کے پاس کون سے محکمے ہونے چاہیں لیکن دستور بننے کے بعد بہر حال صوبے کو علیحدگی کا اختیار ہو گا۔

سر سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ مسودے کے مطابق ہے۔ علیحدگی کا اختیار انتظام مکمل

ہونے کے بعد اور یونین (مرکز) کے لیے آئین بننے کے بعد استعمال کیا جائے گا۔
نواب محمد اسمٰعیل نے سوال کیا کہ اس بیان کی توضیح و وضاحت کون کرے گا"
سر کرپس نے جواب دیا کہ اگر کوئی سوال پیدا ہوا تو میرے خیال کے مطابق وائسرائے کو فیصلے کا اختیار حاصل ہو گا۔ ضرورت کے مطابق وہ حکومت برطانیہ سے مشورہ کر کے فیصلہ کرے گا۔(56)

17 مئی کو گاندھی کا ردِ عمل

مشن کا بیان جاری ہوتے ہی پہلا اور فوری ردِ عمل گاندھی کا آیا:

"اس نے 17 مئی کو ایک بیان جو اس کے اخبار ہریجن میں شائع ہوا "مشن اور وائسرائے نے فریقین کے مابین مفاہمت کی پوری کوشش کی لیکن وہ کوئی تصفیہ نہ کروا سکے۔ چنانچہ انھوں نے ملک کے لیے وہ سفارشات دی ہیں جو ان کے خیال میں آئین ساز اسمبلی کو قابل قبول ہونگی"

"یہی صورت گروپنگ کی ہے۔ صوبوں کو آزادی ہے کہ وہ چاہیں تو گروپنگ کو سرے سے ہی رد کر دیں۔ اگر گروپنگ کا تصور تسلیم بھی کر لیا گیا تب بھی کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف گروپ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔" (57)

16 مئی کو مشن ارکان کی طرف سے لیگی ارکان کو دی گئی وضاحت اور 17 مئی کے گاندھی کے ردِ عمل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ گاندھی پہلے دن سے گروپ سکیم، جس کے ذریعے مسلمانوں کے خدشات کو ایڈریس کیا گیا تھا، کو سبوتاژ کرنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے۔

18 مئی کرپس ولارنس کی گاندھی سے ملاقات

پیارے لال 18 مئی کو گاندھی اور کرپس ولارنس کی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"لارڈ پیتھک لارنس نے گاندھی جی کے ایک سوال کے جواب میں انھیں یہ یقین دہانی کرائی کہ ہمارے مجوزہ منصوبے کی ساری بنیاد رضاکارانہ ہے۔ اس میں کسی جگہ بھی جبر کا عنصر شامل نہیں ہے۔ گاندھی نے اس پر استدلال کیا کہ اگر ایسا ہے تو پھر باقی کام تشریح و توضیح کے ذریعے سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس کام پر اپنے قانونی ذہن کا اطلاق کیا"(58)

اس پر زاہد چوہدری تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"چنانچہ مشن کے اہم ترین ارکان کی جانب سے یقین دہانی ملنے کے بعد اس "قانونی ذہن" نے جو کہ دراصل "شیطانی ذہن" تھا پیراگراف 15 اور 19 کی تشریح و توضیح پر پورا زور صرف کر دیا اور وزارتی مشن منصوبے کی اصل روح یعنی گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لیے طرح طرح کی توجیہات نکالیں۔"(59)

گاندھی، کرپس اور پیتھک لارنس کے ساتھ مل کر جس طرح سکیم کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اس سے صرف جناح نہیں بلکہ خود وائسرائے اور مشن کے تیسرے رکن الیگزینڈر بھی لاعلم تھے۔ اسی روز جب دوپہر کو ارکان مشن اور وائسرائے کے مابین اجلاس ہوا تو کرپس اور پیتھک لارنس نے یہ تو بتایا کہ گاندھی نے اپنی حمایت دینے کا دارومدار کس نکتے پر رکھا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے اس بارے میں اسے کیا یقین دہانی کرائی۔

تاہم ویول کو کچھ شبہ تھا ویول نے کرپس اور پیتھک لارنس کی بات سن کر کہا کہ:

"مجھے پوری طرح تو معلوم نہیں کہ گاندھی کے پس ذہن کیا کارفرما ہے لیکن مشن کے ارکان کے ذہنوں میں کانگرس کے عزائم کے بارے میں کوئی شک و شبہ یا غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے۔ ویول نے کہا کہ کانگرس کے رہنماؤں کا مقصد عبوری حکومت کے تحت مرکز میں اقتدار کا حصول ہے۔ اس کے بعد وہ جب چاہیں گے کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کھڑا کر کے آئین ساز ادارے کو تارپیڈو کر دیں گے۔ اگر وہ اس وقت تک آئین سازی کو تاخیر میں ڈال دیں کہ جب تک برطانوی افواج کا یہاں سے مکمل انخلا ہو جائے اور ان کو پولیس اور ہندوستانی فوج پر کنٹرول حاصل ہو جائے تو وہ پھر اس پوزیشن میں ہونگے کہ مسلمانوں اور دیسی ریاستوں کے ساتھ اپنے وقت پر اپنی مرضی کا سلوک کریں۔"(60)

گاندھی کرپس اور پیتھک لارنس کے تعلقات پر ایک نظر

آگے بڑھنے سے پہلے آیئے ذرا ایک نظر گاندھی، پیتھک لارنس اور کرپس کے باہمی تعلق پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

03 اپریل کو گاندھی کے ساتھ مشن کی پہلی ملاقات کا، جس میں ویول خود بھی موجود تھا، اپنے روزنامچے میں احوال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"S and S began with his usual sloppy benevolence to this

malevolent old politician who for all his sanctimonious talk has, I am sure very little softness in his composition."

"سیکرٹری آف سٹیٹ (پیتھک لارنس) نے اس بدباطن بڈھے سیاستدان کے ساتھ اپنی مخصوص کریم النفسی سے لبریز رقت آمیز لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا جس نے اگرچہ بظاہر بڑی زہدو تقدیس کی باتیں کی تھیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی سرشت میں نرمی ذرہ بھر بھی موجود نہیں ہے"۔

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"I was frankly horrified at the deference shown to Gandhi when he expressed a wish for a glass of water, the secretary was sent to fetch it himself instead of sending for a chaprasi and when it did not come at once Cripps husteled off himself to see about it. Besides being undignified، I am sure this sort of of thing's does not pay"

"سچی بات ہے گاندھی کو حد درجہ تعظیم دکھانے پر اس وقت مجھے سخت دھچکا لگا جب اس نے پانی کے گلاس کی خواہش ظاہر کی اور وزیر (پیتھک لارنس) بجائے چپراسی کو بھیجنے کے خود پانی لانے چلا گیا اور جب اس کی واپسی میں دیر ہوئی تو پیچھے پیچھے کرپس بھی دوڑا چلا گیا۔۔ میں اسے نہ صرف وقار کے منافی سمجھتا ہوں بلکہ میری رائے میں اس قسم کی باتوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔"(61)

ا قاتوں کے اِس سلسلے کے حوالے سے ویول نے لکھا:

"I raised the general question of the continuous appeasement of Congress and leading them to suppose that they could get what they want by demanding it.

Gandhi and co should be led to think that they owned India already Alexander I think agreed with me, S of S and Cripps were rather silent."

"میں نے کانگرس کی مسلسل خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش پر سوال اٹھایا کہ انھیں تاثر نہ دیا جائے کہ وہ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ گاندھی اور کمپنی یہ سمجھنا شروع کر دیں

گی کہ وہ ہندوستان کے مالک بن چکے ہیں الیگزینڈر نے میرے ساتھ اتفاق کیا لیکن کرپس اور پیتھک لارنس خاموش رہے۔(62)

گاندھی کے ساتھ کرپس اور پیتھک لارنس کے ان خصوصی تعلقات کی تائید پیارے لال بھی کرتا ہے:

"وزارتی مشن کے تین ارکان میں سے لارڈ پیتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ کرپس گاندھی جی کو پہلے سے جانتے تھے۔ مسز ایمیلین پیتھک لارنس کی ان کے ساتھ ملاقات ایک میٹنگ میں ہوئی تھی جو عورتوں کے حق رائے دہی کی مہم کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ انگلستان کے ابتدائی دوروں کے دوران کا واقعہ ہے"۔ آگے چل کر لکھتا ہے "لیڈی پیتھک لارنس ان دونوں (گاندھی اور پیتھک) کے مابین رابطہ بنی۔"(63)

کرپس کے بارے میں پیارے لال لکھتا ہے کہ:

"سر سٹیفورڈ اپنی انتہائی سادگی پسندی، نباتات خوری اور روح کی شفایابی کی قوت پر ایمان کی بدولت اپنی ذہنی وضع میں گاندھی سے قریب تر ہوا۔ اگر لارڈ پیتھک لارنس مضبوط برطانوی عقل سلیم کا حامل ہوتے ہوئے وزارتی مشن کے ضمیر کی نمائندگی کرتا تھا تو سر سٹیفورڈ اس کا دماغ تھا۔ گاندھی جی اپنے طور پر سر سٹیفورڈ کو اپنا "دست و بازو اور دھن کا پکا" جان کر بہت خوش ہوتے تھے۔ جس چیز نے گاندھی جی کا دل بالکل موہ لیا تھا وہ سر سٹیفورڈ کی یہ بات تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے بھی ثابت کیا کہ وہ اپنے یقین محکم پر ثابت قدم رہنے کی جرات رکھتا تھا۔"(64)

پیارے لال کے مطابق پیتھک لارنس اور سٹیفورڈ کرپس نے گاندھی کی ان پرارتھنا سبھاؤں میں شرکت کی اور پرارتھنا کی ان خاموش سبھاؤں نے وزارتی مشن کے ارکان اور گاندھی جی کو روحانی ہم مشربی کا ایک قابل قدر موقع مہیا کیا(پیارے لال والیوم ایک 1، صفحہ نمبر 173)

اس پر زاہد چوہدری تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس طرح برطانیہ لیبر کابینہ کے یہ "روشن خیال" وزیر بالمیکی مندر سے مہاتما کی روحانی ہم مشربی حاصل کر کے برصغیر میں "سیکولر" بنیادوں پر فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے اور جناح کو مطالبہ پاکستان کی بنا پر "رجعت پسند" قرار دیتے تھے۔"(65)

ایچ ایم سیر وائی کی تصدیق

"جس انداز سے کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی، نہرو اور پٹیل سے ہر روز رابطہ رکھا اور ان کے درمیان پیامبر آتے جاتے رہے، اس سے کانگرس کے عزائم کی مزید حوصلہ

افزائی ہوئی دوسری جانب ایک پارٹی سے اس طرح کے قریبی رابطے سے مسلم لیگ اور جناح کابینہ مشن سے شاکی ہوگئے اور انھیں انصاف کی توقع نہ رہی۔"

اسی صفحے پر سیر وائی یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"بہت سی سرکاری دستاویزات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کانگرس اس سکیم کو اپنی صحیح روح کے مطابق چلانے اور عملی جامہ پہنانے میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ کانگرس کی مساوی نمائندگی کی مخالفت اور یہ مطالبہ کہ کابینہ کو ڈومینیئن کابینہ کا درجہ دیا جائے اگر مان لیے جاتے تو کانگرس مرکز اور صوبوں میں اقتدار پر قابض ہو کر ہندو مسلمان مسئلے کو اپنی شرائط کے مطابق حل کرتی۔"(66)

سیر وائی بہت واضح الفاظ میں لکھتے ہیں حکومت برطانیہ چاہتی تھی کہ کانگرس کو ناراض نہ کیا جائے۔

18 مئی کو مشن کے ارکان کی وائسرائے کے ساتھ میٹنگ

ان تعلقات پر نظر ڈالنے کے بعد آگے بڑھتے ہیں کیبنٹ مشن منصوبے کی طرف۔

گو کہ کرپس اور لارنس نے گاندھی کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ گروپنگ سکیم سے متعلق طریق کار کی پابندی لازمی نہیں لیکن اسی دن مشن کے تیسرے ارکان اور ویول کی موجودگی میں فیصلہ کیا گیا کہ اس طریق کار میں تبدیلی کے لیے آئین ساز اسمبلی کے مسلم ارکان کی کثرت رائے بھی درکار ہوگی۔

گاندھی کے نام خط میں پیتھک لارنس نے لکھا:

"اگر فریقین مجوزہ طریقہ کار پر باہم عمل شروع کر دیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ انھوں نے اسے بطور بنیاد قبول کر لیا لیکن ہر دو فریقین کی کثرت رائے سے اس میں ترمیم بھی کی جا سکتی ہے۔"

19 اور 20 مئی کو گاندھی کے مشن کو لکھے گئے خط

19 مئی کو کرپس کے خط کے جواب میں گاندھی کا ایک خط آتا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ:

"آپ کے اس جملے کا آخری حصہ کاٹ دینا چاہیے کیونکہ میرے منشا کے لیے یہ زائد ضرورت ہے"

یہ اس لیے گاندھی کے منشا کے خلاف بات تھی کیونکہ اگر دونوں فریقوں کی بات نہ کی جاتی تو صرف کانگرس کے ارکان کی کثرت سے گروپ سکیم کو سبوتاژ کیا جا سکتا تھا۔

سہ پہر کے وقت مشن کے ارکان اور وائسرائے کا اجلاس ہوا موضوع بحث تھا گاندھی کا خط۔ اس پر گفتگو کے بعد ویول اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ:

"The first of the Congress efforts to wreck the Groups of Provinces . This is what the delegation has let itself in for by not standing firm and definite on own statement, they have had seven hours with Gandhi, and this is the result, the clever attempt of an able and unscrupulous politician to torpedo the whole plan. I told the Delegation in plain language that we were sunk if we qualified the statement or argued about it on lawyers' points, our only chance was to stand firm , and refuse to argue. But they won't do it, I fear. "

" (یہ خط) صوبوں کے گروپوں کا قلع قمع کرنے کی کانگرس کی پہلی کوشش ہے۔ مشن نے اپنے بیان پر ثابت قدم اور پختہ نہ رہ کر یہی کچھ حاصل کرنا تھا۔ انھوں نے گاندھی کے ساتھ سات گھنٹے صرف کیے اور یہ نتیجہ نکلا۔ یہ ایک چالاک اور بددیانت سیاستدان کی پورے منصوبے کو تارپیڈو کرنے کی عیارانہ کوشش ہے۔ میں نے مشن کو صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ اگر ہم اپنے بیان کی اصلاح کرنے یا اس کے وکیلانہ نکتوں پر بحث کرنے میں پڑ گئے تو ہماری سکیم بالکل غرق ہو جائے گی۔ ہماری بچت صرف اسی میں ہے کہ ہم ثابت قدم رہیں اور بحث بازی سے انکار کریں لیکن مجھے ڈر ہے وہ ایسا نہیں کریں گے۔"(67)

ابھی مشن کے ارکان اور ویول اس بارے میں کہ گاندھی کے خط کے جواب میں کیا لکھا جائے فیصلہ نہیں کر پائے کہ 20 مئی کو گاندھی کا ایک اور مراسلہ بنام پیتھک لارنس موصول ہو گیا۔ اس میں گاندھی نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس نے لکھا کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخاب سے پہلے عبوری حکومت کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ جسے قومی حکومت کا نام دیا جائے جو نو منتخب مرکز قانون ساز اسمبلی کو جواب دہ ہو۔ اس نے دونوں بڑی پارٹیوں کی مخلوط حکومت کی مخالفت کی اور پیرٹی (برابری) کے اصول کو بھی رد کر دیا اور رائے دی کہ کانگرس یا مسلم لیگ کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ علاوہ اور باتوں کے اس سلسلے میں گزشتہ روز سات گھنٹے طویل ملاقات میں گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن مشن کے اجلاس میں جو 20 مئی کو منعقد ہوا، پیتھک لارنس صاف مکر گیا کہ کل جو بات ہوئی تھی اسے غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ

19 مئی کو پیتھک لارنس نے وزیر اعظم ایٹلی کے نام اپنے مراسلے میں گاندھی کے ساتھ اس طویل گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "وہ کہتا ہے کہ میری رائے میں کانگرس، مشن کی جاری کردہ دستاویز کے بارے میں اپنی قرارداد اس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک کہ عبوری حکومت طے نہیں ہو جاتی۔"

(ٹرانسفر آف پاور والیوم 7 صفحہ 631 از پاکستان کیسے بنا)

گویا گاندھی نے عبوری حکومت کے قیام یا دوسرے لفظوں میں انتقالِ اقتدار کو اولیت قرار دے دیا اور آئین سازی کو ثانوی حیثیت دے دی۔

گاندھی کا یوں اصل چہرہ سامنے آنے پر ویول مشن کے ارکان کا ردِ عمل بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں:

"I have never seen three men taken more a back by this revelation of Gandhi in his true colours. Cripps and S of S were shaken to the core while Alexander's reactions were pure john bull at his most patriotic and insular. After sitting for a while---- Cripps quite ahuri', S of S sadly disillusioned, Alexander boiling with indignation and my self refraining with a little difficulty from saying 'I told you so'"

"گاندھی کے اپنے اصل روپ میں آنے پر تینوں حضرات جس قدر ہکا بکا ہوئے انھیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کرپس اور سیکرٹری آف سٹیٹ اندر تک ہل گئے جب کہ الیگزینڈر کا ردِ عمل خالص جان بُل یعنی خالص انگریز والا تھا جو کہ محب وطن اور تنگ نظر ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے لیے کرپس بالکل "آہوری" (لفظ جنوبی ہند میں ہیچ اور گھٹیا ذات شخص کے لیے بولا جاتا ہے) ہو کر رہ گیا، سیکرٹری آف سٹیٹ (پیتھک لارنس) مغموم و مایوس ہو رہا اور الیگزینڈر غصے سے کھولتا رہا اور میں بڑی کوشش کر کے یہ کہنے سے اجتناب کرتا رہا کہ 'میں نے کہا نہیں تھا' "(68)

سرکاری ریکارڈ کے مطابق 20 مئی کو مشن ارکان کے ہمراہ اجلاس میں " گاندھی کے اس خط پر بحث کرتے ہوئے ویول نے کہا کہ اس خط نے میرے اس موقف کی تصدیق کر دی ہے کہ کانگرس کا مقصد کوئی آئین وضع کرنے سے پیشتر کسی نہ کسی طور اقتدار حاصل کرنا ہے اور برطانوی غلبہ کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کو مغلوب کرنا اور ریاستی حکمرانوں کو بے

دخل کرنا ہے۔اے وی الیگزینڈر نے کہ کہ گاندھی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ " کانگرس ہمارے جاری کردہ بیان کی بنیاد پر کسی تصفیے پر آمادہ نہیں ہے۔اگر یہ خط گاندھی کے روّیے کی نمائندگی کرتا ہے تو پھر بہتر ہو گا کہ مشن وطن واپس چلا جائے۔"(79)

گاندھی کے ان خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے ایچ ایم سیروائی لکھتے ہیں کہ اس خط وکتابت کو پڑھنے کے بعد الیگزینڈر کی رائے سے بہر حال اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ "گاندھی ہرگز بیان کی بنیاد پر کوئی تصفیہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔"

20 مئی کانگرس کا پہلا ردِ عمل

20 مئی کو کانگرس کے صدر مولانا آزاد کی طرف سے مشن کو پہلا ردِ عمل موصول ہوتا ہے جس میں کہا گیا "مجوزہ آئین ساز اسمبلی آئین سازی کے معاملے میں بالکل خود مختار ہو گی اور اس پر کوئی بیرونی دباؤ؟ نہیں ہو گا۔" مزید کہا گیا کہ:

"آئین ساز اسمبلی جس معاملے پر چاہے گی غور کرے گی اور جو چاہے گی فیصلہ دے گی۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلہ پر ہر دو فرقوں کے ارکان کی کثرت رائے درکار ہو گی۔"(70)

20 مئی کو کافی سوچ بچار کے بعد پیتھک لارنس نے گاندھی کے نام خط میں لکھا کہ "وفد کی خواہش کے مطابق میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نئے آئین کے نفاذ کے بعد ہی آزادی دی جائے گی نہ کہ آئین کے نفاذ سے قبل۔"

20 مئی کو گاندھی کی ہریجن میں لکھی گئی تحریر

گاندھی کی مشن منصوبے کے متعلق ایک تحریر جو 20 مئی کو ہریجن میں چھپا کچھ اس طرح ہے:

"یہ ایک اپیل ہے ایک مشورہ ہے۔ اس میں کوئی جبر نہیں ہے۔ چنانچہ صوبائی اسمبلیاں چاہیں تو (آئین ساز اسمبلی کے لیے) ارکان منتخب کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ یہ منتخب ارکان چاہیں تو آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوں اور چاہیں تو نہ ہوں۔ اسمبلی اپنے اجلاس میں اس طریقہ کار سے مختلف طریقہ کار بھی وضع کر سکتی ہے جو (مشن کے) دستاویز میں وضع کیا گیا ہے۔ صرف صورت حال کے تقاضے کے مطابق کسی شخص یا فریق کو پابند کیا جا سکے گا۔ دونوں بڑے فریقین کے لیے جداگانہ رائے دہی کی پابندی بھی صرف اسمبلی کی بقا کی خاطر لگائی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تادم تحریر میں نے اس دستاویز

کی ایک ایک شق کو بار بار پڑھا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانونی طور پر اس میں کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ صرف وقار اور تقاضا دو ہی لازمی قوتیں ہیں۔"

گروپنگ پر اعتراض کرتے ہوئے انھوں نے لکھا" کیا سکھ جن کا گھر ہندوستان میں سوائے پنجاب کے اور کہیں نہیں ہے، اپنی مرضی کے خلاف ایسے گروپ میں شامل ہونا قبول کرلیں گے جو سندھ، بلوچستان اور سرحد پر مشتمل ہے؟ اور صوبہ سرحد اپنی مرضی کے خلاف پنجاب کے ساتھ گروپ میں شامل ہو جائے گا؟ اور اسی طرح کیا آسام جو کہ غیر مسلم اکثریت کا صوبہ ہے، گروپ ج میں شامل ہو جائے گا؟ میری رائے میں دستاویز کی رضاکارانہ حیثیت کا تقاضا ہے کہ انفرادی یونٹوں (صوبوں) کی آزادی میں خلل نہیں پڑنا چاہیئے۔ گروپوں کا کوئی بھی رکن چاہے تو گروپ میں شامل ہو چاہے تو نہ ہو۔"(71)

اسی روز یعنی 20 مئی کو آزاد کی طرف سے بھی مشن کے ارکان کو خط ملا اس کا نفسِ مضمون بھی وہی تھا زاہد چوہدری، پیارے لال کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آزاد کی بطور صدر کانگرس حیثیت کٹھ پتلی کی تھی اس کی جانب سے (آزاد کی جانب سے) مشن کو لکھے گئے بیشتر خطوط اور کانگرس کے قراردادوں کا مسودہ گاندھی تیار کرتا تھا اور وہ صرف دستخط کرتا تھا۔

22 مئی کو مشن کا کانگرس کو جواب

22 مئی کو کانگرس کے صدر آزاد کو مشن کی جانب سے ایک مؤثر مراسلہ بھیجا گیا جس میں لکھا گیا کہ:

"یہ سکیم من حیث کل میں ہی اپنا وجود رکھتی ہے اور صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ مفاہمت اور تعاون کے جذبے سے اس پر عمل کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی گروپنگ کی کیا وجوہات ہیں اور یہ اس سکیم کی ایک لازمی خصوصیت ہے، جس میں ردوبدل صرف دونوں پارٹیوں کی باہمی رضامندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔"(72)

24 مئی کو کانگرس مجلسِ عاملہ کی قرارداد- سکیم کی کانگرسی تعبیر

مشن کے 22 مئی کے جواب کے بعد مشن منصوبے پر اعتراض کرتے ہوئے 24 مئی کو کانگرس مجلسِ عاملہ نے ایک قرارداد کچھ اس طرح منظور کی۔

"وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے جاری کردہ دستاویز میں بعض سفارشات کی گئی ہیں اور ان میں آئین ساز اسمبلی کی استواری کے طریقہ کار کے بارے میں بعض تجاویز دی گئی ہیں جو کہ، جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے، ایک خود مختار حیثیت کی حامل ہیں۔ مجلس عاملہ ان بعض سفارشات کے ساتھ اتفاق نہیں کرتی۔ اس کی رائے میں آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ بذات خود جس مرحلے پر چاہے ترامیم اور تبدیلی کرے۔ صرف بعض فرقہ وارانہ مسئلوں پر یہ شرط ہوگی کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے دونوں فرقوں کی کثرت رائے درکار ہوگی۔"

صوبوں کی خود مختاری کے حوالے سے کہا گیا کہ "ایک جانب تو مشن کہتا ہے کہ صوبے خود مختار ہونگے اور تمام باقی ماندہ اختیارات کے حامل ہونگے اور دوسری جانب کہا گیا کہ صوبوں کے ارکان حصوں میں بٹ جائیں گے اور گروپ بنانے کا فیصلہ کریں گے اور اپنے گروپ کے صوبوں کا آئین وضع کریں گے اس طرح صوبائی خود مختاری پر جبر کا عنصر مسلط کر دیا گیا۔"

آگے مجلس عاملہ نے پیرا15 کی تشریح کچھ اس طرح کی "سب سے پہلے متعلقہ صوبے یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ خود کو اس گروپ میں شامل رکھیں گے یا نہیں کہ جس میں انھیں شامل کیا گیا، چنانچہ آئین ساز اسمبلی کو ایک خود مختار ادارہ سمجھنا چاہیئے جس کو آئین تشکیل دینے اور اس کو لاگو کرنے کے حتمی اختیارات حاصل ہونگے۔"(73)

مشن کی جانب سے کانگرس مجلس عاملہ کی قرارداد اور تشریح کی تردید

25 مئی کو مشن اور وائسرائے کی طرف سے کانگرس مجلس عاملہ کی قرارداد کی تردید میں بیان کچھ اس طرح جاری ہوتا ہے:

"یہ سکیم من حیث کل میں ہی اپنا وجود رکھتی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے تعاون کے جذبے کے ساتھ قبول کیا جائے اور اسی جذبے سے اس پر عمل کیا جائے۔"

کانگرس نے اپنی قرارداد میں ہماری دستاویز کے پیرا15 کی جو توضیح کی ہے کہ صوبوں کو شروع میں ہی یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ اس گروپ میں شامل ہیں یا نہیں کہ جس میں انھیں شامل کیا گیا ہے، مشن کے منشا کے خلاف ہے۔ صوبوں کی گروپنگ کی وجوہات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں اور یہی اس سکیم کی لازمی خصوصیت

ہے اور اس میں ردوبدل صرف دونوں پارٹیوں کی باہمی رضامندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔"(74)

گاندھی اور کانگرس کے مجلسِ عاملہ قرارداد کے یہ ایک بہت واضح تردید تھی جو مشن اور وائسرائے نے جاری کی جس میں بتایا گیا کہ یہ سکیم من حیث کل ہی اپنا وجود رکھتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی بھی فریق اپنی مرضی اور پسند کی چیزیں اٹھا کر باقی سکیم کو مسترد کر دے۔

اس سلسلے میں نیوز کرانیکل لندن کے نمائندے نارمن کلف نے ایک انٹرویو میں گاندھی سے پوچھا:

اس (یعنی مشن) کی وہی توضیح کیوں نہ درست مانی جائے جو وہ خود کرتے ہیں۔ اس بارے میں تو وہ خود ہی بہترین منصف ہیں کہ ان کی منشا کیا ہے؟

گاندھی: قانون بجا طور پر کسی قانون ساز کی اس منشا کو قبول نہیں کرتا جو مسودہ قانون سے باہر ہو۔

نارمن کلف: منشا واضح کرنے کے لیے کیا اس دستاویز کے الفاظ میں ردوبدل نہیں کیا جا سکتا؟

گاندھی: یہ ناممکن ہے۔ اس طرح متواتر کانٹ چھانٹ ہوتی رہے گی۔

کلف: کیا الفاظ کے بجائے منشا کا مفہوم لینا زیادہ بہتر نہیں ہو گا؟

گاندھی: یہ وہ سوال ہیں جن کا فیصلہ عدالت کرے گی۔

کلف: کیا نفی ذات آپ کے بنیادی عقائد کا جزو نہیں ہے؟

اس پر گاندھی نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا "شیطان بھی صحیفوں کے حوالے دے سکتا ہے(75)

مسلم لیگ کا ردِ عمل

16 مئی کو مشن ارکان نے لیگی رہنماؤں کو جو یقین دہانیاں کرائی تھیں وہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں اب آگے بڑھتے ہوئے دیکھیں گے کہ مسلم لیگ کا بحیثیت پارٹی مشن منصوبے کے بارے میں کیا ردِ عمل تھا۔

24 مئی کو کرپس کے سیکرٹری میجر ووڈر ویاٹ نے جناح صاحب سے ملاقات کی اور گفتگو کے دوران ان کا موڈ سمجھنے کے لیے کہا کہ کیا یہ ممکن ہو گا کہ مسلم لیگ اس کی ورکنگ کمیٹی اس طرز کی قرارداد منظور کرے؟

"حکومت برطانیہ نے پاکستان کی خوبیوں پر رائے دے کر غیر مناسب حرکت کی ہے۔ انھیں کروڑوں لوگوں کے مطالبے کو مسترد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ان کا پاکستان کے بارے میں تجزیہ نہایت افسوسناک تھا۔ لیکن مسلمانوں نے کبھی بھی کسی سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ انھیں پاکستان دے دے گا۔ وہ جانتے ہیں کہ انھیں پاکستان اپنے زور بازو سے حاصل کرنا ہے۔ کیبنٹ مشن پلان میں دی گئی سکیم ناقابل عمل ہے اور یہ

کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مشینری کام نہیں کر سکتی، وہ پلان کو قبول کریں گے تا کہ وہ ثابت کریں کہ وہ اسے موقع دینا چاہتے ہیں اور وہ ہرگز اسے ناکام بنانے کی کوشش نہیں کریں گے، لیکن وہ اس بیان یعنی منصوبے کو پاکستان کی راہ پر پہلا قدم سمجھ کر قبول کریں گے"

یہ تجویز سن کر جناح صاحب خوش ہو گئے اور کہا "تم میرا مُدعا اچھی طرح سمجھ گئے ہو اور مجھے یقین ہے کہ مسلم لیگ ایسا ہی کرے گی۔"

03جون کو جناح ویول ملاقات اور یقین دہانیاں

"3جون کو صبح دس بجے ویول کی جناح صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ جناح صاحب نے ایسے حالات (لیگ سکیم کو قبول کرے اور کانگرس رد کر دے) پیدا ہونے کی صورت میں مسلم لیگ کے لیے یقین دہانی طلب کی۔ ویول نے کہا کہ:

> "میں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ مسلم لیگ کو اس کا حصہ دیا جائے گا۔" جناح نے کہا کہ اگر اس کے بارے میں تحریری طور پر یقین دہانی مل جائے تو میں اپنی مجلس عاملہ کے ساتھ سہولت سے بات کر سکوں گا جس کے ساتھ آج شام 6 بجے میری ملاقات طے ہے۔ اس پر ویول نے کہا کہ اس کے لیے مجھے مشن کے ارکان سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ 11 بجے ویول نے مشن کے ارکان کے ساتھ اجلاس میں یہ معاملہ اٹھایا۔ مشن کے ارکان نے بقول ویول "مجھے اس امر کی اجازت دے دی کہ میں جناح کو زبانی طور پر یقین دہانی کرا دوں کہ اگر مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کر لیا تو ہم مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔"

یعنی اسے حکومت میں لے لیں گے۔ بعد از دوپہر ویول نے مشن کے ارکان سے اس زبانی یقین دہانی کے مسودے کی بھی منظوری حاصل کر لی اور پھر سہ پہر 4 بجے جناح کے ساتھ دوبارہ ملاقات کی اور انھیں فائل میں لگی ہوئی یہ تحریر پڑھنے کے لیے دی:

> "وزارتی مشن آپ کو تحریری یقین دہانی نہیں کر سکتا کہ مُجوزہ مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا لیکن میں وزارتی مشن کی جانب سے آپ کو یہ ذاتی یقین دہانی کراتا ہوں کہ ہم کسی پارٹی کے ساتھ سلوک میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھیں گے اور یہ کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک پارٹی نے بھی وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کر لیا تو

جس قدر حالات اجازت دیں گے ہم اس منصوبہ پر عمل درآمد شروع کر دیں گے۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ دونوں پارٹیاں اسے قبول کریں گی۔"(76)

لیگ کی طرف سے مشن منصوبہ کی منظوری

لیگ کونسل کا اجلاس ہوتا ہے۔ کونسل کے آخری اجلاس میں جناح صاحب نے ایک طویل تقریر کی اور کہا:

"I advised you to reject the Cripps proposal, I advised you to reject the last Shimla Conference formula. But I cannot advise you to reject the British Cabinet Mission's proposal. I advise you to accept it."

"میں نے آپ سے کرپس تجاویز رد کرنے کو کہا تھا، میں نے آپ سے شملہ کانفرنس فارمولا رد کرنے کے لیے بھی کہا تھا لیکن میں برطانوی وزارتی مشن کی تجاویز کو رد کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے قبول کر لیا جائے۔"

جناح صاحب نے مزید کہا:

"The Lahore Resolution did not demand that when Muslims put forward demand, it must be accepted at once. It is a big struggle and a continued struggle. The first struggle was to get the representative character of the League accepted. That fight they have started and they had won. Acceptance of Mission's proposal was not the end of their struggle for Pakistan. They should continue their struggle till Pakistan was achieved."

"قراردادِ لاہور کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جونہی مسلمانوں نے یہ مطالبہ پیش کیا اسے فوراً تسلیم کر لیا جائے گا۔ یہ ایک بڑی اور مسلسل جدوجہد ہے۔ پہلی جدوجہد یہ تھی کہ لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کروایا جائے ہم نے یہ لڑائی لڑی اور جیتی۔ مشن منصوبہ قبول کرنے سے پاکستان کی جدوجہد کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ آپ حصولِ پاکستان تک اس جدوجہد کو جاری رکھ سکتے ہیں۔"

6 جون کو رات گئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس قرارداد میں مشن کی جاری کردہ دستاویز کے ابتدا میں مطالبہ پاکستان کے خلاف جو مؤقف

اختیار کیا گیا تھا، اس کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ:

"آل انڈیا مسلم لیگ اعادہ کرتی ہے کہ پوری طرح خود مختار پاکستان کے حصول کا مقصد اب بھی مسلمانانِ ہند کا ناقابل ترمیم نصب العین ہے۔ جس کے حصول کی خاطر اگر ضروری ہوا تو وہ اپنے بس میں سارے ذرائع بروئے کار لائیں گے اور کسی قربانی یا تکلیف کو خاطر میں نہ لائیں گے۔"

منصوبہ قبول کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی گئیں:

"The Muslim League having regard to the grave issues involved, and prompted by its earnest desire for a peaceful solution, if possible, of the Indian constitutional problem, and in as much as the basis and the foundation of Pakistan are inherent in the Mission plan, by virtue of the compulsory grouping of the six muslim provinces in sections B and C is willing to cooperate with the constitution marking machinery proposed in the scheme outlined by the Mission in the hope that it will ultimately result in the eastablishment of complete sovereign Pakistan."

"مسائل بہت سنگین ہیں اور مسلم لیگ انڈیا کے آئینی مسائل کے پرامن حل کی خواہاں ہے مزید یہ کہ منصوبے میں پاکستان کے قیام کی بنیاد موجود ہے کیونکہ مسلم اکثریت کے چھ صوبوں کی دو گروپوں ب اور ج کی صورت میں لازمی گروپنگ کی گئی ہے۔ کونسل نے امید ظاہر کی کہ بالآخر یہ منصوبہ مکمل طور پر خود مختار پاکستان کے قیام پر منتج ہو گا۔"

عبوری حکومت میں برابری کا مسئلہ

مسلم لیگ کے وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے پر یہ بات تو واضح ہو گئی کہ لیگ حکومت میں آئے گی خواہ کانگرس منصوبہ قبول کرے یا رد اب مسئلہ کانگرس کا تھا کہ یہ بات ان کے لیے ناقابل قبول تھی کہ یا تو وہ حکومت میں ہی نہ ہوں اور اگر ہوں تو لیگ ان کے برابر 5 نشستوں پر قابض ہو۔

6 جون کو گھنشام داس برلا کی ملاقات وزارتی مشن کے سیکرٹری ایف ایف ٹرنبل سے ہوئی جس میں برلا نے اس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جناح نے عبوری ایگزیکٹو کونسل میں ہندو مسلم برابری کی بات کی۔

اگلے روز پیتھک لارنس اور ویول کے مابین برلا کے مذکورہ خیالات کے بارے میں بات ہوئی تو ویول نے کہا "ہمیں برابری کے معاملے میں ثابت قدم رہنا چاہیئے"(77)

اپنے 6جون کے روزنامچے میں ویول لکھتا ہے کہ:

"Now the real battle begins and the great question is whether the Delegation will stand up to Congress or not. Parity in the Interim Government may be the main issue. I am affriad that Cripps and PL, are so much committed that they will be unable or unwilling to be firm with Congress."

"اصل جنگ اب شروع ہوئی ہے اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کیا مشن کانگرس کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکے گا یا نہیں۔ عبوری حکومت میں مساوات سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کرپس اور پیتھک لارنس اس قدر زیادہ حد تک قول و قرار کر چکے ہیں کہ اب وہ نہ تو اس قابل ہیں اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ کانگرس کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں۔"(78)

10جون کی آزاد اور نہرو کی مشن اور وائسرائے سے ملاقات

"10 جون کو آزاد اور نہرو نے ویول اور مشن کے ارکان کے ساتھ اکٹھے ملاقات کی۔ ایگزیکٹو کونسل کا مجوزہ فارمولا 2:5:5 زیرِ بحث رہا۔ ویول اور ارکان مشن نے اس فارمولے کے حق میں دلائل دیے اور ان دونوں رہنماؤں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ برابری کا اصول ہمیشہ کے لیے رواج نہیں بنے گا۔ اسے عارضی طور پر ایک قرین مصلحت تدبیر کے طور پر اختیار کیا جارہا ہے۔ آزاد نے کہا کہ یہ ایک باہم مربوط حکومت نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ تعطل پیدا کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ پاکستان کے لیے راہ ہموار ہوسکے۔ نہرو نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ "عبوری حکومت کے اثرات آئین ساز ادارے پر پڑیں گے۔ کانگرس ایک مضبوط مرکز کے لیے کام کرے گی اور گروپ سسٹم کا خاتمہ کرے گی اور اس میں کامیاب ہوگی۔ جناح کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں ہے" اس پر اے وی الیگزینڈر نے کہا کہ جناح نے وزارتی مشن قبول کر کے کڑوی گولی نگلی ہے۔ اگر ہندوستان مسئلے کو حل کرنا ہے تو مل جل کر کام کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے کہ دس کروڑ کی مسلمان آبادی متحدہ ہند میں خود کو ضم کر دے جس کی

اکثریت نے حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کی۔"نہرو نے کہا کہ "کانگرس کے لیے توبرابری کے معاملے پر غور کرنا بھی محال ہے کیونکہ اس کے حامیوں میں اس پر شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔"

رخصت ہونے سے پہلے نہرو نے کانگرس کی جانب سے 15 رکنی ایگزیکٹو کونسل کا مطالبہ کر دیا جس میں ایک اچھوت، ایک نیشنلسٹ مسلمان اور ایک ہندوستانی عیسائی کا اضافہ کیا گیا۔ انھوں نے اس بات پر اعتراض کیا تھا کہ کانگرس کی مخصوص پانچ نشستوں میں ایک اچھوت کو بھی شامل کر دیا گیا ہے جس سے اونچی ذات کے ہندوؤں کی نشستوں کی تعداد کم ہو گئی ہے حالانکہ وہ ملک کی سب سے بڑی آبادی ہیں۔"(79)

ویول کے ساتھ ملاقات میں:

"پٹیل نے اسے بتایا کہ نہ صرف میں بلکہ ساری مجلسِ عاملہ وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے اور عبوری حکومت میں شمولیت، دونوں باتوں کے خلاف ہے، کوئی بھی اس کے حق میں نہیں ہے۔ صرف گاندھی مشن منصوبہ قبول کرنے کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔ پٹیل نے کہا اگر ایک مرتبہ برابری کا اصول قبول کر لیا گیا تو اسے زندگی کے ہر شعبے میں اور حکومت کی ہر سطح پر رواج بنا لیا جائے گا۔"(80)

اس گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوے زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ :

"ہندو بورژوا اپنے مقاصد میں اختلاف نہیں رکھتی تھی صرف اس کے حصول کے لیے طریقہ کار پر نکتہ نظر کا اختلاف ہوتا تھا۔ اور وہی نقطہ نظر کامیاب ہوتا تھا جو ان کے بہترین مفاد میں ہوتا تھا چنانچہ گاندھی نے اپنا "قانونی ذہن "استعمال کر کے جو راہ نکالی اور جو بالآخر اختیار کی گئی وہ پٹیل سے مختلف تھی۔ گاندھی کا مؤقف تھا کہ مشن منصوبہ قبول کر کے مسلم لیگ حکومت میں آنے کی حقدار بن چکی ہے اور ایسا نہ کر کے کانگرس نے اپنا استحقاق قائم نہیں کیا ہے۔ جہاں تک مشن منصوبے کا تعلق ہے تو اسے قانونی تشریحات و توضیحات کے ذریعے سے بالآخر فیڈرل کورٹ کے ذریعے اپنے حسب منشا ڈھالا جا سکتا اور گروپنگ کو سبوتاژ کیا جا سکتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ لیگ اکیلے حکومت نہ سنبھال سکے گی اور نہ ہی برطانوی حکمران کانگرس کو باہر رکھ کر مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی منظوری دیں گے۔ بشرطیکہ کانگرس مشن منصوبہ منظور کر کے لیگ کے استحقاق کو زائل کر دے۔ اس بارے میں اس کے "روحانی ہم مشربوں" نے اسے یقین دہانیاں کرائی ہوئی تھیں۔"

"12 جون کو پیتھک لارنس نے ایٹلی کے نام مراسلے میں دریافت کیا کہ کیا لیگ کے ارکان کو ساتھ لیکر کانگرس کے بغیر ایگزیکٹو تشکیل دی جاسکتی ہے اور اس کے نتائج جن سے آگاہ کیا جاچکا، قابل قبول ہونگے؟

13 جون کو پارلیمانی نائب وزیر ہند آرتھر ہینڈرسن نے اس سلسلے میں ایٹلی کے نام اپنے نوٹ میں لکھا کہ اگر یہ راستہ اختیار کیا گیا تو وہ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کا مشن اور وائسرائے کے مجوزہ ہنگامی منصوبے میں تذکرہ کیا گیا ہے اور جس کو اختیار کرنے کے بارے میں کابینہ نے پسندیدگی ظاہر نہیں کی۔ تاہم ہندوستان کا جو عنصر بھی تعاون پر آمادہ ہو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اور اس لحاظ سے ویول نے جناح کو جو یقین دہانی کرائی ہے وہ بھی حق بجانب ہے۔"(81)

ایگزیکٹو میں مساوات کو ختم کرنے کا کانگرسی مطالبہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کانگرس کے نشستوں کی تعداد 5 سے بڑھا کر 6 کر دی جاتی ہے، جناح صاحب کو بھی قائل کیا جاتا ہے۔ لیکن کانگرس کی مجلس عاملہ نے 13 رکنی ایگزیکٹو کونسل کو بھی مسترد کر دیا اور ان کے مطابق ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد 15 ہونی چاہیئے۔

کانگرس کی جانب سے تیرہ رُکنی ایگزیکٹو کی تجویز مسترد کیے جانے پر وائسرائے اور مشن کے ارکان نے سوچا کہ مزید مفاہمت کی کوششیں بے سود ہیں بہتر ہو گا ہم خود ایگزیکٹو کے ارکان کا اعلان کریں جن کی تعداد 13 کے بجائے 14 ہو۔

وائسرائے کی جانب سے 14 رکنی ایگزیکٹو پر مبنی اعلان

16 جون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنی طرف سے 14 رکنی ایگزیکٹو پر مبنی اپنا اعلان جاری کیا۔ اس میں کانگرس کے 6، لیگ کے 5، ایک سکھ ایک ہندوستانی عیسائی اور ایک پارسی شامل تھا۔"

16 جون کے اس اعلان کا پیراگراف 8 سب سے زیادہ اہم تھا جو بعد میں متنازعہ صورت اختیار کر گیا۔ اس میں کہا گیا تھا:

"اگر دونوں پارٹیوں یا دونوں میں سے کوئی ایک مذکورہ خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل میں شمولیت اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وائسرائے اس کے باوجود عبوری حکومت کی تشکیل کرے گا جو ان عناصر کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرے گی جو 16 مئی کے منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔"(82)

دوسرے لفظوں میں یہ ایک واضح وعدہ تھا کہ اگر کانگرس نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کیا تو

مسلم لیگ اور دوسرے عناصر کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی کیونکہ 16 مئی کے پلان کو صرف مسلم لیگ نے ہی قبول کیا ہوا تھا کانگرس اور گاندھی ابھی تک منصوبے کی اپنی من مانی تشریح و توضیح میں مصروف تھی۔اب کانگرس کے پاس دو آپشن تھے یا تو منصوبہ قبول کر کے لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت بنائے یا پھر لیگ کو حکومت بنانے دے۔

17 جون کو کانگرس مجلسِ عاملہ کا اجلاس

17 جون کو کانگرس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں، فوری طور پر تین تبدیلیوں کے ساتھ، مجوزہ ایگزیکٹو میں کچھ ردوبدل کے ساتھ قبول کرنے کا رجحان پایا جاتا تھا۔

ایک تو یہ کہ کانگرس کی نشستوں میں سے ایک نشست پر اڑیسہ کے کانگرسی وزیر اعلیٰ ہرے کرشن مہتاب کو مقرر کیا گیا تھا، وہ اس کی جگہ سرت چندر بوس کا تقرر چاہتے تھے۔

دوسرے ان کو مسلم لیگ میں سے ایک پر سردار عبدالرب نشتر کی تقرری پر اعتراض تھا کیونکہ وہ سرحد میں کانگرس کے مقابلے میں انتخاب ہار گیا تھا۔

تیسرا اعتراض گاندھی نے اٹھایا تھا کہ چونکہ اب برابری کا معاملہ نہیں رہا ہے، اس لیے حکومت کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت ظاہر کرنے کے لیے اس میں ایک غیر لیگی غیر کانگرسی مسلمان کو کانگرس کے کوٹے کی نشستوں پر مقرر کیا جائے۔اس کے لیے اس نے ذاکر حسین کا نام تجویز کیا۔

زاہد چوہدری کے مطابق یہ وہ شرارت آمیز تجویز تھی جو گاندھی جانتا تھا جناح کبھی قبول نہیں کریں گے۔ سیروائی اس بارے لکھتے ہیں کہ "شائع شدہ دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان کے مسئلے کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کامیاب ہو جاتی اور اسے کانگرس خاموشی سے قبول کر لیتی اگر گاندھی "حق" اور "فرض" کا فرق ظاہر کر کے اس کوشش کو ناکام نہ بنا دیتے۔اگر یہ کانگرس کا محض حق ہے کہ وہ نیشنلسٹ مسلمان کو نامزد کرے تو اس سے درگزر کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ نیشنلسٹ مسلمان کی جانب ہمارا فرض بنتا ہے تو پھر دوسرا معاملہ ہے۔

18 جون، جناح ویول ملاقات

18 جون کو ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات میں جب کانگرس کے مبینہ اعتراضات سے آگاہ کیا تو بقول ویول:

"He accepted the substitution of Bose for Mahtab but said that Zakir

Hussain, whom he characterized as a Quisling would be utterly and entirely unacceptable."

اس نے مہتاب کی جگہ سرت بوس کی شمولیت کو قبول کیا لیکن ذاکر حسین کے متعلق، جسے اس نے غدار قرار دیا تھا، اس نے کہا کہ "یہ مطلقاً کلیۃً ناقابل قبول ہے۔"(83)

ظاہر ہے حالیہ انتخابات میں جس طرح لیگ نے سویپ کر دیا تو وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھی کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

چنانچہ مسلم لیگ مجلسِ عاملہ نے اسی روز اپنے اجلاس میں فیصلہ کر کے ویول کو آگاہ کیا کہ اگر مسلم لیگ کے علاوہ کسی مسلمان کو نامزد کیا گیا تو مسلمانانِ ہند کی جانب سے اس پر شدید ردِ عمل ہو گا، ہمارے نزدیک یہ نہایت اہم اور بنیادی بات ہے۔(84)

20جون کو کانگرس مجلسِ عاملہ کا اجلاس

اور گاندھی کا نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر اصرار

مہاتما جو "حق" اور "فرض" کا مسئلہ کھڑا کر کے کسی صورت معاملہ حل نہیں ہونا دینا چاہتے تھے اس نے مجلسِ عاملہ کو حتمی نوٹس دیا کہ اگر نیشنلسٹ مسلمان شامل نہ کرنے اور پی این انجینئر کو شامل کرنے کے حق میں مجلسِ عاملہ نے منظوری دے دی تو اس کا اس پورے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو گا اور وہ دہلی چھوڑ کر چلیں جائیں گے۔ راج گوپال اچاریہ نے مشن کو بتا دیا کہ مجلسِ عاملہ میں ذاکر حسین کی جگہ آزاد کو شامل ہونا چاہیے جس نے پہلے تو شامل ہونے سے انکار کیا پھر جب گاندھی نے سختی سے دباؤ ڈالا تو وہ رضامند ہو گیا۔

اس دوران کرپس گاندھی سے ملتے ہیں گاندھی کے وہی روایتی حربے جاری ہیں کہ کسی بھی طرح معاملے کا کہیں پر امن تصفیہ نہ نکل آئے۔ کرپس کو کہتے ہیں کہ تم لوگوں کا حکومت بنانے کا طریقہ ہی غلط ہے۔ مخلوط حکومت انگریزوں کو نہیں تھوپنا چاہیے چاہے تعطل ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ کرپس نے کہا اب اتنی دور آنے کے بعد نئے سرے سے معاملات شروع کرنا مشکل ہو گا تو گاندھی کا جواب تھا تو پھر مشن اپنی مرضی کرے میرا اس سے کوئی سروکار نہیں ہو گا۔

باپو جب کہتا تھا کہ مخلوط حکومت ہم پر نہ تھوپی جائے تو اس کی منافقت بڑی واضح تھی کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا برطانوی کسی صورت کانگرس کو نظر انداز نہیں کر سکتے دوسرے لفظوں میں وہ یہی کہہ رہے تھے کہ اقتدار کانگرس کے حوالے کر دو۔

"20جون کو کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں پیارے لال کے مطابق (باپو نے نیشنلسٹ مسلمان شامل کیے جانے پر اپنے مؤقف کا اعادہ کیا۔ سردار پٹیل نے اس کی پرزور تائید کی اور کہا کہ ہم باپو سے روگردانی کر کے وزارتی مشن کے ساتھ معاملات طے کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ آخر میں طے پایا کہ باپو کا تیار کردہ ڈرافٹ وزارتی مشن کو بھیجا جائے"(85)

ان حالات میں پیتھک لارنس نے 20جون کو بذریعہ مراسلہ ایٹلی کو اطلاع دی کہ:

"کانگرس مجلس عاملہ ایگزیکٹو کو قبول کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن گاندھی نے نیشنلسٹ مسلم کی شمولیت پر اصرار کر کے مجلس عاملہ کے فیصلے کو الٹ دیا ہے۔ اور اب یوں لگتا ہے کہ کانگرس کی طرف سے آزاد کے تقرر کے مطالبہ کے نتیجے میں مذاکرات ٹوٹ جائیں گے۔"(86)

اسی صورت حال کے بارے میں ڈپٹی نائب وزیر ہند ڈبلیو کرافٹ نے جو مشن کے سٹاف میں ہمراہ آیا تھا، نائب وزیر ہند آرتھر ہینڈرسن کے نام 22جون کو اپنے مراسلے میں لکھا:

"لیکن آخری لمحے پر اس بڈھے (گاندھی) کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے ساری کایا پلٹ گئی جس نے بلاشبہ خود کو اس سارے معاملے میں نابغہ بد ثابت کیا ہے۔ مجلس عاملہ کی اکثریت پہلے بھی اور بعد میں بھی نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر زور دینے کے خلاف تھی اور خود مجلس عاملہ کے دو نیشنلسٹ مسلمان ارکان یعنی آزاد اور آصف علی بھی اس معاملے اکثریت کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن بڈھے نے یہ ضد کر کے اس معاملے کو پھر ایک بار طول دے دیا کہ میرے لیے یہ اصول کا سوال ہے کہ کانگرس کو کل ہند پارٹی کی حیثیت سے کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اب واقعی یہ اصول کا سوال ہے یا یہ کہ مخلوط حکومت بنانے کے تصور کے ہی خلاف ہے، واضح نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ یہ موقف اختیار کیے رہا ہے کہ حکومت کانگرس کی ہو یا لیگ کی، مربوط ہونی چاہیئے مخلوط نہیں۔ وہ لیگ کی حکومت ماننے کے لیے آمادہ ہے۔ بشرطیکہ دوسرے بھی آمادہ ہوں۔ لیکن بلاشبہ اس کے خیال میں لیگ کی حکومت زیادہ عرصہ نہ نکال سکے گی اور اس کی ناکامی کے نتیجہ میں خالص کانگرسی حکومت وجود میں آجائے گی جو یقیناً اس کی اور بیشتر کانگرسیوں کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔"(87)

22 جون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے اجلاس میں اس ڈیڈلاک کو توڑنے کے لیے اقدام پر غور کیا کافی بحث مباحثہ کے بعد ویول کی طرف سے آزاد کے نام ایک مسودہ ارسال کیا گیا "اس (مسودے) میں عبوری حکومت میں کانگرس کی مخصوص نشستوں پر لبنی مرضی سے کسی مسلمان کے تقرر کے بارے میں صاف طور پر کہا گیا کہ "جن اسباب سے آپ بخوبی واقف ہیں ان کے پیش نظر وزارتی مشن اور میرے لیے آپ کی یہ درخواست قبول کرنا ممکن نہیں۔" مزید کہا گیا کہ جیسا کہ 16 جون کے اعلان میں بھی واضح کر دیا گیا ہے، عبوری حکومت کی ہیت ترکیبی کو مستقبل کے لیے مثال نہیں بنایا جائے گا اس لیے "ہم کانگرس سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مطالبے پر زور نہ دے اور مضبوط عبوری حکومت میں شرکت اختیار کرے جس کی کہ ملک کو اشد ضرورت ہے۔"(88)

23 جون کو وائسرائے اور مشن کے ارکان نے نہرو، پٹیل، آزاد اور راجندر پرشاد سے ملاقات کی جس میں اے وی الیگزینڈر نے کہا کہ 16 جون سے پیشتر مسئلہ صرف برابری کا تھا جس کو حل کرنے کے لیے واضح طور پر کانگرس کے لیے 6 ہندو نشتیں رکھی گئیں اور یہ کئی روز تک بات چیت اور خط و کتابت میں زیر بحث رہیں تب نیشنلسٹ مسلمان کا معاملہ نہ اٹھایا، جب 16 جون کو ہم نے اعلان جاری کر دیا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساری دنیا کے سامنے یہ ایک انتہائی المناک بات ہو گی کہ اتنے طویل مذاکرات اس طرح اس بات پر آ کر ٹوٹ جائیں"(89)

لیکن کانگرسی رہنما بدستور اپنی ضد پر قائم رہے۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کے بارے میں جناح صاحب کا مؤقف

مشن منصوبے سے ہٹ کر ذرا ایک نظر نیشنلسٹ مسلمانوں بارے جناح صاحب کی رائے پر نظر ڈالتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر شدت سے اس کی مخالفت کرتے تھے۔ آئے ذرا گہرائی سے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔
پچھلے صفحات میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ جناح صاحب نے کہا کہ گول میز کانفرنس کے دوران مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا جھٹکا لگا جناح صاحب کے مطابق مسلمانوں کی لیڈر شپ کی حالت یہ تھی کہ وہ یا تو انگریزوں کے خوشامدی اور کاسہ لیس تھے یا پھر کانگرس کے حاشیہ بردار۔ جب بھی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش کی گئی، یہ دونوں عناصر ان کے آڑے آئے اور تنظیم کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔
جناح صاحب مایوس ہو کر لندن میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔ واپس آتے ہیں ایک بار پھر وہ مسلمانوں کو

منظم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہندو مسلم اتحاد سے مکمل مایوس ابھی بھی نہیں۔ یہاں تک کہ 1937ء کے الیکشن آتے ہیں جس میں کانگرس نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی اور مسلم لیگ اور وہ جناح کے تعاون کے لیے بڑھائے گئے ہاتھوں کو حقارت سے جھٹک دیتے ہیں جس کا تذکرہ پہلے آچکا۔

کانگرس اور کانگرسی لیڈر شپ کے مطابق کانگرس ایک قومی پارٹی ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے حقوق بھی ان کے ہاتھوں محفوظ ہیں۔ وہ مسلم لیگ کو اس معاملے میں سرے سے پارٹی ہی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ نہرو نے 1937ء کے الیکشن کے بعد کہا کہ مسلم لیگ ایک فرقہ وارانہ پارٹی ہے۔ نہرو کی ذہنیت کا اندازہ جناح صاحب کے ساتھ خط و کتابت سے بھی ظاہر ہوتا ہے جس میں وہ بار بار سوال اٹھاتے ہیں مجھے ابھی تک سمجھ نہیں آرہی کہ مسئلہ ہے کیا؟ ان خطوط کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔

جناح صاحب کے مطابق دنیا کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ کانگرس ایک قومی پارٹی ہے کانگرس نے اپنے ساتھ آزاد اور اس جیسے دوسرے لوگ شامل کئے ہوئے ہیں جن کی رائے کی کانگرس میں کوئی اہمیت نہیں ہوا کرتی اسی لیے جناح صاحب نے آزاد کو بطور کانگرس صدر "شو بوائے" کہہ کر مخاطب کیا۔ کانگرس ایک پرانی اور طاقتور جماعت تھی اس کے لیے دوسری پارٹیوں کے بندے توڑنا بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا جو کہ انھوں نے کیا بھی۔ آپ 1937ء میں دیکھیں کہ لیگ کے ارکان کو وزارت کی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی اور یہ کرنے والا کوئی اور نہیں امام الہند ہی تھا۔ صرف 1937ء ہی نہیں 1946ء میں پنجاب میں اکثریت کے باوجود اسی امام الہند نے شرمناک کردار ادا کرتے ہوئے، اکالیوں، یونینسٹوں اور ہندوؤں کے بھان متی کا کنبہ ساتھ ملا کر جس طرح اکثریتی پارٹی ہونے کے باوجود لیگ کو اقتدار سے محروم کیا اس سے جناح صاحب کے خدشات درست نظر آتے ہیں کہ اقلیتی پٹھو ساتھ ملا کر کانگرس مسلمانوں کے حقوق پر کسی بھی وقت ڈاکہ ڈال سکتی ہے۔

پنجاب میں 46-1945ء کے الیکشن میں 86 مسلم حلقوں میں سے مسلم لیگ نے 79 سیٹیں جیتیں تھیں۔ امام الہند نے پنجاب میں ڈیرے ڈالے اور بے شرمی کے ساتھ برطانوی پٹھوؤں یونینسٹوں، فرقہ پرست اکالیوں اور ہندوؤں کے بھان متی کا کنبہ ملا کر انگریز گورنر گلینسی کی سرپرستی میں مسلم لیگ جو کہ اکثریتی پارٹی تھی، اس کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ اور موصوف اپنی اس شرمناک حرکت پر شرمندہ ہونے کے بجائے اپنی کتاب میں فخریہ لکھتے نظر آئے کہ:

"میری کوشش سے مسلم لیگ الگ تھلگ ہو گئی اور کانگرس نے اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔" کیا لیگ

برطانوی پٹھوؤں کی جماعت یونینسٹس اور فرقہ پرست اکالیوں سے بھی رجعت پسند تھی جن کے ساتھ اتحاد کر کے امام الہند نے حکومت بنا کر اکثریتی لیگ کو اقتدار سے محروم کر دیا؟

موصوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"گورنر شخصی طور پر مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے، مگر انھوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی اور صورت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ خضر حیات خان کو حکومت کی تشکیل کے لیے مدعو کیا جائے۔"

لیکن غیر جانبدار ذرائع کچھ اور کہتے ہیں مثلاً برطانوی آفیسر پینڈرل مون اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ مسلمان سمجھتے تھے یہ "ناپاک گٹھ جوڑ" گورنر کی سرپرستی میں حکومت بنانے میں کامیاب ہو گیا:

"The Muslim league, fresh from there triumph at the elections and fully expecting to form a ministry themselves, found themselves totally excluded by an undreamed of combination of Congress banias, Khizer and the Sikhs. Not only the League but the whole Muslim community felt outraged and affronted. This unnatural and unholy alliance seemed to have been designed with the connivance of the British Governor, simply to keep them from power.

"مسلم لیگ نے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی اور وہ وزارت بنانے کی توقع کرتی تھی لیکن کانگرسی بنیوں، خضر حیات اور سکھوں کے ایک ایسے گٹھ جوڑ نے انھیں اس حق سے بالکل محروم کر دیا تھا جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ نہ صرف مسلم لیگ بلکہ سارے مسلم فرقے نے اس پر بہت برا منایا۔ انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ غیر فطری اور ناپاک گٹھ جوڑ انگریز گورنر کی امداد سے محض اس لیے وجود میں آیا ہے کہ انھیں اقتدار سے محروم رکھا جائے۔"(90)

موصوف فرماتے ہیں کہ گورنر مسلم لیگ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود اکثریتی پارٹی اقتدار میں نہیں آتی۔ پنڈرل مون گورنر رول کے بارے میں حیرت زدہ ہو کر لکھتے ہیں کہ:

"It was amazing that the Governor acquiesced without the slightest struggle in the formation of a Ministry so harmful to the public interests."

"حیرت انگیز بات یہ تھی کہ گورنر نے ایسی وزارت کی تشکیل کی ذرا سی مزاحمت نہ کی جو مفاد عامہ کے لیے اس قدر نقصان دہ تھی۔"(91)

زاہد چوہدری، آئین سٹیفنز کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلم لیگیوں کے علاوہ بعض غیر جانبدار برطانوی مبصرین نے بھی گورنر گلینسی کی اس کاروائی پر نکتہ چینی کی تھی۔ گلینسی کے یونینسٹوں سے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ نئی مخلوط وزارت مختلف النوع عناصر کا مجموعہ تھی اور اس کی تشکیل بہت جلدی میں کی گئی تھی۔ یہ غلطی بعد میں پنجاب میں بہت حد تک تباہی کا باعث بنی۔

پنڈرل مون مزید لکھتے ہیں کہ:

"From the public point of view it was a disaster; and for Khizer personally it was a political suicide. In every Punjab ministry since the first beginnings of provincial self-government the Muslims had played the leading part, as their numbers entitled them to do. Now for the first time, on the eve of independence , a predominately non-Muslim Government was being installed in power."

"اس مخلوط وزارت کی تشکیل عوام کے نکتہ نگاہ سے تباہ کن تھی اور خود ذاتی طور پر خضر حیات کی سیاسی خودکشی کے مترادف تھی۔ جب سے صوبوں کو سیاسی حقوق ملے تھے پنجاب کی ہر وزارت میں مسلمانوں نے نمایاں کردار ادا کیا تھا کیونکہ صوبہ میں ان کی اکثریت تھی۔ اب پہلی مرتبہ، جب کہ آزادی ملنے والی تھی، پنجاب پر ایک ایسی حکومت مسلط کر دی گئی تھی جس پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا۔"(92)

زاہد چوہدری "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں آزاد کے اس کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"پنجاب کے مسلم عوام اور مسلم لیگ کو اس کے کردار پر بہت غصہ آیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص واقعی ہندو کانگرس کا "شوبوائے" ہے۔ وہ مسلم لیگ کی دشمنی کے جذبے سے اس قدر مغلوب تھا کہ اسے برطانوی سامراج کے بدترین پٹھوؤں اور سکھوں کے فرقہ پرست اکالی دل کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوئی تھی۔"

پنڈرل مون جناح صاحب کے خدشات پر بات کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ:

"It was an example of just the thing that Jinnah always feared and that had prompted the demand for Pakistan. In a united India the wily Hindus would always succeed in this manner in attaching to

themselves a section of the Muslims and using them to defeat the larger interests of the community."

"یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے بارے میں جناح ہمیشہ خدشہ محسوس کرتے تھے اور جو مطالبہ پاکستان کی وجہ بنی تھی۔ خدشہ تھا کہ مکار ہندو ہمیشہ چند مسلمانوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے وسیع تر مفادات کو نقصان پہنچائیں گے۔"(93)

جناح صاحب کو اپنے آپ کو بطور فریق ثابت کرنے کے لیے بڑی طویل اور مشکل جنگ لڑنی پڑی۔ کانجی دوار کا داس لکھتے ہیں 'جب میں جناح سے لیگ سیشن 1940ء کے بعد پہلی دفعہ ملا تو میں نے ان سے کہا کہ سر سکندر حیات خان نے مجھ سے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ ریزولیوشن اصل میں بارگیننگ کاؤنٹر تھا۔ جناح نے جواب دیا میرے دوست !کوئی بارگین یا سودا فریقوں کے درمیان ہوتا ہے گانگرس کو چاہیے کہ وہ مسلم لیگ کو فریق ثانی تسلیم کرے۔"

پاکستان بننے سے پہلے برطانوی صحافی بیورلے نکولس نے "ورڈکٹ آف انڈیا" لکھی اس میں وہ نہرو اور ہندو لیڈرشپ کے اسی روّیے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایسی ہی ایک شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے، جنھوں نے ایک ایسے وقت میں جب ہندوستان کی گلی گلی میں خون بہہ رہا تھا اور سارا ملک ایک نہایت بڑی اور خوفناک خانہ جنگی کے دھانے پر کھڑا تھا، نہایت آرام سے امریکہ کو تار بھیجا تھا کہ "چند مٹھی بھر لوگوں کے سوا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا کوئی نسلی، ثقافتی یا لسانی اختلاف نہیں ہے"

(ملاحظہ ہو نیویارک ٹائمز میگزین مورخہ 19-جولائی 1942ء)

اس حیران کن بیان پر جتنے بھی استعجابیہ نشان لگائے جائیں کم ہیں، اور نہ ہی اس کے بعد آنے والے اس تعجب خیز بیان پر جس میں انھوں نے واقعات کو نہایت کم کر کے بیان کیا ہے۔ "اب چند مسلمانوں کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مطالبہ صرف چار سال پرانا ہے اور بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں"

ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کے لیے "کچھ" کے لفظ کا استعمال آپ کو عجیب نہیں لگا۔ اور "بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں" کے الفاظ ایک عظیم قوم کی زندگی اور موت کے بڑھتے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرنے کا نرالا طریقہ نہیں ہیں؟

خیر، آپ کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں خوابوں کی اس ریاست کا خاکہ سامنے آئے گا، اور دنیا کی

نگاہوں میں اس کی شکل واضح ہو گی، اس وقت کے واقعات کا آپ کو پہلے سے علم ہو گیا ہے۔ پاکستان پر ہر طرح سے حملے کئے جائیں گے، اس کے بارے میں جھوٹی افواہیں پھیلائی جائیں گی اور اس کے بارے میں اس قدر غلط بیانات دیے جائیں گے کہ اس کی مثال ملنی محال ہے لیکن تمام باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ اس امتحان میں پورا اترے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ریاست وجود میں آئے گی۔"

جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر اوما سنگھ کا کہنا ہے کہ:

"اصل میں اس کی بنیاد جس مواد پر ہے، وہ ایک طویل عرصے تک سر بند تھا۔ اس طرح اس کی کتاب نے چند نئے گوشے وا کیے ہیں۔ اس کے نفسِ مضمون میں البتہ عمومی طور پر کوئی بھی بات نئی نہیں ہے۔ انڈین، پاکستانی اور مغربی سکالر اس سے پہلے یہ بات بتا چکے ہیں کہ یہ الزام سراسر نہرو اور انڈین نیشنل کانگرس پر جاتا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے اندر احساسِ بیگانی پیدا کیا تھا۔ نہرو نے یہ الزام تقسیم کا دوسروں پر رکھ دیا حالانکہ خود انھوں نے مسلمانوں کی پریشانیوں کی اصلیت کا اندازہ ہی کم لگایا تھا۔ انھوں نے ایک خط جناح کو لکھا کہ ہندو اور مسلم کا جداگانہ تشخص بالکل بے معنی بات ہے اور یہ محض قرونِ وسطیٰ میں ترقی پانے والا تصور ہے، لیکن اکتوبر 1939ء میں انھوں نے اس امر پر تاسف کا اظہار کیا اور معافی مانگی کہ انھوں نے مسلمانوں کی شکایات کو نظر انداز کیا تھا۔ میں کہتی ہوں کہ اگر انھوں نے جناح کے جذبات کا اندازہ پہلے لگا لیا ہوتا تو حالات مختلف ہوتے۔ یہ خط نہرو پرائیویٹ پیپرز کے طور پر شائع ہونے والے مجموعے میں شامل نہیں، حالانکہ میں نے واشنگٹن میں یہ خط خود دیکھا ہے جب یہ وہاں منظرِ عام پر لایا گیا یعنی ڈی کلاسیفائیڈ ہوا۔ جب نہرو نے مسلمانوں کی مشکلات کا اندازہ لگایا تو حالات اس موڑ تک جا چکے تھے جہاں سے واپسی ناممکن تھی اب جسونت سنگھ نے بھی ہمیں یہی بات بتائی ہے اور یہی نکتہ اہم ہے۔"

سوائے ہمارے چند عالی دماغوں کے اکثر غیر جانبدار لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے خدشات جائز تھے اور یہ کہ مولانا آزاد اور باچا خان جیسے کردار دکھا کر یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں کے حقوق کانگرس کے ہاتھوں محفوظ تھے۔

سردار عبدالرب نشتر، مولانا آزاد سے وزارتی مشن منصوبے کے بعد اپنی ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ آپ اور باچا خان کانگرس سے الگ ہو جائیں تو تصفیے کا امکان ہے کیونکہ آپ جیسے کرداروں کو دکھا کر کانگرسی تاثر دیتی آ رہی کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی محافظ ہے۔ نشتر لکھتے ہیں کہ:

"میں نے کہا" کانگرس سمجھوتہ نہیں چاہتے اس لیے سمجھوتے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ ان کو معلوم ہے کہ وزارتی مشن کے دوران قائداعظم صلح اور مفاہمت کی خاطر کس حد تک جانے کے لیے تیار ہوگئے تھے لیکن کانگرس نے غیر مصالحانہ اور جنگجویانہ رویہ اختیار کیے رکھابالآخر میں نے ان سے کہامیں سمجھتاہوں کہ آپ اور عبدالغفار خان کانگرس سے علیحدہ ہوجائیں تو ممکن ہے کہ سمجھوتے کی صورت نکل آئے کیوں کہ آپ دونوں کی موجودگی سے کانگرس بالخصوص مسلمانوں کے اندر نفاق پھیلانے کی کوشش کرتی ہے اور ناجائز طور پر اپنے آپ کو مسلمانوں کانمائندہ بیان کرتی ہے۔ اگرچہ سب کو معلوم ہے کہ مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں لیکن وہ آپ لوگوں کے نام سے پروپیگنڈہ کرتی ہے (شملہ کانفرنس میں بھی ان دونوں کو ساتھ رکھاتھا)

مولاناابوالکلام آزاد کہنے لگے کہ اگر ہم کانگرس سے علیحدہ ہوگئے تو وہ کھلم کھلاہندومہاسبھابن جائے گی۔

میں نے کہایہ خفیہ ہندومہاسبھاکھلم کھلاہندومہاسبھاسے زیادہ خطرناک ہے میں نے یہ بھی کہاکہ آپ لوگ پٹیل جیسے لوگوں کے ہوتے ہوئے کانگرس میں کیاکرسکتے ہیں؟

کہنے لگے کہ کیوں میں پانچ چھ برس تک صدر رہاتوکیامسٹر پٹیل کو میں کنٹرول نہیں کرتارہا؟

میں نے کہاکہ اگر کسی کی پیروی کرنے کوکنٹرول کرنا کہتے ہیں تو آپ نے ضرور کنٹرول کیا"(94)

خود ہندو یہی لکھتے ہیں کہ مشن پلان پر مشن ارکان سے بات چیت میں آزاد کی حیثیت صرف اتنی تھی کہ وہ صدر کاعہدہ رکھتے ہوئے گاندھی کے ڈکٹیٹ کیے ہوئے خطوط پر دستخط کرتے تھے۔

چلیں 1937ء میں تو جناح صاحب نے لیگ کو نئے سرے منظم کرنا شروع کیااس کے پاس اتنی سیٹیں بھی نہیں تھیں، 46-1945ء کے الیکشن میں جب مسلم لیگ نے سویپ کر دیاتوایسے میں کیسے انھیں مسلمانوں کے حقوق کامحافظ نہ تسلیم کیاجاتا؟

اس سے پہلے ہندوؤں کے اپنے ماہر آئین و قانون جیسے ڈیسائی اور سپرو مسلمانوں کے خدشات کو جائز سمجھتے تھے اور اس کاحل برابری میں سمجھتے تھے اس کاواضح مطلب ہے کہ مسلمانوں کے خدشات کو ایڈریس نہیں کیاجارہاتھا، جس پر تفصیلی بحث ہم پچھلے صفحات میں کرچکے اور ان باتوں کی مہاراشٹر کے ایڈوکیٹ جنرل ایچ ایم سیروائی نے بھی کی۔ سیروائی لکھتے ہیں کہ:

"پاکستانی مصنفہ عائشہ جلال نے جناح پر اپنی کتاب میں اس بات پر زور دیاہے کہ جناح کا اوّلین مقصد مرکز میں برابری کاحصول تھا، جس کی وجہ سے میں نے ان تحفظات پر بحث

کی، جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں مسلمانوں کو دیے گئے تھے۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات اور اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں کے لیے نشستوں کی ریزرویشن ناکام ہو چکی تھی کیونکہ 1937ء میں گانگرس نے انتخابات کے بعد مسلمانوں کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے اقلیتوں کو یہ سبق حاصل ہوا کہ " قانون ساز اسمبلی میں اکثریتی پارٹی اقلیتوں کی خواہشات اور آرزوؤں کو پامال کر سکتی ہے، پاؤں تلے روند سکتی ہے۔ اس لیے محض قانون ساز اسمبلیوں میں نمائندگی مناسب تحفظ فراہم نہیں کرتی "(بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد ہفتم صفحہ نمبر 790، وی پی مینن کا خط بنام جیکنز ملاحظہ فرمائیں)

اس طرح قانون میں یہ ایک شق بھی تھی کہ اقلیتی قوم کے مفادات کے تحفظ کے لیے گورنر کو بھی خصوصی اختیارات دیے گئے تھے۔ تجربے سے یہ سلسلہ بھی ناکام ہو گیا کیونکہ جب گورنر اقلیتوں کے جائز حقوق کے تحفظ کے ضمن میں خصوصی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے ذاتی فیصلے کی روشنی میں قدم اٹھاتا تو اس کا نتیجہ وزارت یعنی حکومت کا استعفیٰ ہوتا اور گورنر حضرات اس صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔"(95)

یہ تو ہندوؤں کی بات ہو گی کانگرس کا سب سے بڑا نیشنلسٹ مسلمان مولانا آزاد ہی تھے۔ وہ خود اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پاکستان سکیم کو تو میں قبول نہیں کرتا لیکن مسلمانوں کے خدشات جائز ہیں۔ اپنے 02 اگست 1945ء کے خط میں، جس کا تذکرہ پہلے آچکا، جب وہ یہ بات کرتے ہیں تو گاندھی انھیں خاموش رہنے کا کہتے ہیں اور کہتے ہیں آپ فرقہ وارانہ مسئلے پر جو بھی کہیں میری اور ورکنگ کمیٹی کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کہیں۔

انڈین مسلم منصور احمد اپنی کتاب میں اسی پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"جب کانگرس کے اندرون خانہ کے پس منظر میں جہاں گاندھی جی اصل محرک ہوا کرتے تھے مولانا آزاد تک مسلم معاملات پر سوچنے اور اظہار رائے کے لیے آزاد نہیں تھے، تو اس میں کوئی تعجب خیزی نہیں ہے کہ مسلمان اور مسلم لیگ کانگرس پر بھروسا نہیں کرتے تھے، اور وہ تحفظات کی مانگ بے وجہ نہیں کر رہے تھے۔ مسلمان کے تحفظاتی مطالبات (جس کی نمائندگی مسلم لیگ کر رہی تھی) ضروری اور حق بجانب تھے، اور یہ کہ مرکزی لیجسلیچر میں ایک طرح کی برابری کوئی بے معنی بات نہیں تھی جسے جناح کی انتہا پسندی کا جامہ پہنا کر مسترد کیا جاتا۔"(96)

سیر وائی اسی خط کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ گانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے آزاد کے خط کا جو سحر

کیا، ہمیں معلوم نہیں۔البتہ گانگرس کی کسی ریزولیشن میں بھی آزاد کے اس فارمولے کا کوئی ذکر نہیں "(بحوالہ مینن صفحہ نمبر224 مینن نے گاندھی کے جواب کاذکر نہیں کیا۔ ٹنڈولکر کی کتاب مہاتمامیں آزاد کے خط اور گاندھی کے جواب کاذکر موجود ہی نہیں نہ ہی آزاد نے اپنی کتاب میں اس خط اور گاندھی کے جواب کا حوالہ دیاہے)

یعنی آزاد مسلمانوں کے حقوق کے سب سے بڑے ضامن، جوبظاہر کانگرس کے اہم ترین عہدے پر بھی بیٹھے رہے، اس کی اتنی اہمیت نہیں کہ وہ جو کچھ خود مسلمانوں کے حق میں بہتر سمجھتے ہیں وہ مسلمانوں کو لے کر دلوانا تو دور کی بات ہے، کانگرس کے پلیٹ فارم پر اس مسئلے کو اٹھانے کی ہمت بھی نہیں رکھتے اسے ڈانٹ کر چپ کرایاجاتاہے۔ اس کے بعد تمام اہم موقعوں پر بحیثیت کانگرس کے صدر وہ اپنے اس سوچی سمجھی رائے کے بر عکس رائے رکھنے پر مجبور نظر آتے ہیں جو وہ خود مسلمانوں کے حق میں بہتر سمجھتے ہیں تو ایسے بندے نے مسلمانوں کو حقوق کیالے کر دینے تھے؟

آزاد کی بے وقعتی کی کہانی بڑی طویل ہے یہ صرف تقسیم تک نہیں، تقسیم کے بعد بھی جاری رہی کیونکہ سیروائی کے مطابق نیشنلسٹ مسلمانوں کو جتنا استعمال کرناتھا، کانگرس نے 46- 1945ء کے الیکشن سے پہلے تک کرلیا بعد میں ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب میں آزاد کی بے بسی کاایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

> "مولانا آزاد کی بیچارگی اور گانگرس تنظیم میں ان کی کم وزنی کی ایک اور مثال دیکھیے!
> 1964ء میں کلکتہ میں زبردست فساد ہوا، ڈاکٹر محمود، مولانا ابو اللیث صاحب ندوی امیر جماعتِ اسلامی ہند وغیرہ ریلیف کے سلسلے میں کلکتہ گئے ہوئے تھے مولانا ابو اللیث پارک سرکس میں ایک مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے ان سے ملنے محمد ابراہیم صاحب ہوش مدیر روزنامہ "آبشار" کلکتہ تشریف لائے، ہندوستان کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے موصوف نے فرمایاکہ 1951ء میں مولانا آزاد دہلی سے کلکتہ تشریف لائے۔ ان کے کلکتہ سے لوٹ جانے کے چند روز بعد کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیاتو ہوش صاحب نے مولانا کو ٹیلیفون پر کلکتہ کی مکمل صورتِ حال سے آگاہ کیا، ہوش صاحب نے مولانا ابو اللیث کو بتایا کہ مولانا آزاد نے ان سے فون پر کہا کہ "حکومت کی نبض پر میرا ہاتھ ہے میں اس کی ہر دھڑکن محسوس کرتا ہوں مگر میں کچھ کر نہیں سکتا۔" اس گفتگو کے راوی ہیں

مولانا ابو اللیث کے رفیق کار مولانا ارتضا الدین سہسرامی جو ماشا اللہ ابھی بقید حیات ہیں۔
(اگست 1995ء)"(97)

یہ وہ "اہم لوگ" ہیں جنھیں دنیا کو دکھا کر کانگرس پروپیگنڈہ کرتی تھی کہ مسلمانوں کے حقوق ان کے ہاتھوں میں محفوظ ہیں اور اہم مسلمان ہمارے ساتھ ہیں اور لیگ ایک محدود اقلیت کی نمائندگی کرتی ہے۔

اگر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جناح صاحب کے مطابق "اقلیتی پٹھو" ساتھ ملا کر کانگرس مسلمانوں کے حقوق کا محافظ نہیں بن سکتی جو کہ وہ نہیں تھی تب کانگرس کی طرف سے یہ دعویٰ کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کی محافظ ہے بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی قبضہ مافیا آپ کی جائز اور قانونی جائیداد پر قابض ہو۔ جناح صاحب کے اعتراض کو سمجھنا ہوگا جناح صاحب کا مسئلہ کانگرس کا کوئی رکن ایکس وائے زیڈ مسلمان نہیں تھا جناح صاحب یہ اصول تسلیم کرانا چاہتے تھے کہ مسلمہ جمہوری اصولوں کے مطابق مسلم لیگ ہی مسلمانوں کے حقوق کی محافظ ہے اگر کانگرس یہ تسلیم کرتی ہے تو پھر جناح کو کسی نیشنلسٹ کی تقرری پر اعتراض نہیں تھا۔ دعویٰ تو کانگرس یہ کرتی لیکن کیا کانگرس نے اپنے عمل سے کبھی یہ ثابت کیا؟ پچھلے صفحات میں ہماری کی گئی گفتگو سے بڑی آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

اکتوبر 1946ء میں نواب بھوپال کی مداخلت پر جناح گاندھی مذاکرات ہوتے ہیں جس میں ایک معاہدہ ہوتا ہے لیکن سیر وائی کے بقول کانگرس، جناح اور گاندھی کے اس معاہدے سے بھی بعد میں مکر گئی۔

گاندھی اور جناح نے 4 اکتوبر 1946ء کو درج ذیل فارمولے پر دستخط کیے:

> "کانگرس چیلنج نہیں کرتی اور یہ تسلیم کرتی ہے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد کی نمائندہ جماعت ہے۔ جمہوری اصولوں کے مطابق صرف اسے ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ لیکن کانگرس اپنے اراکین میں سے مناسب نمائندوں کا انتخاب کرسکتی ہے اور وہ اس ضمن میں کوئی پابندی قبول نہیں کرے گی۔"

اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے سیر وائی آگے لکھتے ہیں کہ "اس فارمولے سے کانگرس اور جناح دونوں کا مطلب پورا ہوگیا۔ جب یہ بات مان لی گئی کہ جناح کو جمہوری اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہے تو پھر ان کے اس اعتراض کا کوئی جواز باقی نہیں رہا کہ کانگرس کو عبوری حکومت میں نیشنلسٹ مسلمان مقرر کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ کانگرس کی طرف سے نیشنلسٹ مسلمان کی تقرری سے بھی اس دعویٰ کو کوئی تقویت نہیں ملتی تھی کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔"(98)

چونکہ سرسری اور سطحی فتوے صادر کرنے والے اپنی مرضی کے ٹکڑے اٹھا کر نیشنلسٹ مسلمانوں والے

مسئلے کو جناح صاحب کی انتہا پسندی اور بے اصولی قرار دیتے ہیں اس لیے اس بات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تا کہ دیکھا جاسکے کہ اصل مسئلہ تھا کیا اور جناح صاحب منوانا کیا چاہتے تھے؟

کرپس، لارنس کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق کانگرسی قرارداد کی منظوری

اب دوبارہ اپنی بحث وہیں سے شروع کرتے ہیں:

23 جون کو کرپس نے سدھیر گوش کو بلایا اور بتایا کہ ہم نے یعنی کرپس اور لارنس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کانگرس طویل المعیاد منصوبہ قبول کر لے اور قریب المعیاد منصوبہ رد کر لے تو وزارتی مشن نے اب تک 16 جون کے اعلان کے مطابق عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب کالعدم قرار پائے گا اور پھر نئے سرے سے کوششوں کا آغاز کیا جائے گا۔ انھوں نے اس سلسلے میں گاندھی اور پٹیل سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ صبح ان کی ملاقات ہوتی ہے پلان واضح تھا کہ کانگرس کو کسی طرح 16 جون کے پیرا 8 کی زد میں آنے سے بچایا جائے جس میں کہا گیا تھا:

> "اگر دونوں پارٹیوں یا دونوں میں سے کوئی ایک مذکورہ خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل میں شمولیت اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وائسرائے اس کے باوجود عبوری حکومت کی تشکیل کرے گا جو ان عناصر کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرے گی جو 16 مئی کے منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔"

24 جون کو مشن ارکان اور وائسرائے کی میٹنگ ہوتی ہے معاملہ زیر بحث کانگرس کی 16 مئی کے اعلان کی منظوری ہے۔

اس پر اے وی الیگزینڈر نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ چال بازی سے کام لے رہی ہے اور 16 مئی کی دستاویز کو محض کاغذی منظوری دینا چاہتی ہے تا کہ 16 جون کے اعلان کے پیرا 8 کے تحت عبوری حکومت میں شامل ہو سکے اور اپنی مرضی کے مطابق اس پر کنٹرول حاصل کر سکے۔ ان کی طرف سے 16 مئی کی دستاویز کی منظوری حقیقی نہیں ہو گی۔"

وائسرائے نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے کہ کانگرس نے 16 مئی کی دستاویز کو منظوری دے دی ہے تا آنکہ وہ اسے خلوص دل سے بلا حیل و حجت منظوری نہ دے دے۔"

"الیگزینڈر کی رائے کچھ اس طرح تھی "

"He had come out to India quite unbiased and in the early stages had been somewhat exasperated with Mr Jinnah's attitude. But he was

bound to say that the behavior of the Congress in the last six weeks seemed to him the most deplorable exhibition that he had witnessed in his political carrer."

وہ جب ہندوستان آیا تو وہ کسی کا طرفدار نہیں تھا بلکہ اسے جناح کا روّیہ اشتعال انگیز معلوم ہوا کرتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ گزشتہ 6 ہفتے کے دوران کانگرس نے جس روّیے کا اظہار کیا ہے ویسا شرمناک مظاہرہ اس نے اپنی ساری زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔"(99)

اس پوری "پیشرفت" کے بارے میں جناح صاحب قطعی لاعلم تھے یہاں تک کہ الیگزینڈر اور وائسرائے کو بھی اس کے بارے علم نہیں تھا۔ ویول نے اپنے اس دن کے روزنامچے میں اس معاملے کے بارے میں اپنے شبہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"Cripps now says that Congress while turning down the Interim Government will accept the May 16 Statement, the one thing he assured me yesterday and the day before that they would never do, and which places us in a more awkward position with Jinnah. I am afraid I would not put it past Cripps to have suggested to Congress in one of his many talks that they would put themselves in a better tactical position if they did so."

کرپس اب کہتا ہے کہ کانگرس عبوری حکومت کی تجویز کو رد کر کے 16 مئی کی دستاویز کو قبول کر رہی ہے، حالانکہ یہ وہ بات تھی جس کے بارے میں اس نے مجھے کل اور پرسوں یقین دہانی کرائی تھی کہ ایسا نہیں ہو گا۔ اس سے ہماری جناح کے ساتھ پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ میری دانست میں کرپس سے یہ بعید نہیں ہے کہ خود اس نے کانگرس کو اپنی ملاقاتوں کے دوران یہ مشورہ دیا ہو کہ ایسا کرنے سے ان کی چال چلنے کی پوزیشن بہتر ہو جائے گی۔"(100)

چنانچہ 25 جون کو کانگرس مجلس عاملہ نے کرپس اور پیتھک لارنس کے بتائے ہوئے رستے پر چل کر قرارداد کی منظوری دی جس میں 16 جون کی مجوزہ عبوری حکومت کو رد کر دیا گیا تھا اور 16 مئی کے مجوزہ طویل المعیاد مشن منصوبے کو متنازعہ شقوں پر اپنی تشریح کے ہمراہ منظوری دے دی گئی تھی۔ یہ تشریح وہ تھی جو 24 مئی کو کانگرس مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں پہلے ہی کر دی تھی جس کے مطابق گروپنگ اس منصوبے کا لازمی

حصہ نہیں تھا بلکہ آئین ساز اسمبلی کے تین حصوں میں تقسیم ہونے سے پہلے ہی صوبوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ چاہیں تو گروپ کو نامنظور کر دیں جس میں ان کو رکھا گیا تھا۔ چنانچہ قرارداد میں کہا گیا:

"برطانوی وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے 16 مئی کو جاری کردہ دستاویز پر مجلس عاملہ نے 24 مئی کو ایک قرارداد منظور کی تھی۔ اس قرارداد میں ہم نے اس دستاویز کے اندر موجود بعض نقائص کی نشاندہی کی تھی اور ان کے بارے میں اپنی توجیہہ کی تھی۔ تب سے مجلس عاملہ برطانوی حکومت کی جانب سے جاری کردہ 16 مئی اور 16 جون کے اعلانات کا بغور جائزہ لینے میں مسلسل مصروف رہی ہے اور اس سلسلے میں اس خط و کتابت کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے جو کانگرس کے صدر اور ارکان مشن اور وائسرائے کے مابین ہوتی رہی ہے۔ مجلس عاملہ نے دونوں منصوبوں کا کانگرس کے نصب العین کو پیش نظر رکھ کر جائزہ لیا ہے۔ یہ منصوبے اس نصب العین کی تکمیل سے قاصر ہیں۔ جس قسم کی آزادی کانگرس کا نصب العین رہی ہے وہ ہے ایک متحدہ جمہوری ہندوستانی وفاق کا قیام جس کا مرکز با اختیار ہو۔ مجوزہ منصوبہ کے مطابق مرکزی اختیارات کا محدود کیا جانا اور صوبوں کا گروپ بندی کا نظام اپنانا اس پورے ڈھانچے کو کمزور کر کے رکھ دے گا۔ یہ بعض صوبوں مثلاً سرحد اور آسام اور بعض اقلیتوں مثلاً سکھوں کے لیے ناانصافی پر مبنی ہوگا۔ مجلس عاملہ اس چیز کو نامنظور کرتی ہے۔ تاہم مجلس عاملہ کی رائے میں اگر کلی حیثیت میں اس منصوبے کو دیکھا جائے تو اس میں اس امر کی خاصی گنجائش موجود ہے کہ جس سے مرکزی اختیارات کو وسیع اور مضبوط بنایا جاسکتا ہے، کسی صوبے کا گروپ بندی کے ضمن میں اپنی مرضی کے مطابق اقدام کرنے کا حق پوری طرح محفوظ کرایا جاسکتا ہے اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مجلس عاملہ فیصلہ کرتی ہے کہ کانگرس ایک آزاد، متحدہ اور جمہوری ہندوستان کا آئین وضع کرنے کے ارادے سے مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت کرے گی۔"

مجوزہ عبوری حکومت کو رد کرتے ہوئے کہا گیا کہ "عبوری یا کسی دوسری حکومت کی تشکیل میں کانگرس والے اپنی پارٹی کا نیشنلسٹ کردار کبھی ترک نہیں کر سکتے اور نہ ہی غیر منصفانہ اور مصنوعی برابری کو قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی فرقہ وارانہ گروہ کو ویٹو کا حق دینے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔" قرارداد کے آخر میں کہا گیا کہ "اب جبکہ مجلس عاملہ آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کی شرکت پر رضامند ہو گئی ہے، اس لیے اس کی رائے میں اب یہ

ضروری ہوگیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک نمائندہ اور ذمہ دار حکومت تشکیل دی جائے۔"(101)

اس میں اور 24 مئی کی قرارداد میں جس میں مشن منصوبے پر اعتراضات اٹھائے گئے، بعد میں کی گئی ملاقاتوں میں کہیں یہ نظر آتا ہے کہ کانگرس نے بغیر کسی اپنی تشریح کے مشن منصوبے کو قبول کیا تھا؟ آئین ساز اسمبلی کو خود مختار ادارہ کہا گیا کہ جو مرضی کر سکتی ہے گروپنگ جو اس سکیم کی روح تھی، کی شروع دن سے گاندھی اور کانگرس کی اپنی توجیہہ رہی ہے ایسے میں کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس قرارداد کے ذریعے واقعی کانگرس نے مشن منصوبہ قبول کیا تھا؟

کانگرس کی جانب سے مشن منصوبے کی "منظوری" پر ویول کا ردِ عمل

ویول چونکہ انتظامی سربراہ تھے ایک ایسے وقت میں جب فرقہ وارانہ کشیدگی انتہا پر تھی اس کی ذمہ داری بطور انتظامی سربراہ زیادہ تھی اس لیے وہ اس صورت حال پر کافی برہم نظر آئے۔

ویول نے کہا کہ:

"Congress manoeuvres have now put us into a very difficult position, both with Mr. Jinnah and as to the formation of an Interim Government."

"کانگرس کی چالوں نے ہمیں جناح کے سامنے اور عبوری حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا ہے"

ویول کے مطابق اب تین ہی متبادل تھے:

" To ask Mr Jinnah to form a Government I do not see how this could possibly be done, since both sides have now accepted the May 16 Statement; unless we decide that the Congress's is a dishonest one, as it infact is, and refuse to regard it as an acceptance.

To captulate entirely to the Congress and ask them to form a Government, seeking the cooperation of Muslim League on such terms as they judge right. It does not seem to me that this would be fair or honest to the Muslim League, and I could not accept it.

To form a Caretaker Government of officials, to carry on for a short

period while the Mission goes home for consultation ."

1. یہ کہ جناح کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کانگرس کی طرف سے 16 مئی کیے دستاویز کی منظوری بد دیانتی پر مبنی ہے۔۔۔ جو کہ وہ واقعی ہے، اور اسے بطور منظوری تسلیم نہ کیا جائے۔

2. کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے جائیں اور اسے حکومت بنانے کے لیے کہا جائے جو اپنی شرائط کے مطابق مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ میری رائے میں یہ مسلم لیگ کے ساتھ جائز اور دیانتدارنہ بات نہ ہو گی اور میں اسے قبول نہیں کرونگا۔

1- سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت بنائی جائے جو مختصر عرصہ کے لیے کام کرے جبکہ مشن وطن جا کر صلاح مشورے کرے۔

مزید لکھتے ہیں کہ:

"The solution depends on whether the Delegation propose to regard the Congress acceptance of the Statement of May 16 as genuine, inspite of their expressed intention to evade atleast one of its essential provisions . If the Delegation do not accept it, then Mr Jinnah can be asked to participate in a Government as already agreed.

If the Delegation proposes to accept the Congress acceptance of the Statement, I think that the only possible solution is a temporary Caretaker Government of officials. It may not hold the situation for long, perhaps for not more than few weeks, perhaps hardly that, but we have been manoeuvred into a position when it seems to be the only chance ."

"حل کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا مشن کانگرس کی طرف سے 16 مئی کی مشن دستاویز کی منظوری کو حقیقی سمجھتا ہے یا نہیں، اس حقیقت کے باجود کہ کانگرس نے اس کی انتہائی اہم شقوں سے میں سے ایک سے روگردانی اختیار کرنے کا واضح ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔ اگر مشن اس منظوری کو تسلیم نہیں کرتا تو پھر جناح کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جائے جیسا پہلے طے ہوا تھا۔ بصورتِ دیگر اگر مشن تسلیم کرتا ہے کہ کانگرس نے مشن

منصوبہ منظور کر لیا ہے تو پھر واحد ممکنہ حل یہی ہے کہ سرکاری افراد پر مشتمل عارضی نگران حکومت وضع کر دی جائے جو شاید چند ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ لیکن ہم چونکہ چال میں آگئے ہیں لہٰذا یہی واحد راستہ نظر آتا ہے۔"(102)

25جون کو جناح اور مشن ارکان بشمول وائسرائے ملاقات

25جون کی شام مشن کے ارکان اور وائسرائے نے جناح صاحب کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح صاحب کا مؤقف تھا کہ کانگرس کی منظوری کو منظوری نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ منظوری مشن کی بعض شقوں کی من مانی تشریح کے تحت عمل میں لائی گئی ہے۔ پیتھک لارنس نے جواب دیا کہ مسلم لیگ نے بھی تو اسے منظوری دیتے وقت اپنا نکتہ نظر پیش کیا تھا اور مکمل طور پر خود مختار پاکستان کو اپنی منزل قرار دیا تھا۔ اس پر جناح نے کہا کہ مسلم لیگ نے خود مختار پاکستان کو بطور اپنی منزل کے اعادہ کیا تھا لیکن مشن کے منصوبے کو منظوری اس کی شقوں کی تشریح کیے بغیر دے دی تھی۔

بحث طول پکڑنے کے ساتھ تلخ ہوتی گئی۔ وائسرائے نے جناح کو بتایا کہ اب 16 مئی کا منصوبہ قبول کر کے کانگرس اور لیگ ایک پوزیشن پر آچکی ہیں اب 16 جون کے اعلان کو ختم سمجھا جائے جس پر جناح نے شدید ردِ عمل ظاہر کیا۔

وائسرائے نے بتایا کہ عبوری کابینہ کے لیے اب نئے سرے سے کوششیں ہونگی جناح نے کہا مجھے تحریری طور پر اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کریں تاکہ میں اپنی مجلس عاملہ سے بات کروں۔

اس ملاقات کے بارے ویول لکھتا ہے کہ:

"Jinnah was in thoroughly evil mode, accused us of bad faith and of giving way to Congress."

"جناح نے ہم پر بد دیانتی کا الزام لگایا اور کہا کہ آپ نے کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔"(103)

26جون کو مشن اور وائسرائے کی جانب سے مستقبل کے لائحہ عمل کا اعلان کر دیا گیا کہ عارضی طور پر وائسرائے سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت بنا کر کاروبار حکومت لائے گا۔ 27جون کو ویول نے جناح کے خط (26جون) کے جواب میں انھیں سرکاری طور پر اس لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا۔ اس پر جناح نے 27جون کو ایک طویل بیان جاری کیا جس میں مشن کی آمد سے لیکر اس وقت تک کے تمام مراحل کا جائزہ لیا اور ثابت کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ دھوکا کیا گیا۔

ویول کی دلبر داشتگی

ویول اس پورے معاملے میں اس حد تک دلبر داشتہ ہوا کہ اس نے 26 جون کو الیگزینڈر سے کہا کہ:

"Afterwards I had a talk with Alexander, and told him that I should normally ask to be relieved of my appointment after what had happened, that I thought I had been placed in an impossible position with Muslim League, and the Cripps had not been quite straight, but that I did not want to embarrass H M G. He thought I ought to stay."

"جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد عام حالات میں مجھے اپنے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ مجھے مسلم لیگ کے ساتھ ایک ناممکن صورت حال کا سامنا درپیش ہو گیا ہے۔ کرپس نے کبھی سیدھی بات نہیں کی۔ لیکن میں حکومت برطانیہ کو پریشانی میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ الیگزینڈر نے کہا کہ "نہیں ابھی تمھیں رہنا چاہیے"(104)

26 جون، آزاد، نہرو پٹیل، راجندر پرشاد کی مشن ارکان اور وائسرائے سے ملاقات

اس ملاقات میں آزاد نے کہا "ہم نے اس سلسلے میں آپ کے 25 مئی کے وضاحتی بیان پر بھی غور کیا ہے۔ہم نے سوچا ہے کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں ایک خاص طریقے سے کام کریں گے۔ صریح طور پر کانگرس گروپنگ کے خلاف ہے۔ ہماری رائے میں اس سے ہندوستان کمزور ہو گا اور ہم آئین ساز اسمبلی کو اس کے خلاف فیصلہ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے دلائل و براہین سے بھی کام لیں گے اور ہمارے بس میں جو ممکن ذرائع ہیں وہ بھی استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں جو بھی جائے گا وہ کچھ نتائج حاصل کرنے کے لیے جائے گا نہ کہ اسے توڑنے کے لیے۔"

نہرو نے کہا "وزارتی مشن منصوبہ کی دستاویز میں بہت سی چیزیں کانگرس کو پسند نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان رکاوٹوں کو دور کر دیں اور ہو سکتا ہے کہ نہ کر سکیں۔"(105)

آل انڈیا کانگرس کا 6،7 جولائی کا اجلاس

"6-7 جولائی کو بمبئی میں منعقد ہونے والے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر جو کانگرس مجلس عاملہ کی 25 جون کی قرارداد کی توثیق کے لیے بلایا گیا تھا، میں آزاد نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"وزارتی مشن منصوبہ میں صرف گروپنگ سے متعلق ایک نیا پہلو نمایاں ہے جس سے کانگرس نے پوری طرح اتفاق نہیں کیا ہے۔ چنانچہ مجلس عاملہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ گروپنگ کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہو گا۔ صوبے یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہونگے کہ وہ مخصوص گروپ میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہم پر اعتماد ہیں کہ گروپنگ کی شق بارے ہماری توجیہہ بالکل درست ہے۔"(106)

آزاد کی تائید کرتے ہوئے پٹیل نے کہا:

"آئین ساز اسمبلی کی سکیم میں سب سے خطرناک تجویز وہ ہے جو گروپنگ کے متعلق ہے۔ سرکاری دستاویز میں اس سے متعلقہ پیراگراف کے بارے میں ہماری توجیہہ یہ ہے کہ پہلے مرحلے ہی میں صوبوں کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جس مخصوص گروپ میں شامل کیے گئے ہیں ان میں رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں فیصلہ کریں۔ کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی گروپ میں شامل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"(107)

نہرو نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، یہ معاملہ کسی بھی منصوبے کو قبول کرنے کا نہیں ہے، خواہ وہ طویل العیاد ہو یا قریب العیاد، اصل معاملہ یہ ہے کہ ہم نے آئین ساز اسمبلی کے اندر جانا منظور کیا ہے اور بس۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم اس اسمبلی میں اس وقت تک ہی رہیں گے جب تک دیکھیں گے کہ یہ ہندوستان کے مفاد میں ہے اور جب ہمیں یہ لگا کہ ہمارا نصب العین مجروح ہو رہا ہے تو ہم باہر نکل آئیں گے اور لڑائی کی دعوت دیں گے۔ ہم کسی ایک بات کے بھی پابند نہیں ہیں۔"(108)

07 جولائی کو اختتامی تقریر میں آزاد نے کہا:

"ہم کسی حالت میں اپنے بنیادی اصولوں کی قربانی نہیں دیں گے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی ناقابل تسخیر مشکل ہمارے بنیادی اصولوں کی راہ میں حائل ہو گی تو ہم آئین ساز اسمبلی کا خاتمہ کر ڈالنے میں تامل سے کام نہیں لیں گے" اس نے یہ بھی کہا کہ "کانگرس کبھی کمزور مرکز برداشت نہیں کرے گی۔"(109)

پچھلی تمام بحث میں کانگرسی روّیہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی انھوں نے مشن منصوبہ قبول کیا تھا؟ 17 مئی کو گاندھی کے ردِ عمل سے لیکر 6، 7 جولائی کو آل انڈیا کانگرس اجلاس میں کی گئی تقاریر میں جو کچھ خود آزاد، پٹیل اور نہرو کہتے رہے ہیں کیا اسے "منظوری یا قبول کرنا کہا جاسکتا ہے؟ ان تمام حقائق کی

موجودگی کے باوجود، کہ کانگرسی قرادادوں اور وائسرائے اور مشن کے ارکان کے ساتھ ملاقاتوں میں جس طرح کانگرسی لیڈرز بشمول آزاد، مشن کے اہم شقوں کے بارے میں روگردانی کا واضح اظہار تسلسل کے ساتھ کرتے آئے، آزاد کی طرف سے مشن منصوبے کی ناکامی کی ذمہ داری نہرو کے "بدبختانہ بیان" پر ڈالنا بڑے حوصلے کی بات ہے۔

امام الہند 1937ء میں جب مسلم لیگ کے دست تعاون کو حقارت سے ٹھکرایا گیا تب بھی اپنی کتاب میں "یادداشت کی کمزوری" کا شکار نظر آئے اور کیبنٹ مشن پلان والے معاملے میں بھی کیونکہ دونوں معاملوں میں وہ پارٹنر ان کرائم تھے۔ یہ تمام چیزیں پڑھنے دیکھنے کے بعد یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ کم ہمتی کے ساتھ ساتھ موصوف نے ان واقعات کو جس طرح اپنی کتاب میں بیان کیا، وہ ایک بددیانت آدمی بھی تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "کانگرس اور مسلم لیگ کی طرف سے وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کا واقعہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ تشدد اور تصادم کے بجائے گفت وشنید اور افہام و تفہیم سے طے ہو گیا تھا اور یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قصہ پارینہ ہو گئی ہیں۔ پورے ملک میں مسرت وانبساط کا احساس پایا جاتا تھا اور سارے لوگ آزادی کے مطالبے پر متفق و متحد تھے۔ ہم نے خوشیاں منائیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خوشیاں قبل از وقت تھیں اور ہمیں عنقریب تلخ مایوسیاں درپیش ہونگی"(110)
>
> پریس کانفرنس کا مختصر احوال بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "جواہر لال کا یہ بیان غلط تھا۔ کانگرس کو وزارتی مشن منصوبہ میں اپنی مرضی سے تبدیلی یا ترمیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ ہم نے فی الحقیقت مان لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی۔ مرکز کے پاس صرف تین امور ہونگے جب کہ بقیہ امور کا تعلق صوبائی دائرہ کار سے ہوگا۔ ہم نے یہ بھی مان لیا تھا کہ برصغیر کو تین گروپوں ا،ب، اور ج میں ترتیب دیا جائے گا۔ کانگرسی دوسری پارٹیوں کی مرضی کے بغیر یک طرفہ طور پر ان معاملات میں تبدیلی نہیں کر سکتی تھی۔ مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبے کو منظور کر لیا تھا کیونکہ برطانوی حکومت اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی، یہ اس کی آخری حد تھی۔ جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ محض اس لیے اس منصوبے کے حق میں تھا کہ اس سے بہتر کسی چیز کا حصول ممکن نہیں تھا۔"(111)

10 جولائی 1946ء کی نہرو کی پریس کانفرنس

"اس کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کن کیفیات اور حالات میں ہم نے آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونا منظور کیا ہے اور اس کے علاوہ ہم نے کچھ منظور نہیں کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں پہنچنے کے لیے ہم نے ایک خاص طریقہ کار اختیار کرنا قبول کیا ہے اور یہ ہے آئین ساز اسمبلی کے لیے امیدواروں کا انتخاب۔ اس کے بعد ہم اسمبلی میں جا کر کیا کریں گے اس کا تعین کرنے میں ہم کاملاً و مطلقاً آزاد ہیں ہم کسی ایک معاملے میں بھی کسی کے ساتھ کسی قسم کے قول و قرار کے پابند نہیں ہیں۔"

اس میں نہرو نے کونسی نئی بات کی کہ جس سے کانگرس کی طرف سے "منظور" کیا گیا منصوبہ ناکام ہو گیا؟ نہرو کے سوانح نگار مایکل بریشر کے مطابق صرف اتنا ہوا کہ:

"نہرو کے اس بیان سے ابہام اور منافقت کی فضا صاف ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی تصفیے یا اتفاق رائے کا وہ پردہ بھی چاک ہو گیا جسے وزارتی مشن نے برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔"(112)

نہرو کا ایک اور سوانح نگار مایکل ایڈورڈز لکھتا ہے کہ "نہرو نے دراصل اپنے اس بیان کے ذریعے اس یقین کا اعادہ کیا تھا کہ برطانیہ جلد ہی رخصت ہو جائے گا اور پھر کانگرس مسلم لیگ کو نظر انداز کر سکے گی" (113)

ایچ ایم سیر وائی نہرو کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ کہنا کہ نہرو نے جذبات میں آکر ان خیالات کا اظہار کیا غلط ہے۔ نہرو کا بیان اس کے پختہ خیالات کی عکاسی کرتا تھا۔ اس نے وائسرائے اور مشن سے 10 جون 1946ء کی ملاقات میں بھی انھی نظریات کا اظہار کیا تھا (بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد ہفتم صفحہ 855)

سیر وائی، آزاد کی اس "حیرت" پر نہرو کے بیانات کا حوالہ دینے کے بعد کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"میں نے جواہر لال نہرو کے ان بیانات کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ آزاد کو کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے بارے میں نہرو کی رائے سے پہلے سے آگاہی تھی اور انھیں پلان کے بارے میں نہرو کے پبلک بیانات پر حیرت نہیں ہونی چاہیئے تھی، کیونکہ وہ اس سے ایک ماہ پیشتر یہی باتیں وائسرائے اور وفد کے اراکین کے سامنے کر چکے تھے۔"(114)

سیر وائی مزید لکھتے ہیں کہ:

"یہ کہا جاسکتا ہے کہ کہ نہرو کی 10 جولائی 1946ء کی تقریر سے بہت پہلے گاندھی کیبنٹ مشن پلان کے طویل المدت اور قلیل المدت پلان سے متعلق شقوں کا بیڑہ غرق کر چکا تھا۔ چنانچہ اگر کسی کو پلان کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرانا ہے تو وہ نہرو نہیں بلکہ گاندھی تھا۔" (11)

آیئے ذرا دوبارہ پچھلے صفحات پر ایک نظر دوڑاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی آزاد اس بارے بے خبر تھے جو اسے لکھنا پڑا کہ نہرو کی جذباتیت پر مبنی بیان نے کام خراب کیا؟

26 جون کو آزاد خود کیا کہہ رہے ہیں؟

"ہم نے اس سلسلے میں آپ کے 25 مئی کے وضاحتی بیان پر بھی غور کیا ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں ایک خاص طریقے سے کام کریں گے۔ صریح طور پر کانگرس گروپنگ کے خلاف ہے۔ ہماری رائے میں اس سے ہندوستان کمزور ہو گا اور ہم آئین ساز اسمبلی کو اس کے خلاف فیصلہ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے دلائل و براہین سے بھی کام لیں گے اور ہمارے بس میں جو ممکن ذرائع ہیں وہ بھی استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں جو بھی جائے گا وہ کچھ نتائج حاصل کرنے کے لیے جائے گا نہ کہ اسے توڑنے کے لیے۔"

آزاد کی موجودگی میں نہرو کا 26 جون کی ملاقات میں بیان:

نہرو نے کہا "وزارتی مشن منصوبہ کی دستاویز میں بہت سی چیزیں کانگرس کو پسند نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان رکاوٹوں کو دور کر دیں اور ہو سکتا ہے کہ نہ کر سکیں۔"

مزید اس کی موجودگی میں پٹیل اور گاندھی نے گروپنگ سکیم کو دفن کرنے کی بات کی 7 جولائی کو دوبارہ تقریر کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں:

"ہم کسی حالت میں اپنے بنیادی اصولوں کی قربانی نہیں دیں گے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی ناقابل تسخیر مشکل ہمارے بنیادی اصولوں کی راہ میں حائل ہو گی تو ہم آئین ساز اسمبلی کا خاتمہ کر ڈالنے میں تامل سے کام نہیں لیں گے" اس نے یہ بھی کہا کہ "کانگرس کبھی کمزور مرکز برداشت نہیں کرے گی۔"

17 مئی کو گاندھی کا بیان:

"مشن اور وائسرائے نے فریقین کے مابین مفاہمت کی پوری کوشش کی لیکن وہ کوئی تصفیہ نہ کرواسکے۔ چنانچہ انھوں نے ملک کے لیے وہ سفارشات دی ہیں جو ان کے خیال میں آئین ساز اسمبلی کو قابل قبول ہونگی"

"یہی صورت گروپنگ کی ہے۔ صوبوں کو آزادی ہے کہ وہ چاہیں تو گروپنگ کو سرے سے ہی رد کر دیں۔ اگر گروپنگ کا تصور تسلیم بھی کر لیا گیا تب بھی کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف گروپ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔"

ان تمام بیانات کی روشنی میں بڑی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ کب کانگرس نے گروپنگ کو تسلیم کیا کب کمزور مرکز پر وہ آمادہ ہوئے جن کا تذکرہ امام الہند اپنی کتاب میں کر رہے ہیں۔

راست اقدام

لیگ واحد جماعت تھی جس نے مشن کی طرف سے کیے گئے 16 مئی اور 25 مئی کے اعلانات تسلیم کئے۔ جناح صاحب کو ویول نے سکیم قبول کرنے پر یقین دہانیاں بھی کرائی تھیں جس کا تذکرہ اوپر آچکا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ برطانوی کانگرس کی ناراضگی افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ سیر وائی کے مطابق ٹرانسفر آف پاور کی جلدوں میں بہت سے دستاویزی ثبوت اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ کانگرس نے وائسرائے اور حکومت برطانیہ کے سروں پر راست اقدام کی دھمکی لٹکائے رکھی، تاکہ کانگرس من مانی کر سکے، اور جناح اس دھمکی اور حکومت برطانیہ کی اس ضمن میں بے چینی سے بھی واقف تھے۔

جناح صاحب جو ہمیشہ آئینی طریق کار پر پابند رہے، ان کو سمجھ آگئی کہ جب تک کانگرس کی دھونس قائم ہے تب تک وہ کانگرس کے ساتھ لڑ نہیں سکتے اگر یہ جنگ جیتنا ہے تو وہی حربے استعمال کرنے ہوں گے جو کانگرس نے کامیابی سے انگریزوں کے خلاف استعمال کیے۔

لیکن تمام حجت کے طور پر جناح صاحب نے ایٹلی کے ساتھ ساتھ چرچل کے نام خطوط لکھے کہ شاید معاملے کا کوئی پرامن حل نکل آئے۔ ایٹلی کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ:

"کیبنٹ کا وفد اور وائسرائے کانگرس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں، جو کہ ہمیشہ سے عدم تعاون اور سول نافرمانی کی دھمکی دیتی چلی آئی ہے اور اس نے عملی طور پر شروع ہی سے جارحانہ اور آمرانہ طرز عمل اپنا رکھا ہے۔ ان کا روّیہ ایک ایسے شخص جیسا ہے جس نے ہاتھوں میں پستول تھام رکھا ہو۔ اب بھی جبکہ کانگرس عبوری حکومت کی تجویز ناکام بنا چکی ہے، اس نے طویل المدت پلان کو تعمیری یا خیر سگالی جذبہ کے تحت قبول نہیں کیا، بلکہ اس

کا مقصد اسے بھی ناکام بنانا ہے یہ حقیقت کانگرس کی ان شرائط اور توضیحات سے واضح ہو جاتی ہے جو اس نے لانگ ٹرم پلان کے ضمن میں عائد کی ہیں اور جو کیبنٹ مشن اور وائسرائے کے 16 مئی اور 25 مئی کے بیانات کے مندرجات سے متصادم ہیں۔"

جناح صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

"مجھے بھروسا ہے کہ انگریز حکومت مسلمانوں کو خون بہانے پر مجبور نہیں کرے گی، لیکن اگر حکومت نے کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ اگر انصاف سے قطع نظر فیصلے سیاسی بنیادوں پر ہی ہونے ہیں تو پھر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارے پاس طاقت کے استعمال کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے نتائج بھیانک ہونگے اور پھر صلح کا راستہ بند ہو جائے گا۔"

سیر وائی کے مطابق اس خط کے جواب میں ایٹلی کا 23 جولائی 1946ء کا خط ٹال مٹول کی کوشش تھی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"ایٹلی کا یہ مکتوب اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ بات جناح کے علم میں تھی کہ حکومت برطانیہ اپنے طرزِ عمل سے کانگرس کو یہ باور کرائے رکھنا چاہتی تھی کہ حکومت برطانیہ اس کی جیب میں ہے اور وہ اس کی کسی صورت بھی مخالفت نہیں کر سکتی۔ جناح نے اپنے مکتوب میں ایٹلی کو متنبہ کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کی اہمیت سے صرف نظر نہ کرے، کیونکہ اگر اسے مجبور کر دیا گیا تو وہ بھی اپنی قوت کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ شائع شدہ دستاویزات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناح کے اس انتباہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ چنانچہ 29 جولائی 1946ء کو جناح کی پیشین گوئی نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔"(116)

جناح صاحب نے برطانوی پارلیمنٹ کے قائد حزب اختلاف چرچل کے نام بھی اسی مضمون کا ایک خط لکھا جس میں ڈھکے چھپے الفاظ میں ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی بھی دے ڈالی۔ جناح اپنے ممکنہ لائحہ عمل اور اس کے نتائج سے برطانویوں کو آگاہ کر کے اب بھی کچھ امید رکھتے تھے کہ شاید پر امن تصفیے کی کوئی صورت نکل آئے۔

9 جولائی کو لیاقت علی خان نے اعلان جاری کیا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس 28 اور 29 جولائی کو بمبئی میں منعقد ہو گا۔ اس کے مطابق کونسل کا مقصد "ساری صورت حال کا جائزہ لینا اور تبدیل شدہ حالات میں مسلم لیگ کا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا"

تبدیل شدہ حالات یہ ہیں:

1- وزارتی مشن اور وائسرائے عبوری حکومت بنانے کے اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں۔۔اور انھوں نے اس سلسلے میں مسلم لیگ کے ساتھ تحریری طور پر جو باضابطہ عہد وپیان کیے تھے وہ توڑ ڈالے ہیں۔

2- کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کو مشروط طور پر اور اختلاف کا حق محفوظ رکھ کر منظوری دی۔

3- کانگرس کی تعبیر مشن کے 25 مئی کے بیان سے بالکل الٹ ہے خاص طور پر گروپ بندی کے بارے میں جو کہ اس طویل المیعاد منصوبے میں بنیادی ستون کی حیثیت کی حامل ہے۔(117)

نہرو کی پریس کانفرنس کے جواب میں 12 جولائی کو جناح نے حیدر آباد میں کہا:

"برطانوی پارلیمنٹ میں عنقریب وزارتی مشن کی رپورٹ زیر بحث آنے والی ہے۔ اس موقع پر برطانوی پارلیمنٹ اور حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ وہ بلاشبہ اس کی وضاحت کرے اور اس تاثر کو دور کرے کہ کانگرس نے طویل المعیاد منصوبے کی منظوری دے دی ہے کیونکہ وزارتی مشن اور وائسرائے کی بزدلانہ کوشش رہی ہے کہ باہر یہی تاثر دیا جائے جب کہ دوران مذاکرات وہ کانگرس کی سول نافرمانی کی مسلسل دھمکیوں سے مرعوب ہوئے اور خوف کے احساس میں مبتلا رہے جن کا اب نہرو نے اپنی کانفرنس میں پھر اعادہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ تاثر اس لیے بھی دیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر مشن کی کامیابی کا سامان پیدا کرنے کے لیے بلا ضرورت مضطرب و پریشان تھے خواہ اس سے دوسروں کی قربانی ہی کیوں نہ ہوتی ہو"(118)

ایٹلی کے جواب میں، جو کہ سیر وائی کے مطابق، محض ایک ٹال مٹول کی کوشش تھی، جناح کو برطانویوں سے بھی خیر کی توقع نہیں رہی۔ چنانچہ مسلم لیگ کونسل کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"گزشتہ ساڑھے تین ماہ کے آئینی مذاکرات کے دوران اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجے میں مجھے پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کے پاس اس کے سوااب کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا کہ وہ اپنے زور بازو پر انحصار کرے اور حصول پاکستان کے نصب العین کی پابند ہو جائے" انھوں نے کہا کہ مسلم لیگ نے دیانتداری کے ساتھ آبرومندانہ سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہاں تک کہ منت سماجت سے بھی کام لیا لیکن کانگرس نے جواب میں کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے کہا وزارتی مشن کانگرس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا دراصل اس نے خود اپنی چال چلی ہے اور یہ کہ "تمام مذاکرات کے دوران وزارتی

مشن اور وائسرائے مسلسل کانگرس کی دہشت اور دھمکیوں کے اثر میں رہے۔" اور پھر "وہ اپنے قول سے پھر گئے اور اپنے 16 جون کے اعلان میں دیے گئے منصوبے سے دستکش ہو گئے۔" طویل المعیاد منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے جناح نے کہا " کانگرس نے اسے کبھی منظور نہیں کیا لیکن وزارتی مشن نے جس طرح ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا لیتا ہے اس طرح کانگرس کی اس مشروط منظوری کو حقیقی منظوری قرار دے دیا۔"

جناح نے کہا "ہم ہر دلیل آزما چکے ہیں اب کسی سے امداد یا اعانت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ٹریبونل نہیں جہاں ہم جا سکیں۔ مسلم قوم ہی واحد ٹریبونل ہے۔"

جناح نے اس سازش کا راز بھی فاش کر دیا جو 24 جون کی رات اور 25 جون کی صبح کو پیتھک لارنس اور کرپس نے گاندھی اور پٹیل کے ساتھ مل کر کی جس کے نتیجے میں 16 جون مجوزہ عبوری حکومت منصوبہ ناکام ہوا۔

عبوری حکومت میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی شمولیت کے مسئلے پر پیتھک لارنس نے دار الآمرا میں بیان دیا تھا کہ مسلم تقرریوں پر جناح کی اجارہ داری کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے جناح نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

"میں کوئی تاجر نہیں ہوں، میں تیل کے لیے رعایتیں نہیں مانگ رہا ہوں، اور نہ ہی بنیے کی طرح سودے بازی کر رہا ہوں۔ وزیر ہند کا اس زبان میں بات کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیا مسلمان بکاؤ مال ہیں؟ جناح نے کہا کہ اگر کانگرس اپنے قومی کردار کی اتنی ہی دعویدار ہے تو وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں پر توجہ کیوں نہیں دیتی۔ چھ کروڑ ہریجن صدیوں سے معاشرتی و معاشی جبر میں رہ رہے ہیں۔ گاندھی نے جو ان کی سرپرستی کا دعویدار بنتا ہے، ان کی بہبود کے لیے کیا کیا ہے؟ اچھوت اب مظاہرے کر رہے ہیں اور جیلوں میں جا رہے ہیں تو یہ انتہائی اقدام اٹھانے پر وہ اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ مشن نے کانگرس کی دیوی کو خوش کرنے کے لیے ہریجنوں کے ساتھ بھی دھوکا کیا ہے جناح نے گاندھی کے اس دعوے کو غلط ثابت کیا کہ کانگرس ہندوستان کے سارے عوام کی سرپرست (ٹرسٹی) ہے۔

"ہمیں گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں ایک سرپرست کا خاصا تجربہ ہو چکا ہے۔ اب ہم کانگرس کو اپنا سرپرست نہیں بنانا چاہتے۔ اب ہم خود بالغ ہو چکے ہیں۔"

جناح نے آخر میں ان تمام حقائق کے پیش نظر کہا کہ "اب ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے عوام

کے مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے۔(119)

چنانچہ 29 جولائی کو کونسل نے دو قراردادیں منظور کیں۔ پہلی قرارداد میں 6 جون سے لیکر جب کہ کونسل نے مشن منصوبہ منظور کرنے کی قرارداد پاس کی تھی، اب تک کے تمام واقعات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ کس طرح مسلم لیگ نے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد دونوں منصوبوں کو منظور کرنے کے بعد جس حد تک اس کے لیے ممکن تھا کانگرس اور وزارتی مشن کے ساتھ ہر مرحلے پر تعاون کیا اور کس طرح اس کی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی۔ نہرو اور کانگرس کے صریح بیانات کہ "انھوں نے صرف آئین ساز اسمبلی میں شرکت کو منظور کیا ہے اور کچھ منظور نہیں کیا ہے" کے باوجود برطانوی پارلیمنٹ میں اس قسم کی کوئی ضمانت مہیا نہیں کی گئی کہ جو کانگرس کو اسمبلی کے طے شدہ دائرہ کار سے باہر جانے سے روک سکے۔ گویا دونوں پارٹیوں میں بہ کمال و تمام، صرف مسلم لیگ واحد جماعت ہے جس نے 16 مئی اور 25 مئی کے مجوزہ منصوبے کو منظور کیا۔ چنانچہ قرارداد کے آخر میں کہا گیا کہ کانگرس کے متذکرہ ردّیے کے ساتھ "برطانوی حکومت کی طرف سے کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں اور دوسرے کمزور طبقوں کے مفادات کی قربانی دینے کی جو پالیسی اختیار کی گئی اور جس طرح اس نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو دیے گئے زبانی و تحریری قول و اقرار اور عہد و پیمان توڑے ہیں، اس کے بعد اب کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان حالات میں آئین ساز ادارے میں مسلمانوں کا شریک ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کونسل وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کو جو 6 جون 1946ء کو وزیر ہند کو ارسال کی گئی تھی، واپس لینے کا اعلان کرتی ہے۔(120)

دوسری قرارداد میں کہا گیا:

> "چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل پورے یقین کے ساتھ سمجھتی ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان قوم کو اپنے جائز حقوق کے لیے، اپنے وقار کی سربلندی کے لیے، برطانیہ کی غلامی سے آزادی، اور متوقع اونچی ذات کے ہندو غلبہ سے نجات کے لیے پاکستان کے قیام کی خاطر ڈائریکٹ ایکشن کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"(121)

اس کے بعد اجلاس میں موجود تمام خطاب یافتہ ارکان نے سٹیج پر آکر خطابات واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔

اختتامی تقریر میں جناح صاحب نے کہا:

> "Through out the painful negotiations, the two parties with whom we bargained held a pistol at us, one with power and machine guns behind it, and the other with non co operation and the threat to

launch mass civil disobedience. This situation must be met. We also have a pistol."

"مسئلے کے حل کے لیے تکلیف دہ گفتگو کے دوران دونوں پارٹیوں نے ہم پر پستول تانے رکھا۔ ایک کے پاس اقتدار کا پستول تھا جس کے پس پردہ مشین گنیں تھیں، جب کہ دوسری کے پاس عدم تعاون اور سول نافرمانی کی دھمکی کا پستول تھا۔ اس صورت کا جواب دینا ضروری ہے۔ ہمارے پاس بھی پستول ہے۔"(122)

ویول کی بے بسی کا اظہار

ویول اس دن اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ:

"So the Muslim League has run out, thanks to the Mission living in the pocket of congress while out here, the dishonesty of Cripps, my stupidity and weakness in not spotting his dishonesty erlier and standing up to it, and the irresponsibility of Nehru in making the statements he has since the Mission left. I do not feel guilty about the pargraph 8, I have always thought our interpretation correct but I do feel guilty of not seeing through Cripps' Manoeuvres and refusing to be a party to Congress insincere acceptance of the Statement of May 16 and the dishonesty of Cripps and P L in instigating Congress to make such an acceptance. It was the one important point through out the negotiations on which Alexander refused to support me, and I rather weakly gave way."

"چنانچہ مسلم لیگ تو نکل گئی۔ مشن کی مہربانی کہ جو یہاں قیام کے دوران کانگرس کی جیب میں پڑا رہا۔ کرپس کی بددیانتی، میری حماقت اور کمزوری کہ میں نے اس بددیانتی کی پہلے نشاندہی نہ کی اور اس پر ثابت قدم نہ رہا اور نہرو کی غیر ذمہ داری کہ اس نے مشن کے جانے کے بعد بیانات دیے۔ مجھے پیراگراف 8 کے بارے میں احساس جرم نہیں ہے کہ اس پر ہمیشہ میری رائے رہی کہ ہماری تعبیر صحیح تھی۔ لیکن مجھے یہ احساس جرم ضرور ہے کہ میں کرپس کی چالوں کی تہہ تک نہ پہنچا اور میں نے کانگرس کی طرف سے 16 مئی کے دستاویز کی غیر مخلصانہ منظوری اور کرپس اور پیتھک لارنس کی جانب سے کانگرس کو اس

نوعیت کی منظوری کی شہہ دینے کی بد دیانتی میں ان کے ساتھ فریق بننے سے انکار نہ کیا۔ تمام مذاکرات میں یہ ایک اہم نکتہ رہا کہ جس پر الیگزینڈر نے میری حمایت سے انکار کیا اور میں نے بھی بے بسی سے گھٹنے ٹیک دیے۔"(123)

مسلم لیگ کے راست اقدام کے اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے سیر وائی لکھتے ہیں کہ:

"محاذ کی اس تبدیلی سے کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ بلاشبہ جناح نے سیاسی مسائل کے حل کے لیے راست اقدام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن حالات نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس وقت گانگرس کے ساتھ برابر کی جنگ نہیں لڑ سکتے جب تک ان کے پاس بھی وہ وسائل موجود نہ ہوں جو گانگرس نے کامیابی سے انگریزوں کے خلاف استعمال کیے تھے۔"(124)

سیر وائی کے مطابق یہ حالات اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ کانگرس لیڈران بالخصوص نہرو نے سوچا تھا (جو سوچ بالآخر غلط ثابت ہوئی) کہ مسلمان ماس موومنٹ یا "عوامی تحریک" چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کیونکہ (نہرو کی نظر میں) ان کے لیڈر امیر اور جاگیر دار گھرانوں سے آتے تھے اور وہ "نرم و آسان زندگی" کے عادی تھے) پنڈت نہرو کی اس غلطی کا عندیہ اس خط (مورخہ 27 جنوری 1947ء) میں بھی ملتا ہے جو انھوں نے سر اسٹیفورڈ کرپس کو لکھا تھا:

"مسلم لیگ لیڈر شپ بیحد رجعت پسند ہے (یہ لوگ زمیندار ہیں) اور سماجی بدلاؤ کے مخالف، لہٰذا یہ کسی ایکشن کی جرات نہیں کر سکتے، یہ لوگ اس کے اہل ہی نہیں ہیں کیونکہ انھوں نے اپنی زندگیاں آرام دہ کاموں میں گزاری ہیں، جب ایک دفعہ ان کی سمجھ میں آجائے گا کہ ان کے ذریعے کیا جانے والا تشدد ان کے لیے مفید نہیں ہو گا تو یہ دب جائیں گے۔"(ٹرانسفر آف پاور، جلد۶، صفحات ۸۵۱، ۸۵۴)۔(125)

نہرو کی جناح صاحب کو مسلسل اکسانے اور مشتعل کرنے کی کوشش پر والپوٹ لکھتے ہیں:

It was one of the most fatal mistakes he ever made in a moment of hubris. More than Iqbal, it was Nehru who charted a new mass strategy for the leage, prodding and challenging Jinnah to leave the drawing rooms of politics to reach down to the hundred million Muslims who spent most of each day laboring in rural fields.

"یہ ایک بدترین غلطی تھی جو نہرو نے اپنے لمحہ زعم میں کی تھی جس نے دراصل اقبال سے بڑھ کر جناح کو اکسا اکسا کر اور للکار کر لیگ کے لیے عوام الناس والی حکمت عملی سے روشناس کرادیا جس نے جناح کو ڈرائنگ روم کی سیاست سے نکال کر ان دس کروڑ افراد کے بیچ پہنچا دیا جو اپنی زندگی دیہات کے کھیتوں میں جفاکشی کر کے بسر کر رہے تھے"(126)

سیروائی مزید لکھتے ہیں کہ:

"کانگرس کا طرز عمل نہ تو اعلیٰ دماغی کا مظہر تھا اور نہ ہی روح کی عظمت کا۔ آخر وقت تک کانگرس سمجھتی رہی کہ جیتنے کے لیے جتنے پتوں کی ضرورت ہے وہ اس کے ہاتھ میں ہیں اور یہ کہ وہ مسلم لیگ کے خلاف جنگ میں ضرور جیت جائے گی۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

"کانگرس ہندوؤں کی عظیم اکثریت کی نمائندگی کرتی تھی جن کی آبادی کا تناسب مسلمانوں کے مقابلے میں 1:3 کا تھا۔ یہ ایک منظم اور طاقتور سیاسی جماعت تھی، جسے اس کے صاحب ثروت حامیوں کا مالی تعاون حاصل تھا۔ کانگرس جانتی تھی کہ اس کی طرف سے حکومت کو "ڈائریکٹ ایکشن" کی دھمکی اتنی مؤثر ہوگی کہ حکومت اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ خاص طور پر اس صورت میں مسلم لیگ آئینی ذرائع پر کاربند تھی اور اس نے اس وقت بھی ڈائریکٹ ایکشن کا راستہ اختیار نہیں کیا، جب کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات جاری تھے۔"(127)

سیروائی، گاندھی کو کابینہ مشن کی ناکامی کا سب سے بڑا ذمے دار سمجھتے ہیں ان کے مطابق گاندھی زبانی کلامی تو ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیتے رہے لیکن عملاً اس بارے میں کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اکثر ایسے معاملات میں باطنی روشنی سے مدد لینے کی طرف مائل رہتے تھے۔ سیروائی کے مطابق گاندھی دراصل شعوری یالاشعوری طور پر ہندو اکثریت کے حسن ظن میں مبتلا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی اکثریت کے بل بوتے اور راست اقدام کی دھمکی سے وہ متحدہ ہندوستان آزاد کرالے گا۔ مسلم لیگ مانے نہ مانے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک غیر ملکی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے گاندھی نے کہا "ہندوستان آزادی کی راہ پر چل رہا ہے اور آزادی بہت قریب ہے چاہے گانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو یا نہ۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہندوستان آزادی کے لیے کافی خون بہا چکا۔" بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد ہشتم صفحہ نمبر 628- یہ انٹرویو ہریجن مورخہ 29 ستمبر 1946ء میں رپورٹ ہوا ہے۔(128)

30 جولائی کو ڈیلی گراف کے نمائندے کولن ریڈ نے جناح کے ساتھ بات چیت سے تاثر لیا کہ وہ خود تو رابطہ

نہیں کرے گا البتہ اگر کانگرس نے اس سے رابطے کی کوشش کی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ ویول نے 4 اگست کو نگراں ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس میں ایسا کچھ کہا کہ جناح اب بھی بہتر شرائط پر تصفیہ چاہتے ہیں اس کے مطابق جناح عبوری حکومت اور آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرے گا اگر اسے گروپنگ سکیم پر صحیح طریقے سے عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی جائے۔

7 اگست کو لیاقت علی خان نے ممبر داخلہ سر آرتھر واگ کے ساتھ ملاقات میں کہا:

> "انگریزوں اور مسلمانوں کا خون بہایا جانا ایک قابلِ افسوس بات ہوگی لیکن یہ رس رس کر مرنے سے بہتر ہوگا۔ جناح بوڑھا آدمی ہے اور جیل جانے سے غالباً نفرت کرتا ہے۔ مجھے اور میری بیوی کو بھی زندگی کی آسائشات پسند ہیں۔ لیکن ان حالات میں ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے۔(129)

ان باتوں سے اندازہ لگایا جانا بڑا آسان ہے کہ مسلم لیگ کس "خوشی" اور کس قدر "منصوبہ بندی" کے ساتھ راست اقدام کرنے جارہی تھی۔

13 اگست کو ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے لندن میں چیفس آف سٹاف کمیٹی کے اجلاس میں یہ یقین کرائی کہ:

> "اگرچہ ہندوستان کی عمومی صورت حال غیر یقینی ہے اور اس میں سنگین خطرات بھی پنہاں ہیں لیکن یہ اب اس سے کہیں بہتر ہے جتنی چند ہفتے پیشتر خراب تھی اور مسلم لیگ کے تعاون کی صورت میں اس میں مزید بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔ اگر افواج وفادار ہیں جن میں ابھی بے چینی کے کوئی آثار نہیں ہیں تو میں کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔"(130)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ "یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اب جبکہ مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن ڈے قریب آرہا تھا، صورت حال پہلے سے خراب ہونے کے بجائے بہتر کیوں نظر آرہی تھی؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ہفتے پہلے کانگرس بغاوت پر مائل تھی اور اس کے رہنما اشتعال انگیزی پر اتر آئے تھے، اب کانگرس عبوری حکومت میں شامل ہورہی تھی اور صرف مسلم لیگ کا خطرہ تھا جس کے تعاون سے صورت حال میں "مزید بہتری" تو پیدا ہوسکتی تھی لیکن اس کے بغیر بھی صورت حال "پچھلے ہفتوں کی نسبت بہتر" ہوگئی تھی برطانوی حکومت نے کانگرس کو راضی برضا رکھ کر یہ "بہتری" کی صورت حال پیدا کی تھی۔"

کانگرس مجلسِ عاملہ کا واردھا میں اجلاس و قرارداد

اور امام الہند کی الفاظ سے کھیلنے کی ایک اور کوشش

چونکہ امام الہند کو اس پورے معاملے میں سوائے نہرو کے "بدبختانہ بیان" کے کچھ غلط نظر نہیں آیا ورنہ کانگرس نے بالکل اچھے بچوں کی طرح مشن منصوبے کو کھلے دل سے تسلیم کیا اس لیے نہرو کے بیان کے بعد جب مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا اس پر امام الہند ایک بار پھر اپنی کتاب میں الفاظ کے ساتھ کھیلتے ہوئے نظر آئے جیسے نہرو کے بیان سے پہلے سب اچھا تھا چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> "میں اس نئی صورت حال سے پریشان تھا۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ایک سکیم جس کے لیے میں نے اتنی سخت محنت کی، ہمارے اپنے فعل سے برباد ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ورکنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ فوراً کی جانی چاہیئے تاکہ صورت کا جائزہ لیا جائے۔ جواہر لال پہلے تو راضی نہیں تھے، مگر جب میں نے اصرار کیا تو مان گئے۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس 8 اگست کو ہوا اور پوری سیاسی صورت حال پر نظر دوڑائی گئی۔ میں نے نشاندہی کی کہ اگر ہم اس صورت حال کو سنبھالنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیئے کہ بمبئی کی پریس کانفرنس میں صدر کانگرس کا بیان ان کی ذاتی رائے تھا اور یہ کانگرس کے فیصلے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کی کہ کانگرس کا نکتہ نظر اے۔ آئی۔ سی۔ سی کے ذریعے منظور کی جانے والی قرارداد کے توسط سے بیان کر دیا گیا تھا، اور بھی کوئی فرد، حتیٰ کہ صدر کانگرس بھی اسے بدل نہیں سکتا" (131)

آیئے قرارداد کے اقتباسات پڑھ کر دیکھتے ہیں کہ یہ کانگرس اور کانگرسی رہنماؤں کے پچھلے مؤقف سے کس حد تک مختلف تھا:

> "مجلسِ عاملہ نے مسلم لیگ کے ان اعتراضات کو نوٹ کیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ کانگرس نے 16 مئی کی دستاویز میں دی گئی تجاویز کو مشروط طور پر قبول کیا ہے۔ مجلسِ عاملہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اگرچہ ہم نے اس دستاویز کی تمام تجاویز کو منظور نہیں کیا ہے لیکن سکیم کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے۔ ہم نے اس کی تعبیر اس لیے کی ہے تاکہ دستاویز میں دیے گئے اصولوں کے مطابق اس میں موجود تضاد کو رفع کیا جاسکے اور فروگزاشتوں کو دور کیا جاسکے۔ ہماری رائے میں صوبائی خودمختاری اس کی بنیادی شق ہے اور ہر صوبے کو گروپ کی تشکیل یا اس میں شمولیت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا

پورا اختیار حاصل ہے۔ تعبیر کا فیصلہ بھی دستاویز میں وضع کردہ طریقہ کار کے مطابق کیا جائے گا اور کانگرس اپنے نمائندوں کو اسی مطابقت سے عمل کرنے کا مشورہ دے گی۔"

"دستاویز کی تمام تجاویز کو منظور نہیں کیا ہے لیکن سکیم کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے" پتا نہیں یہ کیسا قبول کرنا ہے؟ ساتھ ساتھ وہی پرانی تعبیریں جو پہلے دن سے باپو اور کانگرس کی طرف سے جاری ہیں جن میں گروپ سکیم کو برباد کر کے رکھ دیا گیا جن میں صوبے گروپ کا حصہ بننے سے پہلے گروپس سے نکل سکتے ہیں۔ تو یہ مؤقف پچھلے مؤقف سے مختلف کیسے ہو گیا؟

آخر میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ ہم مجلسِ عاملہ کی 25 جون کی قرارداد اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی 7 جولائی کی قرارداد پر ثابت قدم ہیں اور اس کے مطابق آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونگے اور اس کا کاروبار چلائیں گے"

پچھلی جن قراردادوں پر ثابت قدم رہنے کی بات کی گئی ان پر پہلے ہی نظر ڈالی جا چکی انھیں پڑھ کر کانگرس کا مشن منصوبہ "قبول" کرنا اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ امام الہند کا ہی کمال ہے کہ پرانی شراب نئی بوتل میں ڈال کر ایک بار پھر بیچنے کی ناکام کوشش کی ورنہ یہ بالکل وہی کچھ ہے جو نہرو نے اپنے پریس کانفرنس میں کہا فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عام فہم الفاظ میں کہی گئی باتیں تھیں۔

جناح صاحب نے اس قرارداد پر ردِ عمل دیتے ہوئے کہا "یہ ہمیں کوئی راہ نہیں دکھاتی۔ اس میں کانگرس کے اسی مؤقف کو دہرایا گیا ہے جس پر وہ شروع سے قائم ہے صرف لفاظی اور زباندانی کا انداز مختلف ہے۔"

قرارداد کے مختلف حصوں کا تجزیہ کرنے کے بعد آخر میں جناح نے کہا:

"چنانچہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ کانگرس کی طرف سے ذرہ بھر تبدیلی ظاہر نہیں کی گئی سوائے اس چونکا دینے والے جملے کے کہ انھوں نے سکیم کو مکمل طور پر قبول کیا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد اس قرارداد میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس جملے کی تردید ہو جاتی ہے۔ انھوں نے گروپنگ کی مخالفت کا اعادہ کیا ہے اور ایک بار پھر آئین ساز اسمبلی کی خود مختار حیثیت پر زور دیا ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ 16 مئی کی دستاویز میں دی گئی کسی بات کے پابند نہیں ہیں اور ہر مسئلے کا فیصلہ اکثریت کے ساتھ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔۔۔ میرا خیال ہے کہ صورت حال وہی ہے جیسی پہلے تھی اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں تھے۔"(132)

ویول نے جناح کو ایک خط کے ذریعے مطلع کیا کہ عبوری حکومت کے لیے کانگرس کو دعوت دے دی گئی اور اس سلسلے میں کانگرس جناح کے ساتھ رابطہ استوار کرے گی۔ اس کا جناح نے کوئی جواب نہیں دیا جب 12 اگست کو سرکاری اعلان جاری ہوا تو 14 اگست کو روزنامہ ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا کہ

"جس لمحے مسلمانوں کی رضا اور تعاون کے بغیر ایک ہندو حکومت وجود میں آگئی تو گویا مسلمانوں کے خلاف حملے کا پہلا وار کر دیا گیا۔ یہ اشارہ ہے مسلمانوں کے لیے کہ وہ کچھ کر جائیں یا مر جائیں۔ اب یہ ناگزیر ہے۔"

15 اگست کو جناح اور نہرو کی ملاقات ہوتی ہے اور کانگرس کی طرف سے نیشنلسٹ مسلمان اور گروپنگ کی مخالفت کی وجہ سے یہ مذاکرات بھی بغیر کسی تصفیے کے انجام پذیر ہوئے۔

ڈائریکٹ ایکشن ڈے

دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ اور جناح کو کس حد تک دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا تب جا کر نوبت ڈائریکٹ ایکشن کی آگئی تھی۔ ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے بارے میں ایم اے ایچ اصفہانی اپنی کتاب " قائد اعظم جیسا میں انھیں جانتا ہوں" میں اسٹیٹس میں کلکتہ کے سابق ایڈیٹر سٹیفن سن کا حوالہ دیتے ہیں جو اس وقت کلکتہ میں موجود تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"سوائے ایک شہر کے ڈائریکٹ ایکشن ڈے یعنی 16 اگست کے دن بڑے بڑے جلسوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور جو شہادت فراہم ہو سکتی ہے اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ لیگ کے مرکزی لیڈروں نے کچھ زیادہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ بتایا گیا تھا کہ اس روز صرف لیگ کی کونسل کی قرارداد کی لوگوں کے سامنے توضیح و تشریح کی جائے گی، چنانچہ مسٹر جناح نے کہا تھا کہ یہ ان اقدامات کے بارے میں جو ہم اپنی سالمیت اور حفاظت کے بارے میں کرنا چاہتے ہیں محض ایک بیان ہے، یہ کسی کے خلاف اعلان جنگ نہ تھا۔ جلسے بجائے خود ڈائریکٹ ایکشن نہیں کہلا سکتے تھے اور جو لوگ ان میں شرکت کے لیے آئے ان سے پر امن رہنے کو کہا گیا تھا۔۔۔ یہ خیال بھی نہیں گزر سکتا کہ (بنگال کی) وزارت کوئی ایسا فساد کرانا چاہتی تھی جو رونما ہوا۔ اگر اور نہیں تو محض اس لیے کہ مسلمانوں کے جیتنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اگرچہ بنگال میں مجموعی طور پر ان کی اکثریت تھی تاہم صوبے کے دار الحکومت میں ان کی تعداد بہت ہی کم تھی یعنی 1946ء میں وہاں ان کی آبادی غالباً

25 فیصد سے بھی کم تھی۔۔۔غالباً پہلے ہر مقامی ہندو جماعتوں نے یہ افواہیں سن کر کہ مسلمان کسی قسم کا حملہ کرنے والے ہیں زبردست جوابی تیاریاں کرلی تھیں۔"(133)

"پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں زاہد چوہدری اسی دن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"گورنر کے مراسلوں اور متذکرہ رپورٹ میں صوبے کے مسلم لیگی وزیرِاعلیٰ سہروردی کی مستعدی اور پولیس اور فوج کے ساتھ حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کا جابجا تذکرہ کیا گیا۔ البتہ گورنر نے اس بات کو قابلِ اعتراض قرار دیا کہ پہلے روز پولیس کے کنٹرول روم میں سہروردی بذاتِ خود اپنے حمایتیوں کے ہمراہ موجود رہا جس وجہ سے پولیس کے افسر آزادانہ فیصلے نہ کرسکے۔ تاہم گورنر نے وائسرائے کو اس حقیقت سے بھی مطلع کیا تھا کہ "جانی نقصان ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کا زیادہ ہوا تھا۔"

19 اگست کو آزاد نے ویول کے ساتھ ملاقات میں بتایا کہ:

"اگرچہ جمعہ کے روز ہندوؤں کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا لیکن اس کے بعد سے مسلمانوں کو زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

21 اگست کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ "بنگال کانگرس کا خیال ہے کہ ساری گڑبڑ مسلم لیگ وزارت نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرائی ہے، لیکن مجھے ابھی تک اس کی کوئی تسلی بخش شہادت حاصل نہیں ہوسکی ہے۔"

اپنی نشری تقریر کے بعد ویول 24 اگست کو عبوری حکومت کا اعلان کرکے کلکتہ پہنچ گیا۔ مینن کے مطابق "ویول نے جو کچھ دیکھا اور سنا اس سے وہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ اگر جلد از جلد کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو کلکتہ جیسا کشت وخون سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔"

ویول، خواجہ ناظم الدین کے اس بیان سے متاثر ہوئے کہ اگر کانگرس یہ تسلیم کرلے کہ صوبے مشن منصوبہ کے 16 مئی کے بیان کے مطابق گروپس سے نکل سکتے ہیں تو تصفیے کی صورت ممکن ہے۔

27 اگست کی ویول، نہرو اور گاندھی ملاقات

ایسے میں 27 اگست کو ویول کی نہرو اور گاندھی سے ملاقات ہوتی ہے۔ ویول نے اس ملاقات میں نہرو اور گاندھی کو اس بیان کا مسودہ تھمادیا جو وہ چاہتا تھا کہ کانگرس کی طرف سے جاری ہو۔

"فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر کانگرس 16 مئی کے اعلان کی منشا کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے جس کے مطابق صوبے اپنے سیکشنوں یا گروپوں کے بننے کی صورت میں گروپوں سے علیحدگی کا اختیار اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک کہ 16 مئی کے اعلان کی دستاویز کے پیرا19 (viii) کے مطابق نیا آئین عمل میں نہ آچکا ہو اور اس کے تحت عام انتخابات منعقد ہو چکے ہوں اور پھر صوبے کی نئی قانون ساز اسمبلی بھی اس سلسلے میں فیصلہ دے چکی ہو۔"

اس ملاقات میں عدم تشدد کے مہاتما کا اصلی چہرہ کھل کر سامنے آتا ہے جب اس نے میز پر مکے مار مار کر کہا کہ:

"اگر ہندوستان خون میں نہانا چاہتا ہے تو اس کو نہانا چاہیئے" وہ ذرہ بھر بھی کلکتہ قتل و غارت پر پریشان نہیں ہوئے۔ بیورلے نکولس گاندھی کے عدم تشدد فلسفے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ایک ایسا اصول ہے، جس پر عمل کرنے کا نتیجہ لازمی طور پر ہمیشہ اتنے بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، جن کی پہلے مثال نہیں ملتی۔"

ایک دوسری جگہ وہ گاندھی کے فراڈ عدم تشدد پر کچھ اس طرح تنقید کرتے ہیں:

"گاندھی کی عدم تشدد پالیسی، شروع سے لیکر آخر تک، مجھے ایک فراڈ معلوم ہوتی ہے۔ یہ پالیسی ہمیں نہ صرف خونریزی کی جانب لے جاتی ہے (اور گاندھی کو اس کا علم ہے) بلکہ اپنے بنیادی اصولوں میں بھی قدم قدم پر وحشیانہ اور اندھی طاقت کے ساتھ سینکڑوں سمجھوتے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔"

ایسی ہی ملتی جلتی بات ویول نے بھی کہی کہ میں اپنی رائے میں گاندھی کے عدم تشدد کا جو مطلب سمجھا ہوں وہ کم و بیش خالصتاً منافقت ہے۔ وہ یقیناً جان بوجھ کر ایسی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں جس کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم بھی ہے اور اعتراف بھی کہ وہ خون خرابے کی جانب جاتی ہے"

اس ملاقات میں کی گئی گفتگو سے یہ اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ کیا واقعی کانگرس نے کیبنٹ مشن کو قبول کیا؟ کیونکہ یہ گفتگو سادہ اور عام فہم انداز میں ہوئی۔ ویول بار بار زور دیتے رہے کہ میں ایک سپاہی ہوں مجھے سیدھے اور صاف لفظوں میں بتائیں کیا آپ کیبنٹ مشن پلان مانتے ہیں؟

اس تمام گفتگو سے امام الہند کی اپنی کتاب میں دیدہ دلیری سے لکھے گئے غلط بیانات کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے جس میں موصوف مشن منصوبے کی ناکامی کی ذمہ داری نہرو کی جذباتیت پر مبنی ایک بدبختانہ بیان کو قرار دیتے ہیں۔

لیونارڈ موسلے مصنف 'دی لاسٹ ڈیز آف برٹش راج' نے سرکاری ریکارڈوں کی بناء پر اس کی دلچسپ تفصیلات کچھ اس طرح بیان کی ہیں:

"Wavell put the question frankly to Gandhi and Nehru: Will you give me the guarantee the Muslim league is asking for?

He was almost immediately plunged into the most difficult argument he had ever had with Gandhi, who choose this day to be at his most polemical and devious. Here was a saint who could, in his ashram, dispense great wisdom and counsel tolerance, understanding and the necessity to give rather than take. But on this evening he spoke purely and simply as Congress politician.

"Give me a simple guarantee that you accept the Cabinet Mission Plan," asked Wavell.

'We have already said that we accept it' replied Gandhi, but we are not prepared to guarantee that we accept it in the way that the Cabinet Mission set it out. We have our own interpretations of what they propose.'

Said Wavell: Even if those interpretations differ from what the Cabinet Mission intended?

Replied Gandhi: But of course. In any case, what the Cabinet Mission Plan really means is not what the Cabinet Mission thinks but what the interim Government thinks it means.

Wavell pointed out that the interim Government's opinion, as things were at the moment, would almost inevitably be pro-Congress and anti-Muslim League, since the League was boycotting the Government. How could it be unbiased?

Gandhi replied that he was not concerned with bias. He was simply concerned with the legal basis of the discussion. Legally, this was a matter for the interim Government to decide. Once the interim

Government was in power, such matters as the Muslim League's ambitions and artificial anxieties could be voted upon; but not before.

'But don't you see,' exploded Wavell, in an unusual burst of temper, 'it will be a Congress Government ! They are bound to be lacking in impartiality.'

Pandit Nehru interrupted at this point. 'You misunderstand the composition of the Congress party, your Excellency, not, I may say, for the first time. The Congress is not pro-Hindu or anti-Muslim. It is for all the peoples of India. It will never legislate against the interests of the Muslims.

Replied Wavell: But whose Muslims, Pandit Nehru? Yours, the Congress Muslims, the so-called stooges? Or those of the Muslim league? Can't you see that the necessity of this moment is to satisfy the Muslim League that you are not trying to do them down? It is a moment__ possibly the last we have__ to bring the League and the Congress together. And all I ask is a guarantee. Will the congress commit itself to a declaration, a declaration which will satisfy the Muslim League and assure the continuation of a stable and unitary Government? He reached into his drawer and pulled out a paper. 'this is what I have in mind'

The declaration ran thus: 'The Congress are prepared in the interest of communal harmony to accept the intention of the statement of 16 May [The Cabinet Mission Statement] that provinces cannot exercise any option affecting their membership of the sections or of the groups, if formed, until the decision contemplated in paragraph 19 (vii) of the Statement of 16 May is taken by the new legislature after the new constitutional arrangements have come into operation and the first general elections have been held.'

Gandhi handed it over to Nehru, who read it through and said:

To accept this is tantamount to asking Congress to put itself in fetters.'

Wavell replied: 'so far as the Cabinet Mission Plan is concerned , that is what I feel you should do. When Congress accepted the Cabinet Mission Plan in the first place, I cannot believe that you did so not knowing its implications. If so, why did you accept it at all? The plan for dividing the country into groups was implicit. You cannot now turn round and say that you did not realize that is what was intended.

Gandhi: 'What the Cabinet Mission intended and the way we interpret what they intended may not necessarily be the same.

'This is lawyer's talk.' Said Wavell. 'Talk to me in plain English. I am a simple soldier and you confuse me with these legalistic arguments.

Nehru: 'We cannot help it if we are lawyers.'

Wavell: 'No, but you can talk to me like honest man who are interested in India's future and welfare. Dammit, the Cabinet Mission made its intensions as clear as day light. Surely we don't need to go to law about that or split legal hairs, either. As a plain man, the situation seems to be simple. If Congress will give me the guarantee for which I ask, I think I can persuade Mr. Jinnah and the Muslim league to reconsider their refusal to join the interim Government. We need them in the Government; India needs them, and, if you are seriously concerned over the dangers of civil War __ and must know as well as I that the danger is great_______then you need them too. In the circumstances, I feel that it would be unwise, even perilous, if I allowed Congress to form an interim Government on its own.'

Gandhi: 'But you have already announced that the Government will come into being. You cannot go back on your own word now.

Wavell: 'The situation has changed. As a result of the killings in Calcutta, India is on the verge of civil war. It is my duty to prevent it. I will not prevent it if I allow Congress to form a Government which excludes the Muslims: they will then decide that direct action is the only way , and we shall have the massacre of Bengal all over again.'

Nehru: 'In other words, you are willing to surrender to the Muslim League' blackmail.'

Wavell (with great heat): For God's sake, man, who are you to talk of blackmail?"

ترجمہ:

"ویویل نے گاندھی جی اور نہرو سے سیدھے کہا:۔ کیا آپ مجھے وہ گارنٹی دیں گے جو مسلم لیگ چاہتی ہے"؟

اس پر تقریباً فوراً ہی گاندھی جی نے ویویل کو ایک ایسے الجھاؤ والے مباحثے میں ڈال دیا جیسا کہ لارڈ ویویل کے تجربے میں شاید کبھی نہیں آیا تھا۔ گاندھی جی مناظر دانی اور مبہم گوئی کا مجسمہ بن گئے تھے۔ وہ ایسے درویش تھے جن کا مشغلہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے آشرم میں فہم و بصیرت اور ضبط و برداشت کا اور سمجھوتہ اور اتفاق اور کچھ لینے سے زیادہ کچھ دینے کی نصیحت کر رہے ہوتے لیکن اس شام وہ ایک بڑے کانگرسی سیاست داں کی طرح بات کر رہے تھے۔

ویویل نے کہا "مجھے ایک سیدھی سادی گارنٹی دیجئے کہ آپ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر تے ہیں"۔

"ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہم اسے منظور کرتے ہیں، تاہم ہم یہ گارنٹی دینے کو تیار نہیں ہیں کہ ہم اسے اس روپ میں منظور کرتے ہیں جس میں اسے کیبنٹ مشن نے بتایا ہے، انھوں نے جو کچھ تجاویز رکھی ہیں ہمارے لیے ان کی اپنی تشریح ہے۔"

"تب ویویل نے کہا"! چاہے یہ تشریحات اس سے مختلف ہوں جو مشن کا منشا ہے!

گاندھی جی نے جواب دیا:۔ "لیکن بے شک 'میرے خیال میں' کیبنٹ مشن کا جو اصل منشاء ہے وہ، وہ نہیں ہے جو کیبنٹ مشن سوچتا ہے بلکہ وہ ہے جو انٹیرم گورنمنٹ سمجھے کہ یہی اس کا منشاء ہے"۔

ویویل نے کہا کہ:۔ انٹیرم گورنمنٹ کی رائے جیسا کہ ان دنوں حالات ہیں تقریباً یقینی طور پر کانگرس کی طرفداری والی ہو گی اور مسلم لیگ کی مخالف، کیونکہ لیگ گورنمنٹ کا بائیکاٹ کر رہی ہے، یہ تشریح جانبداری سے پاک کیونکر ہو سکتی ہے؟

گاندھی جی نے جواب دیا کہ ان کو جانبداری سے مطلب نہیں ہے! انھیں صرف بات چیت کی قانونی بساط سے غرض ہے قانونی طور پر عبوری حکومت اقتدار میں آجائے گی تب جہاں تک ان معلومات کا تعلق ہے جیسے کہ مسلم لیگ کے مقاصد یا مصنوعی خدشات تو ان پر عبوری حکومت میں ووٹنگ ہو گی، لیکن اس سے پہلے نہیں۔ "

ویویل نے غصے میں آکر اونچی آواز میں کہا:۔ "لیکن کیا آپ دیکھتے نہیں کہ وہ کانگرس کی ہی گورنمنٹ ہو گی"۔ وہ لوگ یقیناً غیر جانبدار نہیں ہوں گے۔

(یہاں پر پنڈت نہرو بیچ میں بولتے ہیں)

"آپ کو، یور ایکسیلینسی کانگرس کی ساخت کے بارے میں یہ غلط فہمی پہلی بار نہیں ہوئی ہے کہ کانگرس ہندو نواز یا مسلم مخالف نہیں ہے، یہ ہندوستان کے سارے لوگوں کے لیے ہے، یہ مسلمان کے مفاد کے خلاف کبھی قانون نہیں بنائے گی"۔

اس پر ویویل نے جواب دیا لیکن کس کے مسلمان پنڈت نہرو؟ کیا آپ کے مسلمان یعنی کانگرسی مسلمان جنھیں کٹھ پتلی کہا گیا ہے، یا مسلم لیگ کے مسلمان؟ کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ آج کی ضرورت مسلم لیگ کو رام کرنے کی ہے، ان کو یقین دلانے کی کہ آپ ان کو زیر کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں، یہ وہ موقع ہے اور شاید آخری موقع کہ ہم لیگ اور کانگرس کو یکجا کریں، میں جو چاہتا ہوں وہ ہے یہ گارنٹی کیا کانگرس ایک اعلان میں ایک ایسی گارنٹی دے گی جو مسلمانوں کو اطمینان دلائے اور ایک دائمی، یک وحدتی حکومت، کے بنے رہنے کی ضامن ہو۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ ویویل نے اپنا دراز کھولا اور اس میں سے ایک (لکھا ہوا) کاغذ نکالا اور کہا: یہ ہے جو میں چاہتا ہوں۔

کاغذ میں بیانیہ اس طرح لکھا تھا "فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی خاطر کانگرس 16 مئی کے اعلان کی منشا کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے جس کے مطابق صوبے اپنے سیکشنوں یا گروپوں

کے بننے کی صورت میں گروپوں سے علیحدگی کا اختیار اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک کہ 16 مئی کے اعلان کی دستاویز کے پیرا19 (vii) کے مطابق نیا آئین عمل میں نہ آچکا ہو اور اس کے تحت عام انتخابات منعقد ہو چکے ہوں اور پھر صوبے کی نئی قانون ساز اسمبلی بھی اس سلسلے میں فیصلہ دے چکی ہو۔"

گاندھی جی نے اس کاغذ کو نہرو جی کو دے دیا جنھوں نے اسے پڑھنے کے بعد کہا: اسے تسلیم کرنا اس بات کے مترادف ہے کہ کانگرس کو کہا جائے کہ وہ اپنے آپ کو بندشوں میں جکڑ لے۔

ویویل نے جواب دیا: "جہاں تک کیبنٹ مشن پلان کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں آپ کو یہی کرنا چاہیے۔ اولاً جب کانگرس نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کیا تھا تو میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت آپ نے اس کے مضمرات کو سمجھے بغیر ایسا کیا تھا، اگر یہ بات نہیں ہے تو آپ نے اسے منظور ہی کیوں کیا۔ ملک کو گروپس میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پلان میں مضمر تھا اب آپ پیچھے پھر کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے سمجھا نہیں تھا کہ مطلب کیا تھا۔"

گاندھی: کیبنٹ مشن کا جو مقصد تھا اور ہماری تشریح کے مطابق ان کا جو منشاء تھا ضروری نہیں ہے کہ دونوں ایک ہی ہوں۔

ویویل نے کہا: یہ محض وکیلانہ موشگافی ہے۔ مجھ سے سیدھی سادی زبان میں گفتگو کریں۔ میں سیدھا سادا سپاہی ہوں۔ آپ مجھے قانونی حجت بازی میں الجھانا چاہتے ہیں

نہرو: اس بات کا کیا علاج کہ ہم وکیل بھی ہیں؟

ویویل: نہیں، مگر آپ مجھ سے ایک ایسے ایماندار آدمی کی طرح بات کر سکتے ہیں، جسے ہندوستان کا مستقبل اور بہبود عزیز ہو، خدارا! کیبنٹ مشن نے اپنا مقصد روز روشن کی طرح صاف کر دیا تھا۔

یقیناً ہمیں اس کے لیے قانون دانوں کے پاس جانے اور بال کی کھال نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، ایک صاف آدمی کی حیثیت سے معاملہ میری نظر میں سیدھا ہے، اگر کانگرس مجھے وہ ضمانت دے سکتی ہے جو میں مانگ رہا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں مسٹر جناح کو تیار کر سکوں گا وہ عبوری حکومت میں اپنے شمولیت کے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ ہم کو حکومت میں ان کی ضرورت ہے، ہندوستان کو ان کی ضرورت ہے اور اگر آپ خانہ جنگی کے خطروں سے آگاہ ہیں تو آپ کو جاننا چاہیے جیسا کہ میں جانتا ہوں کہ خطرہ واقعی مسلم ہے، تو

آپ کو بھی ان کی ضرورت ہے، ان حالات میں میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات غیر دانش مندانہ ہوگی بلکہ خطرے والی بھی کہ میں اکیلے کانگرس کو عبوری حکومت بنانے دوں۔

گاندھی :لیکن آپ نے تو پہلے اعلان کر دیا ہے کہ انٹیرم گورنمنٹ بنے گی۔ آپ اپنی بات سے مڑ نہیں سکتے۔

ویویل۔ حالات بدل گئے ہیں، کلکتہ کے خونی واقعات کے بعد ہندوستان خانہ جنگی کے ساحل پر کھڑا ہے، میرا یہ فرض ہے کہ میں اسے روکوں، لیکن میں اسے روک نہیں پاؤں گا، اگر میں کانگرس کو ایک ایسی حکومت بنانے دوں جس میں مسلمان شامل نہ ہوں، ایسا ہونے پر وہ (مسلمان) سوچیں گے کہ راست اقدام ہی ان کا واحد راستہ ہے، اور پورے بنگال میں پھر سے قتل وخون گا۔

نہرو :دوسرے لفظوں میں آپ مسلم لیگ کے بلیک میل کے آگے گھٹنے ٹیکنے کو تیار ہیں۔"

ویویل (بڑے طیش میں) خدا کے لیے جناب! آپ کون ہوتے ہیں بلیک میل کی بات کرنے والے؟

اس کے بعد موسلے نے لکھا ہے:

"So for as Nehru and Gandhi were concerned, it was the end of Wavell as a Viceroy with whom they could deal. That night both of them sat down to write letters. Gandhi first penned a cable to Mr Attlee, the Labour Prime Minister, in which he expressed concern over the Viceroy's state of mind. He was, he said, 'unnerved owning to the Bengal tragedy.' He needed to be bolstered by 'an abler and legal mind."

"جہاں تک نہرو اور گاندھی کا سوال تھا، ویویل کا ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت میں یہ آخری موقع تھا کہ جس میں انھیں (نہرو اور گاندھی سے) نمٹنا ہوتا"۔

"اس رات دونوں (گاندھی اور نہرو) خط لکھنے بیٹھ گئے۔ گاندھی نے پہلے ایٹلی کے نام ایک کیبل روانہ کیا جس میں انھوں نے وائسرے کی دماغی حالت کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا۔

انھوں نے لکھا وائسرائے بنگال کے حادثے کی وجہ سے بوکھلا گئے ہیں، انھیں ایک زیادہ باصلاحیت اور قانون داں مشیر کی ضرورت ہے"۔(134)

اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ویول اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ:

"The old man was in a legalistic and malevolent mode, and Nehru was full of hate against the League."

"بڈھا حجت بازی اور خباثت کے موڈ میں تھا اور نہرو لیگ کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا تھا"

مزید لکھتے ہیں کہ:

"Gandhi said that if a blood bath was necessary, it would come about in spite of non violence. I said that I was very shocked to hear such word(135)

Lord Wavell always used to say that on this occasion Gandhi Thumped the table and said , if India wants her blood bath she will have it."

ویول جب کبھی اس ملاقات کو یاد کرتا تو ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ گاندھی میز پر ہاتھ مار مار کر کہتا تھا کہ "اگر ہندوستان خون میں نہانا چاہتا ہے تو اس کو نہانا چاہیے"

(Editor Note page 341)

ویول گاندھی کی اس دھمکی کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"It confirmed the view I have always held of Gandhi, that this profession of non violence and saintliness are political weapons."

ویول کے علاوہ وزارت ہند کے دوسرے حکام نے بھی کانگرس کی طرف سے مشن منصوبے کی غلط تعبیر پر تنقید کی۔ وزیر ہند کے معاون ایف۔ ایف ٹرنبل نے 30 اگست کو تحریر کردہ اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ:

ساری مشکل ہی یہاں سے پیدا ہوئی کہ ہم نے آزاد کے 25 جون کے خط کو وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اس نے کانگرس مجلس عاملہ کی 24 مئی کی قرارداد سے لیکر واردھا کی قرارداد تک کانگرسی رہنماؤں کے خطوط، بیانات، ملاقاتوں کا احاطہ کیا اور کہا کہ شروع سے آج تک کانگرس نے جو تعبیر کی تھی وہ اسی پر قائم ہے، غلطی ہماری ہے کہ ہم نے اس تعبیر کو قبولیت بخش دی۔ "کانگرس چاہتی تھی کہ کسی طرح مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی سے باہر نکال دے اور فی الوقت وہ اس میں کامیاب رہی ہے"۔

اس نوٹ پر نائب وزیر ہند ڈی۔ ٹی۔ مونٹیتھ نے لکھا ہے کہ:

"مشن نے اسی طرح دھوکا کھایا ہے جس طرح ڈاکٹر امبید کر نے 1932ء میں پونا پیکٹ (معاہدہ پونا) میں کھایا تھا اور اسی سنگدل اور ریاکار سرغنے کے ہاتھوں کہ جو دونوں موقعوں

پر پس منظر میں پر تشدد اقدام اٹھانے کی دھمکی کے بلیک میلنگ عنصر کے ساتھ گھات لگائے بیٹھا رہا تھا۔"(136)

سیر وائی ے مطابق لیگ کی کیبنٹ مشن سے دستبرداری کانگرس کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اب کانگرس مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر حکومت بنا سکتی تھی۔ گاندھی، نہرو اور پٹیل کی وہ مساعی جو انھوں نے عبوری حکومت کو ایک خود مختار کابینہ بنانے کے لیے کیں تاکہ وائسرائے کے ویٹو سے نجات حاصل کی جاسکے، اس حقیقت کی غمازی کرتی ہیں کہ کانگرس فوج، بحریہ اور فضائیہ کے کنٹرول سمیت مرکزی حکومت کی تمام مشینری پر اپنا قبضہ مکمل کر کے انگریزوں کی رُخصتی کے بعد مسلمانوں سے نمٹنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ذرا سوچیے کہ اس صورت میں کانگرس مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی۔ نہرو اور گاندھی کے پاس وہ تمام پتّے موجود تھے جو بازی جیتنے کے لیے ضروری تھے۔ اگر کوئی کمی تھی تو صرف ایک پتّے کی تھی۔ کانگرس کو اعتماد تھا کہ وہ اُسے بھی حاصل کر لے گی۔ یہ پتّا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے خود مختار کابینہ کا حصول تھا۔ ایک ایسی کابینہ جس کے فیصلوں کی پابندی وائسرائے پر لازمی ہوتا کہ کانگرس اپنے فیصلوں پر عمل درآمد کرا سکے۔ ویول کی علیحدگی اور وائسرائے کے طور پر ماؤنٹ بیٹن کی تقرری نے کانگرس کی فتح کو مزید قریب کر دیا۔ چنانچہ کانگرس نے ایگزیکٹو کونسل کو خود مختار کابینہ بنوانے کے لیے اپنی مساعی تیز تر کر دی اور ماؤنٹ بیٹن پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وائسرائے کو کابینہ، یا اس کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے۔

19 مئی 1947ء کو دہلی میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے پٹیل نے اپنے مخصوص اور بے لاگ انداز میں اس مقصد کو بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ وائسرائے کو باہر رکھتے ہوئے موجودہ مرکزی حکومت کو "جیسی کہ وہ اب ہے" اقتدار منتقل کر دیا جائے تو ہندوستان کا سیاسی، بحران فوری طور پر حل ہو جائے گا اور یہ اقدام ملک میں فوری طور پر امن کا پیغام لے کر آئے گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر کابینہ میں کسی وقت کوئی اختلاف ہوا تو اکثریت کو بالادستی حاصل ہو گی۔ مختصراً یہ کہ پٹیل اور کانگرس مسلمانوں پر ہندو راج کا تسلط چاہتے تھے اور یہی وہ صورت حال تھی جس کے سدّباب کے لیے مشن پلان میں گروپنگ کی شقیں رکھی گئیں تھیں۔"(137)

جناح صاحب کی آبرومندانہ تصفیے کی آخری ناکام کوشش

یہ جناح صاحب کی وہ آخری کوشش تھی کہ متحدہ ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے کوئی آبرومندانہ حل تلاش کیا جائے۔ 1920ء سے شروع ہونے والی داستان، 1928ء اور 1937ء سے ہوتے ہوئے 1946ء میں اختتام پذیر ہوئی۔ اب جناح صاحب کے پاس پاکستان کے علاوہ اور کوئی آپشن نہیں رہا تھا۔

اس کے بعد محض تفصیلات ہیں بنیادی طور پر فیصلہ یہیں پر ہو چکا تھا کہ اب پاکستان بن کر رہے گا۔ ویول کے بعد ماؤنٹ بیٹن، کانگرس کے فرمائشی پروگرام کے مطابق وائسرائے بن کر آئے، کس طرح کانگرس کے ساتھ مل کر تقسیم کا پروگرام بنایا گیا اور کس طرح جناح صاحب کو اندھیرے میں رکھا گیا اس کی وضاحت دوسرے حصے میں آ چکی ہے۔ زیادہ وضاحت میں اس لیے جانے کی ضرورت نہیں کہ ہم یہ دیکھنا چاہ رہے تھے کہ جب جب جناح صاحب گاندھی، کانگرس اور ہندو لیڈرشپ سے مایوس ہوئے یا ان سے فاصلے بڑھائے جس کا حتمی انجام پاکستان کی صورت میں ہمیں نظر آتا ہے، تو وہاں جناح صاحب کیوں اور کیسے غلط تھے؟

جناح صاحب نے 1920ء میں جب کانگرس چھوڑ دی، کیا اس وقت خلافت تحریک اور عدم تعاون کی حمایت سے انکار کرنا جناح صاحب کی غلطی تھی؟

1928ء میں جب ہندو لیڈرشپ سے مایوس ہوئے اور کلکتہ تقریر کو جس طرح والپرٹ جناح صاحب کی تقریر کو قوم پرست جناح کا الوداعی نغمہ کہتے ہیں، اس وقت جناح صاحب نے کونسی غلط بات کی؟ جب جناح صاحب کہتے ہیں میں ایک مسلمان نہیں ایک ہندوستانی ہو کر یہ کہتا ہوں کہ اقلیت اکثریت کو کچھ نہیں دی سکتی۔ جب جناح صاحب کہتے ہیں ہم سب اس دھرتی کے بیٹے ہیں۔ ہمیں اکٹھا رہنا ہے۔ ہمیں مل جل کر کام کرنا ہے، اور ہمارے جو بھی اختلافات ہوں، بہر کیف ہمیں مزید رنجش پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم متفق نہیں ہو سکتے تو چلیں کم سے کم اختلاف پر ہی متفق ہو جائیں۔ لیکن ہمیں دوستوں کی طرح رہنا چاہیے۔

جب جناح صاحب کہتے ہیں ہندو مسلم اتحاد سے بڑھ کر کوئی چیز مجھے خوشی نہیں دے سکتی۔ اس تقریر پر موجمدار کہتے ہیں کہ ایسی تقریر ہندو مسلم اتحاد کا سفیر ہی کر سکتا ہے۔

جناح جو رونے کے معاملے میں کبھی فیاض نہیں رہے، منصور احمد کے مطابق جناح کی زندگی کا یہ ایک نادر لمحہ تھا جب کسی نے جناح کو منظر عام پر آنسو کے ساتھ دیکھا ہو۔

بدلے میں جناح صاحب کو کیا ملا؟ ہندو مہاسبھائی اور کانگرسی لیڈروں نے جناح کی اپیلوں پر کان دھرنے کے

بجائے جناح صاحب کے 14 نکات اور مطالبات کو مضحکہ خیز اور فرقہ پرستی کا مغلوبہ قرار دیا۔

کیا 1937ء میں کانگرس کے ساتھ مل کر چلنے کی جناح صاحب کی خواہش و کوشش غلط تھی جس کا جواب کانگرسی ہائی کمان نے اپنے منسٹروں کے ذریعے یہ دیا کہ جناح صاحب کے ساتھ کسی قیمت پر کوئی راہ رسم نہیں رکھنا اور بدلے میں لیگ کو توڑنے کی پوری کوشش کی گئی۔

46-1945ء کے الیکشن میں پاکستان کے نام پر جیتنے کے باوجود جناح صاحب کیبنٹ مشن کو ایک موقع دیتے ہیں بدلے میں جس طرح دھوکا دیا گیا کیا وہاں جناح صاحب غلط تھے؟

راست اقدام سے پہلے تو چھوڑیں راست اقدام کے بعد بھی ویول کے ساتھ گاندھی اور نہرو کی ملاقات میں بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندو بورژوا مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں حالانکہ گروپنگ کی صحیح توجیہہ پر جناح اس وقت بھی تصفیے پر آمادہ تھے۔

جناح صاحب کیبنٹ مشن مان کر کم از کم دس سال تک کے لیے تو مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے اگر کانگرسی لیڈر شپ واقعی اتنی ہی روادار تھی، مسلمانوں کے حقوق کی اتنی ہی محافظ تھی جو وہ بیان کرتے آئے تو ان کے لیے مسئلہ نہیں تھا کہ ان دس سالوں میں اپنے روّیے سے یہ ثابت کرتے۔ اگر مسئلہ صرف جناح ہی تھا جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں تو ستر سالہ جناح نے مزید کتنے سال زندہ رہنا تھا؟

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب مزید کتنا اور کیوں لچک دکھاتے؟ اس کے بعد لچک کی نہیں قطعی اطاعت والی بات رہ جاتی تھی راست اقدام سے ایک دن پہلے 15 اگست کو جناح نہرو مذاکرات ناکام ہوئے تو نہرو نے اپنی جناح کے ساتھ ملاقات کی ناکامی کا تمام تر سبب "لیگ کی جانب سے عدم تعاون" کو قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ "تعاون کے لیے ہمارے دروازے اب بھی کھلے ہیں" جناح صاحب نے جواب میں کہا کہ "لیگ کے عدم تعاون" کے بجائے دراصل نہرو کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ "کانگرس کے دروازے کھلے ہیں، مسلم لیگ آکر قطعی اطاعت قبول کرے"

سیروائی تقسیم ہند کے ذمہ داروں کا تعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "بدقسمتی سے جو لوگ جناح پر ہندوستان کے اتحاد کو تباہ کرنے کا الزام لگاتے ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ کیسے ہوا کہ وہ شخص جو 1938ء تک 61 برس کی عمر میں نیشنلسٹ یعنی قوم پرستانہ حل چاہتا تھا وہ اچانک کیسے فرقہ پرست بن گیا۔ بہت کچھ ہوا جس کے سبب کانگرس نیشنلسٹ اور قوم پرست اور 1916ء کا ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر اور 1938ء کا نیشنلسٹ تقسیم کا حامی اور پاکستان کا خالق بن گیا۔ میرا خیال ہے کہ اب تازہ مواد ملنے کے بعد ہم اس

سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔جناح نے ہوم رول لیگ اس لیے چھوڑی کہ کانگرس اور گاندھی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، کیونکہ وہ گاندھی کے مذہب کو سیاست میں لانے کے سخت خلاف تھا۔اس لیے بھی کہ وہ سوراج (آزادی) کے حصول کے لیے غیر آئینی ذرائع استعمال کرنے کو بھی ناپسند کرتا تھا۔بقول منشی، جناح سمجھتا تھا کہ عوام میں تشدد کو اُبھارنے کا نتیجہ دونوں قوموں میں تصادم کی صورت میں نکلے گا اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا۔ حقائق کے شاندار ادراک کے سبب اُس نے اِس نقطے پر گاندھی سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

"یہ سمجھنے کے لیے کہ آیا جناح اور مسلم لیگ تقسیم ہند کے ذمہ دار تھے، ہمیں اپنے آپ سے دو سوالات پوچھنے چاہیں اور پھر اُن کا جواب دینا چاہیے۔کیا مسلمانوں کا یہ خوف کہ وہ ہندوراج کے مستقل محکوم ہوں گے درست تھا؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیا یہ قوم مستقل غلامی کے پیش نظر کاغذی تحفظات کے بجائے مؤثر تحفظات کی مستحق تھی؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا خوف جائز تھا۔ڈیسائی لیاقت معاہدہ، سپرو کمیٹی رپورٹ، آزاد کا خط بنام گاندھی، اُس کا کابینہ مشن کے سامنے انٹرویو اور مشن کے رُوبرو نیشنلسٹ مسلمانوں کا بیان، اُن تمام نے تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے خدشات جائز ہیں۔خود کابینہ مشن بھی مطمئن تھا کہ مسلمانوں کے خطرات و خدشات درست بھی ہیں اور شدید بھی، اور یہی مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔البتہ سپر و کمیٹی، مولانا آزاد، نیشنلسٹ مسلمانوں اور کابینہ نے مسلمانوں کے خوف و خدشات کو تسلیم کر کے پاکستان کو بطور "حل" مسترد کر دیا۔

کابینہ مشن کے سامنے پیش ہونے والے تمام گواہوں نے، ماسوا مسلم لیگ کے، متحدہ ہندوستان کے لیے آئین کی حمایت کی۔اسی طرح اُن میں سے بہت سے گواہوں نے مسلمانوں کے ہندوراج کے خوف کو درست تسلیم کرتے ہوئے مؤثر تحفظات تجویز کیے۔ پیرٹی (مساوات)، یا قریب تر مساوات اور کم سے کم فیڈریشن مؤثر تحفظات قرار دیے گئے۔ اگر کابینہ مشن پلان کو مشن کی مرضی اور نیت کے مطابق خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ چلایا جاتا تو یہ بھی مؤثر تحفظ ہو سکتا تھا اور اسی لیے جناح نے اسے قبول کر لیا تھا۔

بہر حال ہندو مہا سبھا اور ہندوؤں کے ممتاز راہنماؤں مثلاً گاندھی، نہرو اور پٹیل نے آزاد، سپرو اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے نکتہ نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے مساوات (پیرٹی) کو غیر جمہوری قرار دے دیا، کیونکہ اُن کے نزدیک جمہوریت کا مطلب ایک انسان ایک ووٹ تھا۔ وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اعلیٰ ترین مقصد نئے آئین میں متحدہ ہندوستان کا حصول تھا۔ اُصولوں کو ضرورت کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس لیے نو کروڑ کی قوم کو تحفظات دیے جانے چاہیے تھے۔ جب ایس پی مکرجی اور بھوپا ٹھکر (ہندو سبھا) کرپس اور الیگزینڈر سے 15 اپریل 1946ء کو ملے تو کرپس نے یہ نکتہ اُٹھایا ہندو ہندوستان میں اکثریت میں ہیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ رعایتیں دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اکثریت کی حکومت کے اُصول کو جس کا مہا سبھا نے مطالبہ کیا ہے، کسی ایسے معاشرے میں جہاں مستقل اکثریت اور مستقل اقلیت بستی ہو، شکل بدلے بغیر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔"

(بحوالہ ٹرانسفر آف پاور جلد ہفتم صفحہ نمبر 271)(138)

کانگرس ایک قومی پارٹی؟ انڈیا ایک سیکولر ریاست؟

1937ء میں جب کانگرس نے جناح صاحب کے تعاون کی پیشکش کو ٹھکرایا تو اس وقت جناح صاحب پوری طرح قائل ہوگئے تھے کہ کانگرس ہندوؤں ہی کی پارٹی ہے ان کے خیال میں ہندو مہا سبھا صاف گو تھے وہ الفاظ کا کھیل نہیں کھیلتے صاف الفاظ میں اپنے اس مؤقف کو بیان کرتے ہیں البتہ کانگرس اس ڈھونگ کا مظاہرہ قوم پرستی کے نام کرتی ہے۔ منشا مقصد دونوں کا ایک ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے البتہ طریقہ کار مختلف ہے۔ جناح صاحب کی تقریر کچھ اس طرح تھی:

> "اس قدر معمولی طاقت اور اختیارات ملنے پر اکثریتی فرقے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ کانگرس صرف اس ڈھونگ کا مظاہرہ قوم پرستی کے نام پر کر رہی ہے جب کہ ہندو مہاسبھا الفاظ کا یہ کھیل نہیں کھیلتی۔ میں یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہوں کہ کانگرس کی موجودہ پالیسی کا نتیجہ طبقاتی تلخی، فرقہ وارانہ تصادم اور استعمار کی طاقت میں اضافہ ہی ہوگا۔"

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ جناح صاحب کے یہ الفاظ کس قدر حقیقت پر مبنی تھی۔ دوسروں کی تو چھوڑیں خود آزاد کی " آزادی ہند " پڑھ کر دیکھا جائے تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ موصوف کی کتاب کے جو 30 صفحات " قومی مفاد " میں 30 سال تک چھپائے گئے اور جا کر 1988ء میں کتاب کا حصہ بنائے گئے وہ

قومی مفاد" کیا تھا؟

وہ "قومی مفاد" یہی تھا کہ اگر 1958ء میں وہ باتیں چھپتیں تو تقسیم کے "اکلوتے ولن" جناح صاحب سچے ثابت ہوتے۔ 1959ء اور 1988ء کے ایڈیشن کے فرق پر منصور احمد (انڈین مسلم) کا تبصرہ کچھ اس طرح ہے۔

"مولانا آزاد کی کتاب انڈیا ونس فریڈم کے غیر ترمیم شدہ متن یعنی 1988ء ایڈیشن کو نظر غائر سے پڑھنے پر بین السطور میں پایا جاتا ہے کہ آخری دنوں میں مولانا آزاد نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ کانگرس میں خود ان کا وزن اب واجب ہی واجب سا تھا، بلکہ سارے عملی مقاصد کے لیے کانگرس ایک ہندو جماعت تھی۔ بین السطور یعنی بیٹوین دالائنز پڑھنا اس لیے ضروری ہے کہ مولانا نے اتنا ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اصل سطروں میں ان کے اصل احساسات تک پہنچنے کی صورت ہی کیا ہے۔

سیروائی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا" آزاد کے انڈیا ونس فریڈم کے 1959ء ایڈیشن کو لاتعداد مرتبہ پڑھنے کے بعد اور 1988ء ایڈیشن کو بھی ایک سے زیادہ دفعہ پڑھنے کے بعد۔۔۔ میرے خیال میں ان صفحات نے جو 1959ء میں روک لیے گئے تھے اور پھر 1988ء ایڈیشن میں بحال کر دیے گئے، پوری کتاب کے مزاج کو بدل ڈالا ہے"

ممبئی اور بہار میں جب وزارتیں بنی ہیں تو اگر میرٹ دیکھا جاتا اور کانگرس کے اس دعوے کو دیکھا جاتا کہ وہ ایک قومی جماعت ہے جس میں کسی قسم کی مذہبی تعصب کا کوئی عمل دخل نہیں تو ممبئی میں ایک پارسی مسٹر نریمن اور بہار میں ایک مسلمان ڈاکٹر سید محمود کو وزیر اعلیٰ بننا چاہیے تھا۔ لیکن عملاً ہوا کیا؟ دونوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا اور ہندوؤں کو وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔

امام الہند اپنے پہلے ایڈیشن میں پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ لیگ کے پیرپور رپورٹ، شریف رپورٹ اور فضل حق رپورٹ جس میں کانگرسی وزارتوں کے خلاف لیگ کے شکایات کی تفصیلات تھیں، کو مطلقاً بے بنیاد قرار دیتے ہیں اور یہاں تک لکھتے ہیں اگر ان الزامات میں جان ہوتی تو وہ استعفیٰ دینے تک کو بھی تیار تھے۔

اپنے پہلے ایڈیشن میں لکھتے ہیں:

> میں تو اپنے ذاتی علم اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کے جو الزامات مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی طرف سے لگائے جاتے تھے، وہ مطلقاً بے بنیاد تھے، اگر ان الزامات میں ذرا سی بھی سچائی

ہوتی تو میں اس پر پوری توجہ صرف کرتا تا کہ ناانصافی کا تدراک ہو جائے ایسے کئی سوال پر میں استعفٰی تک دینے کو تیار تھا۔

آگے لکھتے ہیں کہ:

"بہر حال ایک حقیقت مجھے واضح کر دینی چاہیے، بہار اور ممبئ کی صوبائی کانگرس کمیٹیوں نے ڈاکٹر سید محمود اور نریمن کو مقامی قیادت سے محروم رکھ کر غلطی کی تھی اور ورکنگ کمیٹی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ اس غلطی کا تدراک کر سکے۔"

یہ تو ہو گئی پہلے ایڈیشن کی بات۔ دوسرے ایڈیشن میں وہ اس معاملے پر تفصیلی نظر کچھ اس طرح ڈالتے ہیں:

"ممبئ میں مسٹر نریمن مقامی کانگرس کے مصدقہ لیڈر تھے، جب صوبائی حکومت کے قیام کی بات آئی تو عام طور پر یقین کیا گیا کہ مسٹر نریمن کو ہی (ان کے شہرت اور ریکارڈ کے بنا پر) اس کی سربراہی کرنے کو کہا جائے گا، لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک پارسی کو چیف منسٹر بنایا جاتا جب کہ اسمبلی میں کانگرسی ممبران کی اکثریت ہندوؤں کی تھی، سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اس پر اپنے کو راضی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنا کانگرس کے ہندو حامیوں کے حق میں نامناسب ہو گا، انھیں اس سرفرازی سے محروم رکھا گیا، لہذا بی۔ جی کھیر کو منظر عام پر لایا گیا اور وہی کانگرس اسمبلی پارٹی کے سربراہ (یعنی چیف منسٹر منتخب ہوئے"۔

اسی طرح 1988ء ایڈیشن میں ڈاکٹر سید محمود کے بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

"اسی طرح کا ایک واقعہ بہار میں پیش آیا، ڈاکٹر سید محمود کانگرس کے سربراہ لیڈر تھے، وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک جنرل سکریٹری بھی تھے، اس طرح اس صوبے میں اور اس کے باہر بھی ان کا اپنا ایک مقام تھا، بہار میں جب کانگرس قطعی اکثریت لے آئی تو سبھوں نے یہ مان لیا تھا کہ ڈاکٹر سید محمود ہی لیڈر منتخب کیے جائیں گے، اور وہی بہار کے پہلے چیف منسٹر بنیں گے، لیکن ایسا نہ کر کے شری کرشن سنہا جو مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے انھیں بہار میں واپس بلایا گیا اور چیف منسٹر شپ کے لیے تیار کیا گیا، بہار میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی رول ادا کیا جو ممبئ میں سردار پٹیل نے کیا تھا، بہار اور ممبئ میں فرق صرف یہ تھا کہ جب شری کرشن سنہا نے یہاں سرکار بنائی تو ڈاکٹر سید محمود کو کیبنٹ میں جگہ دی گئی۔"

سیروائی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"نریمان اور سید محمود کے واقعات سے آزاد نے جو یاس آمیز نتیجہ اخذ کیا ہے، اس پر گفتگو کرنے سے پہلے میں 1988ء کے ایڈیشن میں شامل ایک نئے اقتباس کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو میرے نزدیک آزاد کے اخذ کردہ نتیجے سے متعلق ہے۔ آزاد نے لکھا کہ "گاندھی جی کی آشیر باد سے پہلے راجندر پرشاد کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی اور یہ کہ وہ مکمل طور پر گاندھی کی تخلیق ہیں۔"

آزاد مزید لکھتے ہیں کہ:

"مجھے ایک قابل اعتماد ذریعے سے پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر سچی دانند اسنہا نے ایک ڈنر کا اہتمام کیا جس میں نمایاں حیثیت کے حامل ہندوؤں کی بڑی تعداد کو گاندھی جی سے ملاقات کے لیے مدعو کیا گیا۔ انھوں نے گاندھی جی کو بتایا کہ بہار کے ہندو عدم تعاون کی تحریک میں شرکت کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ گاندھی جی کسی ہندو کو لیڈر منتخب کرلیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہ محض اپنی صواب دید پر کسی کو قیادت نہیں سونپ سکتے، لیکن انھوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی اہل اور باکردار ہندو سامنے آیا تو وہ اس کی ضرور مدد کریں گے۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سیروائی لکھتے ہیں کہ "قارئین یہ سوال کرسکتے ہیں کہ آزاد نے نریمان اور سید محمود کے واقعات اور اپنے اس موقف کو کہ ڈاکٹر راجندر کی سیاسی حیثیت خاص طور پر گاندھی کی مرہونِ منت تھی 30 برس چھپا کر قومی مفاد کو کس نقصان سے بچایا؟

سیروائی کے مطابق:

"اگر آزاد 1959ء میں ان خیالات کا اظہار کردیتے تو ایک کٹر قوم پرست مسلمان کی طرف سے جو 1940ء سے 1946ء کے نازک دور میں کانگرس کا صدر رہا ہو، اس طرح کی رائے سامنے آنے سے بیرونی دنیا میں کانگرس کا امیج بری طرح متاثر ہوتا اور پاکستان میں اس رائے کو جناح کے اس قول کی تائید کے ثبوت کے طور پر سراہا جاتا کہ کانگرس نے 1937ء ہی میں یہ اعلان کردیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آزاد نے سوچا ہوگا کہ 1959ء میں کانگرس کے بارے میں اپنے سچے خیالات کا اظہار کرکے پاکستان کو بالواسطہ مدد فراہم کرنا قومی مفاد کے لیے ضرررساں ہوگا۔"

افسوس ناک بات یہ ہے آج یہاں پاکستان میں بیٹھ کر اس کم ہمت اور بددیانت انسان کے فِدآئین ہمیں وقتاً فوقتاً اس کی عظمت تسلیم کرانے کے لیے کوششیں کرتے نظر آتے ہیں جو دنیا سے جاتے ہوئے بھی سچ بولنے کی ہمت نہیں کرسکا اور کچھ ایسی سچائیاں جو اس کے اپنے علم میں تھیں ان کو ڈسکلوز کرتے وقت بھی

ہندوستان کے مفادات کا خیال رکھا۔

اس تمام بحث کے بعد جناح صاحب کے وہ الفاظ ذرا دوبارہ پڑھیں جو انھوں نے 1937ء میں کہے تھے:

"اس قدر معمولی طاقت اور اختیارات ملنے پر اکثریتی فرقے نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ کانگرس صرف اس ڈھونگ کا مظاہرہ قوم پرستی کے نام پر کر رہی ہے جب کہ ہندو مہاسبھا الفاظ کا یہ کھیل نہیں کھیلتی۔"

باپو اور ہندو لیڈر شپ کا "ہندو چہرہ" اس وقت بھی کھل کر سامنے آ گیا جب کہ جناح صاحب، مکمل بنگال اور پنجاب نہ ملنے پر اس بات پر اتفاق کر گئے کہ متحدہ بنگال اگر علیحدہ ریاست بنے تو انھیں اعتراض نہیں ہو گا۔ گاندھی نے جب اس سلسلے میں سرت چندر بوس، سہروردی سمیت دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کی تو پیارے لال کے مطابق گاندھی نے اس بات پر اصرار کیا کہ متوقع متحدہ بنگال میں حکومت کے ہر اقدام کو ہندو اقلیت (انتظامیہ اور مقننہ میں) کے کم از کم دو تہائی کے حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔

اس پر زاہد چوہدری اپنی کتاب "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی کا مطالبہ ان غیر جانبدار مبصرین کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ "مہاتما" کی سیاست فی الواقع جمہوری ہے اور مذہب سے بالاتر ہے۔ گاندھی برصغیر کی ہر لحاظ سے پسماندہ تقریباً 25 فیصد مسلم اقلیت کو تو ان کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی حقوق کی ضمانت پر تو آمادہ نہیں تھا لیکن وہ بنگال کی 45 فیصد طاقتور ہندو اقلیت کے لیے بے پناہ سیاسی تحفظات کا خواہاں تھا حالانکہ یہ ہندو اقلیت سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی لحاظ سے 55 فیصد مسلمانوں سے کہیں آگے تھی۔ جو شرط گاندھی نے پیش کی تھی اس کے تحت بنگال میں حکومت کا سارا اختیار ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا اور اس کا جواز یہی ہو سکتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مختلف ہیں۔ گویا وہ کل ہند سطح پر تو ہندو مسلم تضاد کی حقیقت سے انکار کرتا تھا لیکن متحدہ بنگال کی ریاست میں اسے یہ تضاد اپنی آنکھ کا شہتیر نظر آتا تھا۔"

جب ہندوستان کو آزادی ملی تب آزادی کی تقریبات میں ہندوستانی لیڈر شپ کی طرف سے جس مذہب پرستی کا مظاہرہ کیا گیا وہ بھی "سیکولر انڈیا" کا چہرہ دکھانے کے لیے کافی ہے۔

جب ماؤنٹ بیٹن نے 4 جون کو پریس کانفرنس کے دوران انتقالِ اقتدار کے لیے 15 اگست کی تاریخ کا اعلان کیا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ہندو جوتشیوں کو اس تاریخ پر اعتراض ہو گا۔ 15 اگست کو جمعہ

دن تھا اور ہندو جوتشیوں کے نزدیک یہ بہت منحوس شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس تاریخ کا اعلان ہوتے ہی پورے ہندوستان کے جوتشیوں نے زائچے تیار کرنے شروع کر دیے۔ بنارس اور جنوبی ہند کے جوتشیوں نے فوری طور پر اعلان کر دیا کہ:

"15 اگست اتنا منحوس دن ہے کہ ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا ہونے سے بہتر ہو گا کہ ہندوستان مزید ایک دن برطانوی راج کی عملداری میں گزارے"۔ کلکتہ کے سوامی مدمانند نے ماؤنٹ بیٹن کو خط لکھا کہ " بھگوان کے لیے ہندوستان کو 15 اگست کو آزادی مت دیں۔ اگر آئندہ سیلاب آئے، خشک سالی ہوئی، قحط پڑا اور خونریزی ہوئی تو یہ محض اس لیے ہو گا کہ ہندوستان ایک ایسی تاریخ کو آزاد ہوا کہ جو ستاروں کے نزدیک ایک منحوس دن تھا"

ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستانی رہنماؤں کے لیے مسئلہ بن گیا کہ اب کیا کریں۔ بالآخر جوتشیوں کی ایک جماعت نے ہندوستانی رہنماؤں کو سمجھایا کہ "15 اگست تو نئی قومی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے بڑا ہی منحوس دن ہے لیکن 14 اگست کو ستاروں کا ملاپ خاصا موافق ہے۔" چنانچہ ہندوستانی رہنماؤں نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ درمیانی راہ تجویز کی کہ انتقال اقتدار 14 اور 15 کی درمیانی رات کو بارہ بج کر ایک منٹ پر کر دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ تجویز منظور کر لی۔(139)

اس تصفیے کے بارے میں خود ماؤنٹ بیٹن نے برطانوی حکومت کے نام 8 اگست کو ارسال کردہ ہفتہ وار رپورٹ میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"مجھے اس بارے میں پہلے سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا کہ مجھے انتقال اقتدار کی تاریخ کا تعین کرتے وقت جوتشیوں سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے اب یہ معاملہ یوں طے ہو گیا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس نصف شب سے پہلے یعنی 14 اگست کو شبھ (نیک) گھڑی کے اندر اندر ہو جائے گا جبکہ انتقال اقتدار کی رسم عین نصف شب کو ہو گی اور وہ بھی تقریباً شبھ گھڑی ہی ہو گی۔ کابینہ کے بعض توہم پرست ارکان چاہتے تھے کہ تمام کی تمام رسومات نصف شب کو دربار ہال میں انجام پا جائیں لیکن خوش قسمتی سے کابینہ کے بعض عمر رسیدہ ارکان رات 9 بجے سو جاتے ہیں۔ چنانچہ نئی کابینہ کی رسم حلف برداری کے معاملے میں نیند نے اوہام پرستی پر غلبہ حاصل کر لیا اور اب نئی کابینہ کی حلف برداری کی تقریب 15 اگست کی صبح ساڑھے آٹھ بجے منعقد ہو گی"۔(140)

تشیوں کے اس قدر عمل دخل دیکھ کر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے پریس اتاشی ایلن کیمبل جانسن کو باقاعدہ

"جوتشی برائے گورنر جنرل" کے اضافی اور اعزازی عہدے پر فائز کر دیا۔

" 14 اگست کی رات کی تقریب سے پہلے دو معتبر سنیاسیوں نے اپنے مذہبی طریقے کے مطابق نہرو کو راج سنبھالنے کے لیے تیار کیا۔ انھوں نے اس کے اوپر دریائے تنجور کا مقدس پانی چھڑکا، اس کی پیشانی پر مقدس راکھ ملی، ایک پانچ پاؤں کا بت اس کے بازو پر رکھا اور پھر بھگوان کی مقدس چادر پتامبرم کو اس کے گرد لپیٹا گیا۔ قدیم ہندوستان میں جب کوئی راجہ یا مہاراجہ سنگھاسن پر بیٹھتا تھا تو معتبر اور مقدس سنیاسی اس قسم کی رسوم ادا کرتے تھے۔ 14 اگست کی شام کو یہ رسوم نہرو کی رہائش گاہ پر انجام دی گئیں۔" (141)

آزادی کی رات " فریڈم ایٹ مڈ نائٹ " میں لیری کولنز نے، ڈاکٹر راجندر پرشاد کے گھر کا نقشہ کچھ اس طرح بیان کیا جہاں وہ لوگ اکٹھے تھے جنھوں نے ہندوستان کی پہلی وزارت میں شامل ہونا تھا:

" نئی دلی میں ڈاکٹر راجندر پرشاد کے مکان کے باغیچے میں بھی آگ جل رہی تھی مقدس ویدوں کی تعلیم کے مطابق روشن کی گئی تھی۔ پنڈتوں نے منتر پڑھ کر اسے مقدس بنا دیا تھا۔

جن مردوں اور عورتوں کو آزاد ہندوستان کی پہلی وزارت میں شامل ہونا تھا، منتر پڑھنے کی آواز کے بیچ وہ اس مقدس آگ کا طواف کر رہے تھے۔ اس کے بعد ان پر گنگا جل چھڑکا گیا، ماتھے پر تلک لگایا گیا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق یہ تلک تیسری آنکھ کی علامت ہے جو ظاہری چیزوں کے پیچھے اصلیت کو دیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ان ذمہ داریوں کے لیے تیار ہو گئے جو بہت جلد ان کے کندھوں پر آنے والی تھیں۔ اس کے بعد وہ ایک کے بعد ایک پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے جو قومی جھنڈوں سے سجا ہوا تھا۔" (142)

ان رسومات کے بعد "سیکولر" ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔

انڈیا کے بعد اب آتے ہیں پاکستان کی طرف جہاں "رجعت پسند" جناح ایسے موقعے پر کیا رویہ اختیار کرتے ہیں؟

" نام نہاد سیکولر ہندوستان کی آزادی کی تقریبات کے موقع پر توہم پرستی اور ہندو مذہبی کٹر پن کا جو مظاہرہ ہوا وہ اس کے بالکل برعکس تھا جو کراچی میں پاکستان کو اقتدار کی منتقلی کے موقع پر دیکھنے میں آیا۔ یہاں نہ تو کوئی مذہبی رسم ادا کی گئی اور نہ کسی مذہبی طور طریقے کا مظاہرہ کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن 13 اگست کی سہ پہر دہلی سے کراچی پہنچا۔ اسی شام کو قائداعظم

نے اس کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے ایک جانب مس فاطمہ جناح اور دوسری جانب بیگم رعنالیاقت علی خان بیٹھی تھیں۔

ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ "یہ دونوں دہلی میں ہونے والی نصف شب کی رسومات کا ذکر کر کے میرا مذاق اڑاتی رہیں کہ ایک ذمہ دار حکومت کو اتنے اہم معاملے میں جوتشیوں کے کہنے پر نہیں چلنا چاہیے"(143)

دو قومی نظریہ اور "نفرت پر مبنی ریاست"

ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا موجود ہے جن کے خیال میں جب سے بنی نوع انسان کی تخلیق ہوئی، تب سے لیکر بیسویں صدی تک دنیا امن چین سے رہ رہی تھی یہاں تک کہ جناح صاحب نے اپنا دو قومی نظریہ پیش کیا اور اس کی بنیاد پر پاکستان تخلیق کیا۔ یہ فتویٰ دینے والی وہ مخلوق ہے جو کسی بھی معاملے میں خود کو اور اپنے ذہنوں کو تحقیق کی مشقت میں ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔

اس میں کیا شک کہ ہندو اور مسلم دو مختلف قومیں ان کا مذہب کلچر قانون سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کیا جب جناح صاحب کی کوششوں سے معاہدہ لکھنؤ ہوا تو وہ دو مختلف قوموں کے درمیان نہیں تھا؟ دونوں فرقوں کے درمیان کچھ "مختلف" تھا تبھی ان کو اکٹھا کرنے کے لیے ایک معاہدہ کرنا پڑا۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں کسی ہندو کسی عیسائی کسی یہودی کسی لامذہب سے مختلف ہوں تو کیا اس کا لازمی مطلب یہی نکلتا ہے کہ میں دوسرے کسی عقیدے سے نفرت کرتا ہوں؟

جناح صاحب نے مارچ 1940ء کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انھی دنوں چھپی اندر پرکاش کی کتاب نکالی جس میں لالہ لاجپت رائے کا ایک خط شامل تھا جو اس نے 16 جون 1925ء کو کانگرس کے صدر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا۔ قائداعظم نے یہ پورا خط پڑھ کر سنایا جس میں لاجپت رائے نے جو لکھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ

> ”میں مسلمانوں کی تاریخ اور فقہ پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ کو ہمارے لیے کوئی راہ نجات نکالنی چاہیے۔“

جناح صاحب پر تو یہ الزام بھی نہیں لگ سکتا کہ انھوں نے مل کر رہنے کی کوشش نہیں کی۔ تیس سال تک تو وہ کوشش کرتے رہے کہ ہماری کمیونٹی جو سیاسی سماجی معاشی ہر حوالے سے پسماندہ ہے اسے کچھ رعایتیں ملنی چاہئیں ان کوششوں کے باوجود جب وہ ہندو لیڈرشپ کو قائل نہ کر سکے کہ مسلمانوں کے جائز خدشات دور کیے جائیں تب پاکستان کو بطور حل پیش کیا۔ جناح صاحب کا دو قومی نظریہ کوئی ایسا انتہا پسندانہ نظریہ بھی نہیں جو ہندوؤں سے نفرت پر مبنی تھا جس میں ہندو کہیں فٹ نہ ہوتے ہوں، جیسا کہ ہمارے رائٹ ونگ والے پیش

کرتے ہیں نہ ہی ویسا جیسا کہ سو کالڈ لبرلز جناح صاحب پر تنقید کرنے کے لیے جناح صاحب سے منسوب کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ تاریخ کے صفحات کھنگالیں تو جناح صاحب آخری دم تک موجودہ پاکستان کو کٹا پھٹا پاکستان قرار دیتے رہے ہیں جناح صاحب پورا بنگال اور پورا پنجاب چاہتے تھے۔ کلکتہ کو تو بنگال کا دل کہتے تھے کہ اس کے بغیر بنگال لے کر میں کیا کرونگا؟ ذرا سوچیں کیا پورے بنگال اور پورے پنجاب میں ہندو جناح کے پاکستان کا حصہ نہ ہوتے؟ کیا جناح صاحب نے واضح الفاظ میں نہیں کہا تھا کہ ہم ہندوستان پر مسلمان اقلیتوں کے معاملے میں اعتبار کرنے پر تیار ہیں وہ بھی ہم پر اعتبار کریں۔

11 مئی 1947ء کو پنجاب بنگال کی تقسیم کی مخالفت کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا کہ:

> "یہ بالکل واضح ہے کہ کانگرس کہتی ہے کہ کسی گروپ یا علاقے کو ہندوستان میں شامل رہنے پر مجبور نہیں کرے گی یا اس سلسلے میں طاقت استعمال نہیں کرے گی لیکن ان کا (عمل) اس سے برعکس ہے۔ وہ اس پر عمل کیوں نہیں کرتی؟ بلکہ اس نے اب ایک نیا سٹنٹ شروع کر دیا ہے: اگر آپ تقسیم کا مطالبہ کرتے ہیں تو انھیں یہ منظور ہے لیکن ہمیں کہا جاتا ہے کہ یہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر منتج ہوگا۔ یہ ایک اور چال ہے اور یہ وہ دھمکی دیتی ہے کہ اگر پاکستان میں غیر مسلموں پر جبر کیا گیا تو خانہ جنگی ہوگی۔ مسٹر پٹیل اس پہلو کو نہیں دیکھتے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ ایک بنیادی اصول کی بنا پر کیا جاتا ہے کہ ہمارا ایک مادر وطن ہونا چاہیے جہاں ہم اپنی قومی ریاست قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کی بنیاد کلی طور پر مختلف اصول پر ہے جسے میں نے اپنے حالیہ بیان میں واضح کیا ہے۔ جبکہ کانگرس کا نیا سٹنٹ ۔۔۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم ۔۔۔ اس بنیاد سے شروع ہوتا ہے کہ غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ ان صوبوں کی حکومتیں منصفانہ سلوک نہیں کریں گی کیونکہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی۔
>
> اس استدلال کا زیادہ زوردار طور پر اطلاق ان صوبوں میں مسلمانوں اور چھوٹی ذات کے ہندوؤں پر ہوتا ہے، جہاں ہندو اکثریت میں ہیں خاص طور پر ان صوبوں میں بہت زیادہ اقلیت میں ہیں جبکہ پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ اس سے کئی صوبوں میں علیحدگی کے لیے راہ ہموار ہوگی ۔۔۔ اور اس کی اخلاقی طور پر حمایت نہیں کی جا سکتی ۔۔۔ اور یہ بالکل تباہ کن ہوگا ۔۔۔ کیونکہ اس سے صوبوں کی اقتصادیات بری طرح

تباہ ہو گی، ہندوؤں اور سکھوں کا (مسلمانوں سے) جدا ہونا سیاسی اعتبار سے نہ صرف حال کے لیے خطرناک ہو گا بلکہ اس کے اثرات مستقبل پر بھی نقصان دہ ہونگے۔"

"مکاتیب قائداعظم محمد علی جناح 1937ء تا 1946ء" (مرتب از ڈاکٹر ندیم شفیق ملک) میں چمن لال کے نام اپنے خط مورخہ 15 نومبر 1941ء میں جناح صاحب لکھتے ہیں کہ:

"مجھے آپ کا 13 نومبر کا خط موصول ہو گیا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ مجھے ہندوستان کی تقسیم پر زور دیتے ہوئے دیکھ کر آپ کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے مسئلہ کا مطالعہ نہیں کیا اور میں زیادہ تر ہندوؤں کو اسی طرز فکر کا مالک پاتا ہوں۔۔۔یہی وہ بہترین حل ہے جو میں تجویز کر سکتا ہوں۔ اس پر بے شمار مواد موجود ہے اور اگر آپ اس کا غیر جانبداری اور دیانتداری سے جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ ہندوؤں کے لیے بھی اتنا ہی فائدہ مند ہے جتنا کہ مسلمانوں کے لیے۔ میرے نزدیک یہ ہندوستان کی آزادی کا تیز ترین راستہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے معلومات کس قدر محدود ہیں جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "پاکستان کا مطلب ایک مقدس سرزمین ہے"۔اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ بہتر ہے آپ خالدہ ادیب خانم کی کتاب میں شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ کریں اور آپ لفظ "پاکستان" کے ماخذ کو سمجھ جائیں گے۔

بہر حال، نہ تو میرے اس معاملے پر مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی میں آپ کی مجوزہ کتاب میں شمولیت کے لیے آپ کو مضمون دینے سے اتفاق کر سکتا ہوں۔" (144)

اسی ترک مصنفہ خالدہ ادیب خانم کی کتاب اِن سائڈ انڈیا کا ایک اقتباس منصور احمد نے اپنی کتاب میں کچھ اس طرح شامل کیا جس کو پڑھنے کا مشورہ جناح صاحب چمن لال کو دے رہے ہیں۔

"ترک خاتون مصنفہ خالدہ ادیب خانم (جن کے سیکولرازم اور گاندھی، نہرو کی مداح ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکا) اپنی مشہور کتاب اِن سائڈ انڈیا میں لکھتی ہیں۔

"ابھی تک ہندوؤں کی غالب ذہنیت کا سچا منظر یہ فرقہ پرستی ہے، ہندو فرقہ پرست جہاں اکثریت سے گھرے ہوئے ہیں وہاں اعلانیہ غیر ملکی حکومت کے قائم رہنے کی وکالت کرتے ہیں لیکن جہاں وہ اکثریت کا جزو ہیں (جیسا کہ اکثر مقامات پر ہے) وہاں وہ وطن پرست ہیں مگر ان کے ذہن میں ہندوستان ایک ہندو ملک ہے جس میں مسلمانوں کو کوئی جگہ نہیں ملنی چاہیے، صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ جب تک مسلمان یا عیسائی موجود ہیں اس وقت تک ہمیں قرار نہیں آسکتا، ان کی قوم پرستی ایک مذہب آمیز نسلی فاشیت ہے،

مسلمان جب آئندہ ہندوستان میں ہندو فرقہ پرستوں کی حکمرانی کے امکان کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا لُب لُباب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اگر ان کی حکومت ہوئی تو زمانہ مستقبل کے اچھوت ہم ہوں گے۔"

امام الہند یہاں ایک بار پھر اس معاملے میں لفظ "پاکستان" کو پکڑ کر اپنی کتاب میں نثر نگاری کے جوہر دکھاتے نظر آئے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں کہ "مجھے اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری طبیعت کے خلاف ہے۔ اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے ناپاک ہیں، جب کہ کچھ پاک ہیں۔ پاک اور ناپاک میں علاقوں کی تقسیم غیر اسلامی ہے اور راسخ العقیدہ برہمنیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے جو انسانوں اور ملکوں کو مقدس اور نحس میں بانٹتی ہے ایک ایسا بٹوارہ جو اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا، اور رسول اللہؐ نے فرمایا تھا، اللہ نے پوری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے"

اب ذرا جناح صاحب کے خط کا جواب دوبارہ پڑھیں جس میں چمن لال کو کہہ رہے ہیں "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی معلومات کس قدر محدود ہیں جب آپ یہ کہتے ہیں کہ "پاکستان کا مطلب ایک مقدس سرزمین ہے"۔

یہ لفظ زبردستی جناح صاحب کے منہ میں ڈالے گئے تاکہ جناح صاحب کے مقدمہ کو کمزور بنا کر پیش کیا جائے حالانکہ جناح صاحب نے کہیں نہیں کہا کہ میں پاک لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر پاکستان لیکر جا رہا ہوں۔ جیسا کہ یہ واضح ہے کہ جناح صاحب آخری دم تک ہندوؤں کو اپنے پاکستان کا حصہ دیکھنا چاہتے تھے اور جناح صاحب یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت کو ہندوستان کا حصہ بن کر رہنا ہو گا۔

یہ پروپیگنڈہ کانگرس اور ہندو لیڈر شپ کی سوچی سمجھی رائے تھی کہ جناح اگر مسلمانوں کے خدشات بیان کرتے ہیں اور کچھ یقین دہانیاں مانگتے ہیں تو بجائے ان کو ایڈریس کرنے کے ان کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کرو کہ وہ ایک متعصب ترین انسان نظر آئیں اور دنیا کو یہ ثابت کر کے دکھایا جائے کہ وہ نفرت پر مبنی ایک ریاست چاہتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ صرف اصل مسائل (جو تھے مسلمانوں کے خدشات) سے راہ فرار کا ایک طریقہ تھا۔ ذرا ایک بار پھر کانجی کے سامنے جناح صاحب کے کہے گئے الفاظ دوبارہ یاد کریں:

"مائی ڈیئر کانجی! یہ تو بتاؤ آخر جناح کا قصور کیا ہے، جس کی سزا میں اس کے خلاف اتنا زہر اگلا جا رہا ہے اور غلط بیانیوں سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں؟ ہندو پریس کیوں میرا دشمن ہو گیا ہے؟"

ایس کے بندوپادھیائے جو ایک کٹر گاندھی وادی اور گاندھی میموریل فنڈ نئی دہلی کے سیکریٹری رہے، نے ایک

کتاب تحریر کی۔ اس نے جب اپنے کتاب کے بارے تحقیق کرنا شروع کی اس تو ان کے سامنے جناح صاحب کی ایک اور شخصیت آئی۔ اس کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے منصور احمد لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے اپنی کتاب کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ عام خیال کے مطابق ہی انھوں نے بھی محمد علی جناح کو ایک علیحدگی پسند، فرقہ پرست اور ایک ایسے آدمی کی حیثیت سے جس کے سر پر تقسیم ہند کا جرم ہو، مسترد کر دیا تھا۔"

اس کے بعد وہ جناح صاحب کی 11 اگست والی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ جناح کی شخصیت کے مروجہ تعین میں کہیں غلطی ضرور ہے۔

کیا 11 اگست کی تقریر میں جناح صاحب نے کوئی نئی بات کی؟ کیا اس سے پہلے ایسی بات انھوں نے کبھی نہیں کی؟ ایسا ہر گز نہیں جناح صاحب 11 اگست کی تقریر سے پہلے بھی یہی کچھ مختلف انداز میں کہتے آرہے تھے لیکن ان کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اس سطح کے لوگوں کے سامنے بھی جناح صاحب کی اصل شخصیت اچھی خاصی تحقیق کے بعد سامنے آتی ہے۔

مثلاً 14 نومبر 1946ء کو وہ کہتے ہیں کہ:

"موجودہ فرقہ وارانہ مسئلے کا واحد حل اسی میں ہے کہ پاکستان اور ہندوستان وجود میں آجائیں۔۔۔ میری مراد بالکل آزاد پاکستان سے ہے۔ اس کے بجائے کوئی اور شے مصنوعی اور غیر فطری ہو گی۔ انھوں نے کہا کہ "جب میں پاکستان کا مطالبہ کرتا ہوں تو صرف مسلمانوں کی لڑائی نہیں لڑتا۔ بلکہ دراصل پاکستان و ہندوستان کے قیام کے ذریعے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو صحیح آزادی حاصل ہو گی۔" انھوں نے پاکستان کے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ " اس میں مقبول اور نمائندہ حکومت قائم ہو گی اور ہر بچہ بلالحاظ ذات، رنگ و عقیدہ مساوی حقوق کا حامل ہو گا۔"

ایس کے بندوپادھیائے اس تحقیق کے بعد جناح صاحب سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی کتاب کا نام ہی جناح اینڈ دی کری ایشن آف پاکستان نہیں بلکہ "قائداعظم اینڈ دی کری ایشن آف پاکستان" رکھا۔

بندوپادھیائے فاطمہ جناح کی کتاب سے اقتباسات اپنی کتاب میں شامل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کی فتح و کامرانی کے اوقات میں بھی (اشارہ ہے ان دنوں کا جب پاکستان بن گیا تھا) میں نے افسوس کے ساتھ دیکھا۔۔۔ ان کو کھانے کی بہت کم (بلکہ ایک دم نہیں) خواہش ہوتی تھی اور وہ اپنی مرضی سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ ساری باتیں ان دنوں کی ہے جب سرحد کے دونوں حصوں سے قتل، آتشزنی، لوٹ مار، زنا بالجبر کی دلسوز خبریں آرہی

تھیں۔ صبح ناشتہ پر وہ مجھ سے کثیر المقدار خون خرابے کا ذکر کرتے اور ان کا رومال چپکے سے
اکثر ان کی بھیگی آنکھوں پر چلا جاتا۔"

منصور احمد اسی صفحے میں، ہیکٹر بولتھو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہ کہنا صحیح نہیں ہو گا کہ جناح کا یہ کرب صرف مسلمانوں ہی کی تباہی پر تھا، ہیکٹر بولیتھو نے جناح کے ایک پارسی دوست کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"جمشید جی نوشیر واں جی نے جو تقسیم کے وقت کراچی کے میئر تھے، ان سے کہا "میری گزارش ہے کہ آپ اس بات کا یقین کریں کہ مسٹر جناح ایک ایسے انسان تھے جس کا دل خالص انسانی جذبات سے لبریز تھا۔ سبھی سمجھتے ہیں کہ وہ آنسوؤں کے معاملے میں فیاض نہیں تھے، لیکن ایسا (حقیقتاً) نہیں ہے میں نے دوبار انھیں روتے دیکھا ہے، ایک دفعہ تقسیم کے بعد جنوری 1948ء میں جب میں ان کے ساتھ ایک ایسے کیمپ میں گیا تھا جہاں پاکستان میں رہ جانے والے ہندوؤں کو ٹھہرایا گیا تھا، جب ہم لوگوں نے ان کی حالت زار کو دیکھی تو جناح رو پڑے میں نے دیکھا کہ ان کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ دوسرا موقع اس وقت کا ہے جب نہرو رپورٹ پر اپنی ترمیم کو مسترد کیے جانے پر جناح کلکتہ سے لوٹ رہے تھے"

جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عائشہ جلال نے انڈیا ٹوڈے میں "Master of Mutilation" کے عنوان سے ایک تحریر لکھی۔ اس میں وہ جناح صاحب کی اپریل 1942ء کو الہ آباد میں صحافیوں سے گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ جناح صاحب نے کہا کہ:

"تم خواہ ہندو ہو، مسلم، پارسی یا مسیحی، میں تم سے جو کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ گرچہ میرے اوپر بہت تنقید ہوئی ہے اور مجھ پر حملہ کیا گیا ہے۔ اور آج میرے اوپر کچھ حلقوں کی جانب سے نفرت بھرے الزامات لگ رہے ہیں، میں بہت دیانتداری سے یقین رکھتا ہوں کہ ایک دن آئے گا جب نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوؤں کی ایک بڑی جمعیت بھی گر میری زندگی میں نہیں تو میرے مرنے کے بعد میرے نام کی یاد پر رحمت بھیجے گی"

عائشہ جلال آگے لکھتی ہیں کہ یہ دن گرچہ ابھی طلوع نہیں ہوا لیکن ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں نے جناح کو نئے سرے سے پرکھنا شروع کیا ہے تو لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں ہے۔

مورخین کو جسونت سنگھ کی حالیہ نئی کتاب میں کوئی بھی بات ڈرامائی طور پر نئی نہیں لگی. اگر کچھ نیا ہے تو یہ کہ بی جے پی کے چوٹی کے لیڈر نے جنوبی ایشیا کی تاریخ میں جناح کے کردار کی وہ تشریح و تعبیر تسلیم کرلی جو عمومی

طور پر اہل قلم قبول کرتے ہیں. تقریباً ربع صدی پیشتر میں نے اپنی کتاب 'سول سپوکس مین' میں جو کہ اس وقت نئے دستیاب ہونے والے آرکائیو کے مواد پر مبنی تھی یہ دکھایا تھا کہ جناح کے مقاصد اور اگست 1947ء میں تقسیم کے حتمی نتیجے کے درمیان ہم آہنگی نہ تھی۔

جناح ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اقتدار میں منصفانہ حصہ چاہتے تھے۔ لیکن پنجاب اور بنگال کی آلام سے بھرپور ٹوٹ پھوٹ پر مبنی تقسیم نہیں چاہتے تھے۔ ہندوؤں سے نفرت تو دور کی بات ہے وہ تو کانگرس کے اکثریت پسندانہ کے مخالف تھے جس میں اختلافات کے لیے بہت کم احترام پایا جاتا تھا، دیگر نظریاتی اختلافات کے باوجود، نہرو اور پٹیل، انگریز راج کے ہاتھوں تخلیق کردہ مرکزیت پسند ریاست کے معاملات میں اقتدار کے خواہاں تھے۔ جناح ان کے برعکس یہ یقین رکھتے تھے کہ انگریز کے رخصت ہونے کے بعد نوآبادیاتی آقاؤں کا وضع کردہ مرکز تحلیل ہو جائے گا اور ہندوستان کی ایک نئی یونین پیدا ہو گی جو اس کے تشکیلی اجزاء کے درمیان مذاکرات کا نتیجہ ہو گی۔ 1947ء کے تناظر میں یہ تشکیلی اجزا ہندو اکثریتی صوبوں کے نمائندہ ہندوستان اور مسلم اکثریتی صوبوں کے نمائندہ پاکستان پر مشتمل ہو سکتے تھے۔ جن میں ہر کوئی اپنے اندر اقلیتوں کی معتدبہ تعداد بھی رکھتا جس کے حقوق کو مکمل تحفظ حاصل ہوتا۔"

اپنے اسی مضمون میں عائشہ جلال مزید لکھتی ہیں کہ:

> "جناح نے اگست 1944ء کو پنجاب کے مسلم اور ہندو طلباء کو بتایا کہ "ہم ہندوؤں کے دشمن نہیں ہیں گرچہ ہم چند نکات پر متفق نہیں ہیں لیکن ہمیں مشترکہ دشمنوں کے خلاف متحد ہونا چاہیے، جیسا کہ لیگ اور کانگرس مرکزی اسمبلی میں نوآبادیاتی حکومت کے خلاف ووٹ دینے کے لیے اکٹھی ہو گئی تھیں" انھیں اس امر کا یقین تھا کہ جب پاکستان بنے گا تو ہندو اور مسلمان دونوں کو خوشی ہو گی کیونکہ یہ دونوں ہی کے بہترین مفاد میں تھا۔"

مضمون کے آخر میں عائشہ جلال لکھتی ہیں کہ:

> "جناح نے خود تاریخ میں اپنے مقام کا اندازہ کرتے ہوئے اس دن کی امید کی تھی کہ جب ہندو ان کی یاد کا احترام کریں گے تب جناح نے اپنی مثال ایک ایسے شخص کی تمثیل سے بیان کی کہ جو گلی میں پہلی بار ایک چھتری لیکر نکلتا ہے اور جس پر صرف سب لوگ ہنستے ہیں یا مذاق بناتے ہیں کیونکہ کسی نے چھتری اس سے قبل دیکھی ہی نہیں تھی۔ تاریخ میں دوسری شخصیات کی طرح کہ جو نادیدہ راہوں پر چلیں، وہ بھی ایک چھتری لیکر چل رہے تھے.
> "آپ مجھ پر ہنس سکتے ہیں "بڑے ذاتی اعتماد کے ساتھ انھوں نے کہا "لیکن وہ وقت بہت

جلد آئے گا جب آپ نہ صرف یہ سمجھ جائیں گے کہ چھتری کیا ہوتی ہے بلکہ اس کو تم سب اپنے اپنے فائدے کے لیے استعمال بھی کرو گے".(145)

جو انتہا پسند دو قومی نظریہ ہمارے رائٹ ونگ اور سو کالڈ لیفٹ جناح صاحب سے منسوب کرتے ہیں اس کی بنیاد تو مہاسبھائیوں نے رکھی۔

ڈاکٹر اجیت جاوید نے جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

"جسونت سنگھ نے یہ کتاب لکھ کر ان لوگوں کو کلین چٹ دے دی ہے جو ہندو مہاسبھائی تھے اور وہ ہندو راشٹریا "ہندو راج" کی بات کر رہے تھے۔ اس وقت وہ ہندو نیشن یا ہندو ریاست بنانا چاہتے تھے۔ 1937ء میں مہادیر ساور کر، جو ان کے لیڈر تھے، نے کہا تھا کہ ہم ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح دو قومی نظریئے کی بنیاد تو انھوں نے ڈالی تھی۔ وہ آج یہ بھول جاتے ہیں کہ انھی کی لیڈر شپ مہا سبھائی ہے۔ یہ سب جناح سے نفرت کرتے تھے اور ان کو کمیونل مانتے تھے اور جناح کو انھوں نے مروانے کی بھی کوشش کی۔ میری کتاب میں لکھا ہے کہ کس طرح کچھ انقلابیوں کو ریوالور دے کہا کہ جاؤ اور ان کو مار دو، انقلابیوں نے کہا کہ ہم ہتھیار تو انگریز کے خلاف اٹھاتے ہیں۔ ہم اپنوں کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے۔ آج ان کا جناح سے پیار سیکولرازم سے کمٹمنٹ کی وجہ سے نہیں، جناح تو پروگریسو تھے۔"

اپنے اسی انٹرویو میں آگے کہتی ہیں کہ:

"1937ء تک یہ جو ہندو مہاسبھا کے لیڈر ہیں یہ کانگرس کے بھی صدر تھے یہ بطور آر۔ ایس۔ ایس اور ہندو مہاسبھا کے اندر بھی تھے اور ایک پارٹی کے لیڈر بھی تھے۔ مدن موہن مالویہ، کے۔ ایم۔ منشی، منجر شاما پرشاد مکرجی، یہ سب ہندو مہاسبھا اور کانگرس دونوں کے لیڈر تھے۔"(146)

بیورلے نکولس نے اپنی کتاب میں ساور کر کی ایک تقریر شامل کی جو اس نے 1939ء میں کی۔ اس تقریر کے بعد اس نے ہندو مسلم تضاد بارے تبصرہ کچھ اس طرح کیا:

"ہم ہندو، بذات خود ہندوستان میں آباد ایک مستقل قوم ہیں۔ ہمارا آبائی وطن ایک ہے، ہم میں علاقائی اتحاد ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو۔ ہمارے تمام مقدس مقامات ہمارے آبائی وطن میں ہی ہیں۔ اس طرح وطن کے ساتھ ہماری محبت دوگنی ہو گئی ہے۔ ہمارے درمیان بہت سے مشترک رشتے ہیں، ثقافتی،

مذہبی، تاریخی، لسانیاتی اور نسلی، صدیوں کے ساتھ نے ہمیں ایک قوم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ہندو قوم کسی سمجھوتے کے تحت وجود میں نہیں آئی، بلکہ اسی علاقے کی پیداوار ہے۔"

(ہندو مہاسبھا کے کلکتہ سیکشن میں تقریر جو دسمبر 1939ء میں منعقد ہوا تھا۔)

اس تصویر میں جو کچھ یک طرفہ دکھائی دیتی ہے، مسلمان کہاں فٹ ہوتے ہیں؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ وہ فٹ نہیں ہوتے۔

چلیں یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ ایک ذمہ دار ہندو رہنما سے یہ اعتراف کرانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ساورکر ایک علیحدہ قوم ہونے کے سلسلے میں مسلمانوں کا دعویٰ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن انھیں اس کے عملی اظہار کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اور ان کی جماعت پاکستان کے شدید مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ مسلمان بھی ہماری طرح ایک قوم ہیں، لیکن ہم انھیں رہنے کے لیے کوئی علیحدہ جگہ دینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ آگے لکھتے ہیں۔

ہم آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> "مسلمان نہایت جوش و خروش کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک علیحدہ اور خود مختار قوم ہیں اور ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے ہندو۔۔۔۔۔۔ یا ان کی بھاری اکثریت۔۔۔ بھی اسی قدر جوش و خروش سے، علیحدہ اور خود مختار قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ وہ بھی درست ہے لیکن جب مسلمان اپنی خواہشات کو منطقی شکل دینا چاہتے ہیں اور اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندو اس کے خلاف احتجاج کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، گانگرسی پریس کا توپ خانہ پوری طاقت سے پھٹ پڑتا ہے، ساری دنیا میں ہندو نوجوان، جنھیں پیسے دے کر باہر بھیجا جاتا ہے، اس کے خلاف بیان دینے لگتے ہیں اور گاندھی برت رکھ کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔"

اور اس دو قومی نظریئے کی دوسری انتہائی شکل اس وقت سامنے آئی جب جناح صاحب کی خواہش کے برعکس کانگرس بنگال اور پنجاب تقسیم کرانے پر بضد ہو گئی۔ کانگرس کے اس ریزولیوشن پر تبصرہ کرتے ہوئے کانجی دوارکاداس لکھتے ہیں کہ اس ریزولیوشن سے سیاستدانی میں کانگرس کے دیوالیہ پن کی غمازی ہوتی ہے اور مزید لکھتے ہیں کہ اس سے اس تنظیم کی خراب تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس نے ابھی تین سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ قبل انھی خطوط پر تقسیم کی مخالفت کی تھی۔

جناح پیپرز میں جناح صاحب کا ٹائم میگزین کے ایڈیٹر کے نام ایک خط موجود ہے جسے پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا

جاسکتا ہے کہ جناح صاحب کس قدر ہندو کمیونٹی کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔

محمد علی جناح بنام ایڈیٹر "دی ٹائم "نیویارک تاریخ جولائی 1947ء:

محترمی

آپ کا 24 جون کا خط مجھے ملا۔ ٹائم میگزین کے لیے آپ کے ارسال کردہ سرورق میں اس خط کے ساتھ واپس بھیج رہا ہوں۔

میرے خیال میں یہ سرخی "محمد علی جناح -ان کا مسلم شیر ہندو گائے کو کھانا چاہتا ہے" ہندو قوم کے جذبات کو مجروح کرے گی۔ لہٰذا آپ کی خواہش کے باوجود میں ٹائم میگزین کے سرورق پر اپنے دستخط نہیں کر سکتا۔ میرے دستخط حاصل کرنے کی آپ کی شدید خواہش کی بنا پر میں ایک علیحدہ کاغذ پر اپنے دستخط کر کے بھیج رہا ہوں۔ علاوہ ازیں آپ کے ازراہ کرم بھیجے ہوئے ڈاک کے ٹکٹ بھی واپس کر رہا ہوں۔ انھیں ہندوستان میں استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کا مخلص

محمد علی جناح(147)

ہندو لیڈر شپ کی نفرت اور تنگ نظری

یہ تو جناح صاحب کا رویہ تھا اس کے برعکس جناح صاحب کے اس "حل" پاکستان کے بارے میں ہندو لیڈر شپ کی سوچ کیا تھی آیئے دیکھتے ہیں جب تقسیم نے تقریباً حقیقت کی شکل اختیار کی اس وقت ہندو لیڈر شپ نے اسے کیسے قبول کیا۔ اور دیکھتے ہیں نفرتوں کی بنیاد کس نے رکھی؟

'فریڈم ایٹ مڈ نائٹ' میں لیری کولنز، پٹیل کی پاکستان کے بارے میں رائے بیان کرتے لکھتے ہیں کہ:

"جناح کو پاکستان دے دو فرق کیا پڑے گا پانچ سات سال سے زیادہ یہ پاکستان چلنے والا نہیں۔ مسلم لیگ خود ہندوستان کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کہ حکومت کی باگ دوڑ آپ لوگ ہی سنبھالیے"

یہی بات آزاد نے اپنی کتاب میں ایسے لکھی:

"انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی ریاست پنپنے والی نہیں ہے اور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گی۔ انھوں نے سوچا کہ پاکستان قبولیت مسلم لیگ کو کڑوا سبق سکھائے گی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان ڈھیر ہو جائے گا اور وہ صوبے جو ہندوستان سے الگ ہو گئے تھے،

انھیں ناقابل بیان مشکلوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل کو شاید امید تھی کہ ان صوبوں کو واپس ہندوستان میں آنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔" (148)

ہندو لیڈر شپ کے عزائم کا پٹیل کے اس خط سے بھی پتہ چلتا جو اس نے مارچ 1947ء میں کانجی کو لکھا:

"3 مارچ 1947ء کو میں نے پٹیل کو ایک خط لکھا دوسرے ہی دن مجھے ولبھ بھائی کا یہ جواب ملا" مجھے تمھارا خط آج مورخہ 3 مارچ ملا۔ بالا صاحب کھیر نے تمھاری لندن کی بات چیت کے نوٹ دیے تھے۔ بلاشبہ لیبر حکومت نے ہمارے لیے اور دنیا کے سامنے اپنی نیک نیتی کا ثبوت دیا ہے لیکن ان کے بیان سے سر دست یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے پنجاب نکل گیا۔ لیکن مجھے پھر بھی تمھاری طرح قطعی مایوسی نہیں ہے۔ مسلم لیگ وہاں وزارت بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو سال سوا سال سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ اگلے جون سے قبل یقینی طور پر دستور تیار ہو جائے گی۔ اگر لیگ نے پاکستان پر اصرار کیا تو پھر ایک ہی صورت رہ جائے گا کہ پنجاب اور بنگال کا بھی بٹوارہ کیا جائے۔ وہ لوگ خانہ جنگی کے بغیر تو پورا پنجاب اور پورا بنگال ہرگز نہیں لے سکیں گے۔ میں نہیں سمجھتا برطانوی حکومت تقسیم ہند پر راضی ہو گی، وہ سب سے زیادہ طاقت ور پارٹی کو زمامِ حکومت سپرد کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور اگر اس نے یہ بھی نہ کیا تو تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرانے میں وہ کسی اقلیت کی مدد نہیں کرے گی۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ مشرقی بنگال، پنجاب کا ایک حصہ، سندھ اور بلوچستان کو چھوڑ کر باقی ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت اتنی طاقتور ہو گی کہ بقیہ حصے مجبور ہو کر اس میں شامل ہو جائیں گے" (149)

یہ صرف چند بیان نہیں ایک سوچی سمجھی رائے ہے ہندو لیڈر شپ نے پوری کوشش کی کہ اب اگر جناح بضد ہیں بھی تو ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ یہ مملکت چلنے کے قابل نہ رہے۔ اس حوالے سے ہندو لیڈر شپ کے بیانات ملاحظہ کریں:

مثلاً پیارے لال کے حوالے سے "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں زاہد چوہدری لکھتے ہیں:

"نومبر 1949 میں بھارت کی آئین ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے پٹیل نے بتایا کہ ہم نے تقسیم کو قبول کرنے کے لیے جہاں پنجاب و بنگال کی تقسیم اور دو ماہ کے اندر اندر اقتدار کی منتقلی کی شرائط عائد کی تھیں وہاں یہ شرط بھی رکھی تھی کہ "برطانوی حکومت ہندوستانی ریاستوں کے معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گی۔ ہم خود اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔ یہ ہم پر چھوڑ دیا جائے۔ آپ کسی کی طرفداری مت کریں۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ:

"ان ریاستوں پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد ہندو بورژوا کا خیال تھا کہ پاکستان جس کی حیثیت ریاست یا راجواڑے سے زیادہ نہ ہوگی، کو زیر نگیں لانا بھی کچھ مشکل نہیں ہوگا۔
ان عزائم کا اظہار نہرو کے 18 اپریل 1947ء کی آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کی تقریر سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا "کوئی بھی ہندوستانی ریاست جو آئین ساز اسمبلی میں شامل نہیں ہوگی، ہم اسے اپنا دشمن سمجھیں گے اور اسے ہمارے دشمن کی حیثیت سے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ہندوستان کو جتنا زیادہ سے زیادہ آزاد کرا سکتے ہیں کرالیں اور پھر بقیہ ہندوستان کی آزادی کے سوال سے نمٹیں۔"

فرانسس ٹکر کا حوالہ دیتے ہوئے چوہدری محمد علی ظہور پاکستان میں لکھتے ہیں کہ:

"ہندوؤں کی اکثریت کا اندازِ فکر انتقامی تھا۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا "اچھا! اگر مسلمان پاکستان چاہتے ہیں تو اسے لے لیں اور اس کی پاداش بھی بھگتیں۔ جہاں تک ممکن ہوا ہم ان کے علاقہ کا ایک ایک انچ کاٹ لیں گے تاکہ پاکستان نہ صرف احمقانہ حرکت معلوم ہو بلکہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہے اور جب بچا کھچا انھیں مل جائے گا تو پھر ہم اس قسم کا بندوبست کریں گے کہ پاکستان اقتصادی طور پر پنپ نہ سکے"۔ (150)

جناح صاحب کے انتقال پر نہرو نے جو ردِ عمل دیا وہ بھی پڑھنے لائق ہے۔ جسونت سنگھ اپنی کتاب میں افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نہرو اب بھی اپنے پرانے مربیانہ انداز کو نہیں چھوڑ پائے۔

"جناح نے ہندوستان کی تاریخ کو ایک نیا رخ ضرور دیا مگر ایک غلط انداز سے، یہ سچ ہے، اور ایسی طاقتوں کے بند کھول دیے بڑے پیمانے پر بدی کا مظاہرہ کیا۔ ہم انھیں کس طرح پرکھیں؟ ان تمام برسوں کے دوران میں اکثر ان سے بہت ناراض رہا ہوں۔ لیکن میرے دل میں ان کے لیے کوئی کڑواہٹ نہیں ہے، جو کچھ ہوا اس کے لیے ایک گہرا دکھ ضرور ہے۔ باہر باہر پر تو وہ اپنی تلاش میں کامیاب رہے اور اپنا مقصد پا گئے لیکن کس قیمت پر اور جو ان کے اپنے نصب العین سے کتنا مختلف؟ انھوں نے اس سب کے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ کیا انھیں کسی اپنے کسی سابقہ عمل پر دکھ یا افسوس ہوا ہوگا؟ شاید نہیں کیونکہ انھوں نے خود کو نفرت کی چادر میں لپیٹ رکھا تھا اور ہر وہ شخص کو برائیوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے جس سے انھیں نفرت تھی۔ نفرت کسی بھی شخص کے لیے ایک بہت ناقص غذا ہے۔" (151)

تقسیم ہو گئی جناح صاحب دہلی سے کراچی کے لیے روانہ ہوتے ہیں موسلے لکھتے ہیں کہ:

"He left Dehli after delivering a conciliatory message in which he appealed to both Hindus and Muslims to 'bury the past' and wished India success and prosperity. He got a bucket of water in his face in return from Sardar Patel who said in Dehli the following day: 'The poison has been removed from the body of India. We are now one and indivisible."

محمد علی جناح نے روانگی کے وقت ایک مفاہمانہ بیان دیا انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے اپیل کی کہ وہ ماضی کو دفن کر دیں۔ انھوں نے ہندوستان کے لیے کامیابی اور خوشحالی کی دعا کی۔ اگلے ہی دن پٹیل نے دلی میں اعلان کیا کہ "ہندوستان کے جسم سے زہر نکل گیا ہے۔ اب ہم ایک ہیں اور ناقابل تقسیم ہیں۔ "(152)

اس تمام بحث میں آپ دیکھ سکتے ہیں ہندو لیڈر شپ نے کب اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا؟ جناح صاحب متحدہ ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے ایک آبرومندانہ تصفیے کے لیے کوشاں رہے جسے ہندو لیڈر شپ نے ناکام بنا دیا جب پاکستان بنا تب بھی انھوں نے اپنے عزائم پاکستان کے بارے میں خفیہ نہیں رکھے۔ جناح صاحب ماضی دفن کرنے کی بات کرتے ہیں جناح صاحب ہندوستان کی خوش حالی کی دعا کرتے ہیں جواب ملتا ہے کہ ہم نے ہندوستان کے جسم سے زہر نکال دیا۔

پاکستان، جو ماؤنٹ بیٹن کے مطابق، کی صورت ہم ایک خیمہ گاڑ رہے تھے، جس کے اپنے وجود کو خطرے میں ڈالا گیا، اس کے کونسے توسیع پسندانہ عزائم تھے جو ہندوستان کے وجود کے لیے خطرہ ثابت ہوتے یا جناح صاحب نے کب ایسا کچھ اظہار کیا؟ الٹا پاکستان کی حالت یہ تھی کہ بٹوارا کونسل میں جب لیاقت علی نے 6(چھ) پرنٹنگ پریس میں سے ایک دہلی سے کراچی منتقل کرنے کی بات کی تو پٹیل بگڑ کر کہنے لگا:

"پاکستان کو الگ ہونے کے لیے کہا کس نے ہے؟ انھیں لیجانا ہے تو اپنی جائیدادیں وہاں لے جائیں مگر ہم انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ اگر ان کے پاس معقول ذرائع موجود نہیں ہیں تو وہ بقیہ انڈیا کی حکومت کا کام خراب کریں"

ماؤنٹ بیٹن دونوں آئین ساز اسمبلیوں کے ارکان کی اکٹھے دعوت کرنا چاہتا تھا (اور جناح صاحب اس پر تیار تھے) تاکہ مستقبل میں دونوں ڈومینیئنوں کے تعلقات خوشگوار رہیں جب اس نے گاندھی، نہرو، پٹیل اور راجندر پرشاد کو اس پروگرام سے آگاہ کیا تو چاروں حضرات سخت غصے میں آگئے اور کہنے لگے:

"ہم کسی حالت میں یہ گوارا نہیں کریں گے کہ پاکستان آئین ساز اسمبلی کا اجلاس دہلی یا اس کے نواح میں کسی جگہ منعقد کیا جائے۔"

ماؤنٹ بیٹن اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میں نے انھیں یہ سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ دونوں ڈومینینوں کے مستقبل کے خوشگوار تعلقات کے لیے ایک اچھی علامت ہو گی لیکن وہ قائل نہ ہوئے"(153)

جناح صاحب کے بالکل الٹ ہندو لیڈر شپ کھل کر پاکستان کے وجود کے خلاف بات کرتے رہے اور اس کو عملی جامہ پہناتے رہے۔ پنجاب کی سرحدی حد بندیوں میں ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کو رعایت دے کر کشمیر کا مسئلہ تخلیق ہی اس لیے کیا کہ پاکستان کے گرد مزید گھیرا تنگ کیا جا سکے۔ اس کا تذکرہ آچکا کہ کیسے سرحدی حد بندیوں میں ملی بھگت سے وہ سب کچھ ہوا۔

مشن والے ہندوستان پہنچ چکے تھے ایسے اہم اور فیصلہ کن مرحلے پر 10 کروڑ کی آبادی کے لیڈر کے بارے میں پٹیل۔ کانجی کے سامنے جس رائے کا اظہار کرتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندو لیڈر شپ جناح صاحب اور مسلم مطالبوں کو سننے اور ماننے کے بارے میں کس حد تک "سنجیدہ" تھے۔

18 :اپریل 1946ء کو صبح چھ بجے سردار پٹیل کے بنگلے پر کن سے رخصت ہونے کے لیے گیا۔ کیبنٹ مشن کے ارکان ان دنوں شملہ میں تھے۔ سردار نے مجھے بتایا کہ شملہ سے واپسی پر مشن، گانگرس اور مسلم لیگ کو ایک عبوری حکومت بنانے کا کہے گا۔ اور گانگرس اس بات پر رضامند ہو جائے گی۔ اگر جناح نے اس میں شریک ہونا منظور نہ کیا تب بھی گانگرس حکومت بنا لے گی۔ میں نے سردار سے پوچھا کہ وہ کن شرائط پر جناح سے سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں؟ میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح سردار سے ملاقات کا وقت مقرر کیے بغیر میں ان کے یہاں چلا گیا تھا اسی طرح جناح کے ہاں بھی چلا جاؤں گا اور ان کو سردار کے شرائط سے آگاہ کر دونگا۔

سردار نے جواب میں کہا "اب جناح کے ساتھ کسی سمجھوتے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ جناح سے کہہ دینا کہ گانگرس اور برطانیہ کے درمیان معاملہ طے پا چکا ہے۔ اب ہندوستان میں ان کا کوئی مقام نہیں رہا۔"

پھر وہ مذاق کرتے ہوئے بولے "اور سنو! تم انھیں اپنے ساتھ امریکہ کیوں نہیں لے جاتے ہو"

گو بات مذاق میں کہی گئی لیکن اس سے سردار پٹیل کے سوچنے کا ڈھنگ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ: ایک بار جب برطانیہ سے بات طے ہو چکی تو پھر جناح اور مسلم لیگ کے تعاون کی ضرورت ہی کیا تھی؟"(154)

حیرت ہے کچھ عالی دماغوں کو کبھی ایسی باتیں اور جناح صاحب کی مخلصانہ کوششیں نظر نہیں آتیں۔ جناح صاحب ہمیشہ عزت وو قار کے ساتھ ہندوستان کے ساتھ اچھے تعلقات کے حامی اور کوشاں رہے۔

21 مئی 1947ء کورائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمبل کو انٹرویو دیتے ہوئے قائداعظم نے درج ذیل الفاظ میں پاک بھارت تعلقات کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی:

"Question: what sort of relationship do you envisage between Pakistan and Hindustan?

Answer: Friendly and reciprocal in the mutual interest of both. That is why I have been urging that let us separate in a friendly way and remain friends thereafter.

Question: how would you divide the armed forces? Do you envisage a defence pact or any kind of military alliance between Pakistan & Hindustan?

Answer: All the armed forces must be divided completely, but I do envisage an alliance, pact or treaty between Pakistan & Hindustan again in the mutual interest of both and against any aggressive outsider."

"سوال: آپ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کس قسم کے تعلقات چاہتے ہیں؟

جواب: دونوں کے مفاد میں دوستانہ۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ آیئے دوستوں کی مانند جدا ہوں تاکہ بعد میں دوست رہ سکیں۔

سوال: آپ افواج کو کس طرح تقسیم کریں گے؟ کیا آپ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کسی دفاعی معاہدہ یا فوجی معاہدے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

جواب: تمام افواج کو مکمل طور پر تقسیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دونوں ملکوں کے مفاد میں اور کسی غیر ملکی جارحیت کے خلاف سمجھوتے یا معاہدے کو مناسب خیال کرتا ہوں۔

قیام پاکستان کے بعد 11 مارچ 1948ء کو سوئٹزر لینڈ کے ایک صحافی ڈی ایرک سٹرف کو جناح صاحب نے انٹرویو دیا جس کا عنوان تھا "ہندوستان کو پاکستان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا چاہیئے"

مسٹر سٹرف کا پہلا سوال تھا کہ "کیا ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلافات اور جھگڑوں پر سمجھوتہ ممکن ہے؟

جناح صاحب کا جواب تھا کہ ہاں! اگر ہندوستان احساسِ برتری سے نجات حاصل کر لے، پاکستان سے برابری کی سطح پر بات چیت کرے اور حقائق کو سمجھے۔"

صحافی کا دوسرا سوال تھا کہ:

"whether in international affairs Pakistan and India will work jointly and also join hands for the defence of their border – both land and sea and cooperate against any outside aggression"

کیا پاکستان اور ہندوستان بین الاقوامی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں؟ اور کیا دونوں ممالک اپنی زمینی اور سمندری سرحدوں کی غیر ملکی جارحیت کے خلاف حفاظت کے لیے تعاون کر سکتے ہیں؟

جناح صاحب کا جواب تھا:

"Personally, I have no doubt in my mind that our own paramount interest demands that the dominion of Pakistan and the dominion of India should coordinate for the purpose of playing their part in international affairs, also it is of vital importance to Pakistan and India as independent sovereign states to collaborate in a friendly way jointly to defend their frontiers both on land and sea against any aggression. But this depends entirely on whether Pakistan and India can resolve their own differences".

"مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مفاد میں یہی ہے کہ وہ بین الاقوامی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ آزاد ملک کی حیثیت سے پاکستان اور ہندوستان کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ دوستانہ انداز میں کسی بھی جارحیت کا مل کر دفاع کریں لیکن اس کا مکمل انحصار اس بات پر ہے کہ کیا دونوں ممالک اپنے اختلافات ختم کر سکتے ہیں۔"(155)

عائشہ جلال کے "مسخ شدہ حقائق" میں جناح صاحب کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

"1947ء کے اندوہناک واقعات نے ہندوستان کے ساتھ اچھے تعلقات کی ضرورت کے حوالے سے جناح کے خیالات کو تبدیل نہیں کیا۔ وہ دونوں ڈومینئن کے درمیان حقیقی

دوستی کے داعی تھے۔ لیکن کسی قسم کی جبری قربت کے نہیں جیسا کہ کچھ لوگ پیش گوئیاں کر رہے تھے۔

"پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور یہ ہندوستان کے ساتھ آزاد، برابر کی خود مختار ریاستوں کے طور پر کسی تفہیم یا معاہدے میں شامل ہونے کو تیار ہے ان دونوں ڈومینئن کو ماضی کو دفن کرنا چاہیے اور تہیہ کر لیا چاہیے کہ باوجود یہ کہ جو کچھ گزر چکا ہے، ہم دوست ہی رہیں گے"

مارچ 1948ء میں جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کیا پاکستان اور انڈیا اپنے تنازعات حل کر سکیں گے تو جناح نے اس کا مثبت جواب دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب تک نئی دہلی اپنا احساس برتری چھوڑ نہیں دیتا اور ہم سے برابری کی بنیاد پر برتاؤ نہیں کرتا، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ان تمام حقائق کی روشنی میں کیا کوئی منصف مزاج شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ جناح صاحب متعصب انسان تھے اور نفرت پر مبنی ریاست چاہتے تھے جبکہ ہندو لیڈر شپ بڑی روادار اور اعلیٰ ظرف تھی؟

حوالہ جات

1. جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر19-218
2. محمد علی جناح کانجی دوآر کاداس ترجمہ وترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر02-101
3. ایضاً صفحہ نمبر03-102
4. آزادی ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ نمبر210 تا12
5. چوہدری خلیق الزماں شاہراہ پاکستان صفحہ 74-373
6. ایضاً۔ صفحہ 379
7. ایضاً۔ صفحہ 385 تا388
8. ایضاً۔ صفحہ 419
9. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیروائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر31
10. حیات قائداعظم از ہیکٹر بولتھو صفحہ نمبر174
11. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیروائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر25
12. جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر213
13. تقسیم ہند1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر60-61
14. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیروائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر60
15. حیات قائداعظم از بولتھو صفحہ نمبر60- 156
16. محمد علی جناح کانجی دوآر کاداس ترجمہ وترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر104 تا106
17. جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر30- 229
18. تقسیم ہند1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر62
19. ایضاً۔ صفحہ نمبر63
20. ایضاً۔ صفحہ نمبر23 اور24

.2 ایضاً۔ صفحہ نمبر63

.22 ایضاً۔ صفحہ نمبر65 تا67

.23 ٹنڈولکر، مہاتما جلد 5 صفحہ نمبر222

.24 ایضاً۔ صفحہ نمبر226

.25 جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر235،36

.26 حیات قائداعظم از بولتھو صفحہ نمبر171 تا174

.27 ایضاً۔ صفحہ نمبر 174

.28 تقسیم ہند 1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر72

.29 ایضاً۔ صفحہ نمبر75 80

.30 جناح آف پاکستان از سٹینلے والپورٹ صفحہ نمبر206

.31 تقسیم ہند1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر81،82

.32 جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ نمبر260-261

.33 محمد علی جناح کانجی دوآرکاداس ترجمہ وترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر106

.34 ایضاً۔ صفحہ نمبر112-111

.35 آزادی ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ نمبر124-123

.36 تقسیم ہند1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر88

.37 شاہراہ پاکستان از چوہدری خلیق الزماں صفحہ نمبر516

.38 محمد علی جناح کانجی دوآرکاداس ترجمہ وترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر17- 116

.39 حیات قائداعظم، ہیکٹر بولتھو مترجم زہیر صدیقی صفحہ نمبر201 تا203

.40 -

.41 حیات قائداعظم، ہیکٹر بولتھو مترجم زہیر صدیقی صفحہ نمبر204 تا205

.42 محمد علی جناح کانجی دوآرکاداس ترجمہ وترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر21- 118

.43 برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر 204-208

.44 ڈاکٹر امبیڈکر "تھاٹس آن پاکستان" صفحہ نمبر242

.45 برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر 208-212

.46 ایضاً۔ صفحہ نمبر 213 تا 220

.47 ایضاً۔ صفحہ نمبر 221 تا 223

.48 تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیر وائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر 40

.49 ایضاً صفحہ نمبر 41

.50 ایضاً صفحہ نمبر 45،46

.51 ایضاً صفحہ نمبر 46

.52 ایضاً صفحہ نمبر 49

.53 ایضاً صفحہ نمبر 51

.54 ایضاً صفحہ نمبر 53

.55 ایضاً صفحہ نمبر 53،54،55

.56 ایضاً صفحہ نمبر 67

.57 ٹرانسفر آف پاور والیوم 7 صفحہ نمبر 614، بحوالہ زاہد چوہدری، پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر 364

.58 پیارے لال، مہاتما گاندھی لاسٹ فیزز، والیوم 1 صفحہ 204، بحوالہ پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر 366،367

.59 بحوالہ پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر، 367

.60 ٹرانسفر آف پاور والیوم 7 صفحہ نمبر 17 - 616 بحوالہ پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر 367،368

.61 ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر 236

.62 ایضاً۔ صفحہ نمبر 239

.63 پیارے لال والیوم 1 صفحہ نمبر 73- 172 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر 372

.64 ایضاً

.65 پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول زاہد چوہدری صفحہ نمبر 373

.66 ایچ ایم سیر وائی، صفحہ نمبر 75

.67 ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر 274-273

68. ویول دی وائسرائے، زجرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر274

69. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ 637 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر78- 376

70. پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل صفحہ 377

71. بینرجی اینڈ بوس صفحہ 75- 171، ٹرانسفر آف پاور والیوم 7، صفحہ نمبر48- 646 پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول سے لیا گیا صفحہ 378،379

72. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ نمبر 659 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل صفحہ نمبر380

73. بینرجی اینڈ بوس صفحہ نمبر163 -68، ٹرانسفر آف پاور والیوم 7 صفحہ نمبر80-679 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر81،380

74. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ نمبر688-89 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل صفحہ نمبر381

75. پیارے لال والیوم 1 بک 1 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر382

76. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ 783-85، ویول ڈائری صفحہ نمبر286 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل صفحہ نمبر 410،411

77. ویول ڈائری صفحہ نمبر288 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ 419

78. ویول دی وائسرائے، زجرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر288

79. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ 853-56 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر421۔422

80. ایضاً۔ صفحہ نمبر427

81. ایضاً۔ صفحہ نمبر430

82. ایضاً۔ صفحہ نمبر437

83. ویول دی وائسرائے، زجرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر296

84. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ 972 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر442

85. پاکستان کیسے بنا جلد اوّل صفحہ نمبر443

86. پاکستان کیسے بنا جلد اوّل از زاھد چوہدری اور حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر443

87. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ نمبر1007-1008 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر444

88. ایضاً۔ صفحہ نمبر449

89. ایضاً۔ صفحہ نمبر451

90. "ڈیوائیڈ اینڈ کوئٹ" از پینڈرل مون صفحہ نمبر71- 72

91. ایضاً۔ صفحہ نمبر72

92. ایضاً۔ صفحہ نمبر71

93. ایضاً۔ صفحہ نمبر72

94. آزادی کی کہانی میری زبانی از سردار عبدالرب نشتر صفحہ نمبر131-132

95. (تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت، ایچ ایم سیروائی مترجم صفدر محمود صفحہ نمبر131)

96. تقسیم ہند1947ء کیا اصلاً مسلمان ذمہ دار تھے؟ منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر96

97. ایضاً۔ صفحہ نمبر209اور210

98. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت، ایچ ایم سیروائی مترجم صفدر محمود صفحہ نمبر62

99. وائسرائے جرنل از پینڈرل مون صفحہ نمبر302

100. ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر302

101. ٹرانسفر آف پاور والیوم7 صفحہ نمبر1036 تا38، از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر459

102. ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر305،304،303

103. ایضاً۔ صفحہ نمبر306

104. ایضاً۔ صفحہ نمبر307

105. ٹرانسفر آف پاور ولیوم7 صفحہ نمبر1050-51از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر471

106. بینرجی اینڈ بوس صفحہ نمبر297-99از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر480

107. ایضاً۔ صفحہ نمبر481

108. ایضاً۔ صفحہ نمبر483-484

109. ایضاً۔ صفحہ نمبر482

110. آزادی ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ نمبر216-217

111. ایضاً۔

112. مایکل بریچر، نہرو اے پولیٹیکل بایوگرافی صفحہ نمبر316-317 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر

485

113. ایضاً۔ صفحہ نمبر485

114. ایچ ایم سیر وائی، تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مترجم ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر79

115. ایضاً۔ صفحہ نمبر225

116. ایضاً۔ نمبر229-230

117. ٹرانسفر آف پاور والیوم8 صفحہ نمبر27 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول، صفحہ نمبر498

118. ایضاً۔ صفحہ نمبر499

119. پیرزادہ صفحہ 544-549 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ 515 تا517

120. ایضاً۔ صفحہ 554-556 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ 517 تا518

121. ایضاً۔ صفحہ 557-558 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ 518

122. جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ صفحہ نمبر282-283

123. ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر324

124. ایچ ایم سیر وائی، مترجم صفدر محمود صفحہ نمبر61

125. ایضاً۔ صفحہ نمبر82

126. جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ صفحہ نمبر صفحہ148

127. ایچ ایم سیر وائی، مترجم صفدر محمود صفحہ نمبر 232

128. ایضاً۔ صفحہ نمبر73

129. ٹرانسفر آف پاور والیوم8 صفحہ نمبر199 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل صفحہ نمبر534-535

130. ایضاً۔ صفحہ نمبر535

131. آزادیٔ ہند از مولانا آزاد صفحہ نمبر205

132. مینن، صفحہ نمبر292-293 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد اول صفحہ نمبر538-539

133. قائداعظم جیسا میں انھیں جانتا ہوں، ایم اے ایچ اصفہانی صفحہ نمبر330-331

134. لاسٹ ڈیز آف برٹش راج، از موسلے صفحہ نمبر39 تا42

135. ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون صفحہ نمبر341

136. پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر54-55

137. ایچ ایم سیر وائی، مترجم صفدر محمود صفحہ نمبر234-235

138. ایضاً۔ صفحہ نمبر181،183،182

139. لیری کولنز اور دومنک لیپیئر صفحہ نمبر166-167 اور195 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر616-617

140. ٹرانسفر آف پاور جلد12 صفحہ نمبر595 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم617

141. لیری کولنز اور دومنک لیپیئر صفحہ نمبر242-43 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر618

142. فریڈم ایٹ مڈنائٹ لیری کولنز، دامنک لیپیئر ترجمہ:سعید سہروردی160-61

143. ٹرانسفر آف پاور والیوم12 صفحہ نمبر770 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر619

144. "مکاتیب قائداعظم محمد علی جناح 1937 تا1946ء" (مرتب:ڈاکٹر ندیم شفیق ملک)

145. عائشہ جلال مسخ شدہ حقائق قائداعظم: شخصیت اور سیاست، جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرے ترجمہ ترتیب:ڈاکٹر انور شاہین

146. شخصیت اور سیاست، جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرے ترجمہ ترتیب:ڈاکٹر انور شاہین، اجیت جاوید کے انٹرویو سے اقتباس

147. جناح پیپرز مدیر اعلیٰ ڈاکٹر زوار حسین زیدی

148. آزادی ہند امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

149. محمد علی جناح کا نجی دوآر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر 129 تا31

150. ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی صفحہ نمبر157

151. جناح اتحاد سے تقسیم تک از خوشونت سنگھ صفحہ نمبر362

152. لاسٹ ڈیز آف برٹش راج، از موسلے صفحہ نمبر248

153. ٹرانسفر آف پاور والیوم11 صفحہ نمر582-83 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر530

154. محمد علی جناح کا نجی دوآر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر124 اور125

155. بحوالہ اقبال، جناح اور پاکستان از ڈاکٹر صفدر محمود

باب۔۔۔3

گاندھی کی شخصیت

کسی بھی شخصیت کو جاننے کے لیے اس کے بلند وبالا دعوے اور نظریات نہیں بلکہ اس کے عمل دیکھے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں گاندھی پوری دنیا میں زیادہ مشہور ہیں اور اکثر وبیشتر جب گاندھی جناح کا موازنہ کیا جاتا ہے تو ہمارا واسطہ اس "دلیل" سے پڑتا ہے کہ دیکھیں جی گاندھی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ اس پر مجھے اس ہمسائے کے وہ "دلیل" یاد آتی ہے جو اس نے دوسرے ہمسائے کو چارپائی نہ دینے کے حق میں دی تھی اور جواباً اسے یہ سننا پڑا کہ چارپائی بیشک نہ دو کم از کم اپنے سونے کی ترتیب تو درست کر لو۔ گاندھی کی مداحوں سے بھی میری اتنی گزارش ہے کہ بے شک گاندھی کو بھگوان بنالو لیکن کم از کم دلیل کوئی ڈھنگ کی لیکر آؤ۔ ذاتی طور پر میں ایسے کسی موازنے کے حق میں نہیں ہوں کہ تاریخ کسی پاپولیرٹی کمپٹیشن کا نام نہیں۔ سوشل میڈیائی جنگوں کے دوران ایک بار مجھے لکھنا پڑا کہ "گاندھی اپنے آوٹ ڈیٹڈ نظریات اور منافقت کی وجہ سے مکمل فراڈ تھا اگر شہرت ہی کو عظمت کا پیمانہ مان لیا جائے تو وصی شاہ یقیناً مجید امجد سے بڑے شاعر ہیں"۔ اس پر مجھے کچھ حلقوں کی طرف سے جس ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا مجھے لگا کہ گویا میں نے توہینِ مذہب کا ارتکاب کیا ہو۔ یہ عجیب ستم ظریفی کی بات ہے کہ جناح صاحب پر جو مرضی گھٹیا اور سستی الزام تراشی کرو، وہ علیت کا معیار سمجھا جاتا ہے جیسے ہی آپ باپو کی "کچھار" میں داخل ہوتے ہیں اور مُدلل تنقید بھی کرتے ہیں تو اپنے وجود اور بنیادوں سے شرمندہ ایک مخلوق آپ کو مطالعہ پاکستانی سوچ کا متاثرہ قرار دے کر آپ پر تنقید کے کوڑے برسانا شروع کر دیتی ہے۔

ایک اور "خوبصورت دلیل" جناح صاحب کا قد گھٹانے کے لیے بھی معترضین کی جانب سے دی جاتی ہے کہ پاکستان میں جناح صاحب پر پی ایچ ڈی کی اجازت نہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ الزام غلط ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر ایسا ہے بھی تو کیا انٹرنیٹ کے اس دور میں معلومات پر پابندی لگانا ممکن ہے؟ معترضین یہی کہنا چاہ

رہے ہونگے کہ اگر جناح صاحب پر پی ایچ ڈی کی اجازت ہوتی تو جناح صاحب کی شخصیت کے ایسے گوشے بے نقاب ہوتے جس سے جناح صاحب کی شخصیت چھوٹی نظر آتی۔

اگر جناح صاحب کی شخصیت کے کوئی کمزور پہلو ہیں بھی تو ان کی نشان دہی کے لیے کیا پی ایچ ڈی کی اجازت کی ضرورت ہے؟ میرے پاس ایسی ایسی کتابیں پڑی ہیں جن میں جناح صاحب پر ذاتی حملے تک کیے گئے "ریاستی جبر" میرے راستے کی رکاوٹ تو نہیں بنی مجھے وہ کتابیں بڑی آسانی سے مل گئیں اور وہ مارکیٹ میں آسانی سے دستیاب بھی ہیں جب مجھے مل سکتی ہیں تو کسی اور کو کیوں نہیں؟

کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ جب معلومات کا تبادلہ اب جتنا آسان ہو گیا تو ایسے میں جھوٹ اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر گھڑے گئے مقدمے کی حیثیت کتنی پائیدار ہو سکتی ہے؟ اب تو دنیا بھر میں گاندھی اور جناح صاحب دونوں کی شخصیات کو جاننے، پرکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو چکا۔

بندو پادھیائے جو کٹر گاندھی وادی ہیں، جناح پر تحقیق کے بعد اس حد تک جناح صاحب سے متاثر ہوتے ہیں کہ اپنی کتاب کا نام تک " قائد اعظم محمد علی جناح اینڈ دی کری ایشن آف پاکستان " رکھ لیا۔ ہو سکتا ہے مخالفین یہ اعتراض جڑ دیں کہ پادھیائے نے غلطی سے مطالعہ پاکستان کا کوئی باب پڑھ لیا ہو گا۔ یہی بات پیٹرک فرنچ نے اپنی کتاب "لبرٹی آر ڈیتھ" پر تحقیق کے بعد کہی کہ میری تحقیق کے بعد گاندھی اور جناح دونوں کے متعلق میری رائے تبدیل ہوئی جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 231 پر سر چمن لال نہال کے ایک مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اس کتاب کا مسودہ تیار ہو چکنے کے بعد ایک مضمون جناب چمن لال نہال کا میری نظر سے گزرا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب وہ گاندھی جی پر 'دی گاندھی کوارٹلٹ' کے نام سے ایک کتاب لکھنے کی تیاری کرنے چلے جس میں انھیں ہندوستانی کینوس پر گاندھی جی کے درخشاں کارناموں کا ذکر کرنا تھا تو انھیں گاندھی جی سے متعلق بہت سارے تعجب خیز باتوں کا سامنا ہوا۔ اس حیرت انگیز احساس کو قلم بند کرنے کے لیے انھوں نے اپنے اس مضمون کا نام "حیرت حیرت" رکھا ہے۔ یہ مضمون "ہندوستان ٹائمس" کے 8 جنوری 1955ء کے شمارے میں چھپا ہے۔"

کانگرس ایک بڑی اور پرانی پارٹی تھی، سرمائے کی کمی نہیں تھی پروپیگنڈے کے ہر حربے سے آشنا کانگرس نے گاندھی کی سادہ طرز زندگی کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت کو عظمت کی ہمالیہ پر بٹھا دیا۔ ان کی شخصیت کتنے

بڑے تضادات کی شاہکار تھی، کہاں کہاں اس نے قلابازیاں کھائیں، کسی کو تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ ایک دفعہ جب "سب لوگ" یہی کہنے لگے کہ گاندھی عظیم ہیں تو پھر کسی اور کو مزید کچھ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غلام احمد پرویز کا ایک انٹرویو سن رہا تھا جس میں ان سے منسوب ایک بات انٹرویور نے اسے سنائی کہ کیا یہ بات آپ نے کہی؟

پرویز نے کہا "میرے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں"

سوال پوچھنے والے نے پوچھا آخر یہ بات ہر جگہ پھیلی کیسے؟

پرویز نے کہا کہ مولوی نے اپنی تقریر میں یہ بات کی ہوگی باہر نکل کر ایک بندے نے دوسرے کو، دوسرے نے تیسرے کو یہی بات سنائی جب کوئی سمجھدار بندہ یہ سوال اٹھاتا اس بات کا کوئی ثبوت؟ تو "دلیل" دی جاتی کہ سب لوگ یہی کہہ رہے ہیں۔ گاندھی عظیم ہیں کہ "سب لوگ" یہی کہتے ہیں یا پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ چاہے اس کا کردار اور طرز عمل کچھ بھی ہو۔

جناح یا کوئی اور شخصیت اگر ایسی ڈرامے بازیوں پر یقین رکھتی تو شاید وہ بھی گاندھی کی طرح عظمت کی بلندیوں پر فائز ہوتے۔ مثلاً جس جنگ عظیم دوم میں اس نے اپنا مشہورِ زمانہ مغربیوں کے نام خط لکھا کہ نازیوں کے ساتھ "عدم تشدد" کے ساتھ لڑو انھیں لوٹنے دو جو مرضی کریں آپ نے ہتھیار نہیں اٹھانے۔ اسی جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی اس "عظیم مہاتما" نے وائسرائے کے سامنے روتے ہوئے برطانیہ کی حمایت کا اعلان کیا کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں، ٹنڈولکر کے مطابق "اس نے اکیلے برطانویوں کے حق میں جنگ لڑی یاد رہے برطانوی جنگ کرنے جا رہے تھے کوئی پھول برسانے نہیں۔ جب برطانویوں کے ساتھ بات نہیں بنی تو قلابازی کھا کر "عدم تشدد" پر ایمان لے آئے اور پھر مغربیوں کو خط بھی لکھ ڈالا کہ عدم تشدد سے لڑو۔ اس کے بعد جیل گئے اور جیل سے واپسی پر ایک بار پھر عدم تشدد بھول کر برطانویوں کو جنگ میں حمایت کی پیشکش کر ڈالی۔

عدم تشدد کے مہاتما پہلی جنگِ عظیم میں برطانویوں کے لیے گاؤں گاؤں قریہ قریہ فوجی بھی بھرتی کرتے رہے ان تمام باتوں کی تفصیل آگے آئے گی۔ کہنا یہ ہے کہ دنیا میں گاندھی کی شخصیت کو نئے سرے سے دیکھنے کا ایک رجحان نظر آرہا ہے سوائے ہمارے ہاں کے احساس کمتری کے مارے کچھ کنویں کے مینڈکوں کے، کہ جن کا گاندھی ہر حال میں عظیم ہے۔

مغرب میں گاندھی بارے کانگرسی پروپیگنڈے پر بات کرتے ہوئے بیورلے نکولس ایک کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا نام ہے "دی آئرن ڈکٹیٹر" یہ کتاب پٹیل پر لکھی گئی ہے۔

بیورلے نکولس کے مطابق ''سردار پٹیل گانگرس کے صدر ہیں۔ جان گنتھر نے انھیں گانگرس کا جم فارلے اور پارٹی کو قابو میں رکھنے والا بے رحم تنظیم کار'' قرار دیا تھا۔

کتاب کے مصنف نے یہ عنوان بڑے فخر سے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ اپنا تحتی عنوان بھی شامل کیا ہے۔

'' گاندھی کا عظیم ترین جرنیل''

یہاں ''جرنیل'' کا لفظ قابل غور ہے۔ایک دھیمی آواز والے امن کے پیامبر کے نام کے ساتھ ''جرنیل'' کا نام سن کر یقیناً آپ کو بھی حیرت ہوئی ہو گی۔ گاندھی، جم فارلے، پارٹی کا سربراہ، جرنیل یہ سب ایک کشتی میں کس طرح سوار ہو سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔"

آگے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "پٹیل کی تقریریں عام طور پر شائع نہیں ہوتیں۔ کم از کم مغرب کے آزاد خیال اخباروں میں۔ گانگرس کا پروپیگنڈہ کرنے والے (جو گوئبلز کو بھی سبق سکھا سکتے ہیں) اس بات کا پورا اہتمام کرتے ہیں کہ اخبارات، خصوصاً مغرب کے اخبارات میں کوئی اس طرح کی خبر شائع نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اگر گاندھی کو اپنے عظیم ترین جرنیل جیسے خونخوار نظر آنے والے شخص کے ساتھ دکھایا جائے، تو اس سے گاندھی کی شخصیت کے بارے میں غلط تاثر پیدا ہو گا۔
>
> لہٰذا گاندھی کی تصاویر ہمیشہ بکریوں کے ساتھ، چھوٹے بچوں کے ساتھ، کسی تالاب کے کنارے جس میں کنول کے پھول کھل رہے ہوں، کھینچی جاتی تھیں کیونکہ یہ بے زبان چیزیں، گاندھی کے حقیقی روپ کی غمازی نہیں کر سکتی تھیں۔"(1)

ویسے عدم تشدد والے مہاتما اپنے لیے "جرنیل" کا لفظ خود بھی استعمال کر چکے۔ اپنی ایک تقریر جو انھوں نے کانگرس کے رام گڑھ کے اجلاس میں 1940ء میں کی، کچھ اس طرح تھی:

> "گانگرس محض ایک جمہوری تنظیم نہیں، ایک عسکری تنظیم بھی ہے۔ فوج کوئی جمہوری ادارہ نہیں ہوتی اس کے سپاہی رائے نہیں دیتے بلکہ جرنیل کا حکم مانتے ہیں۔ وہ چون و چرا نہیں کرتے۔ جرنیل کا حکم قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ میں آپ کا جرنیل ہوں اور جب آپ نے مجھے اس منصب پر خود فائز کیا ہے تو میرے حکم کی تعمیل بھی آپ کا فرض ہے اس ضمن میں کوئی دلیل نہیں چلے گی۔ کوئی بھی لفظ "کیوں" کا استعمال نہیں کرے گا"

(گانگرس کی تاریخ از پٹہ بھائی سیتار میا، جلد دوم صفحات 174-75از موجمدار)

گاندھی کے بارے میں مختلف شخصیات کی آراء

برطانوی صحافی پیٹرک فرنیچ نے ہندوستان کی جنگِ آزادی پر 1997ء میں ایک کتاب "لبرٹی آر ڈیتھ" لکھی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے جریدے آؤٹ لک نے اپنے 6 اگست 1997ء کے شمارے کے صفحات 23 تا 27 میں پیٹرک فرنیچ کا یوں حوالہ دیا:

"Gandhi remains the most baffling and inconsistent figure in the Indian Freedom Movement. A man who worshiped truth yet often had trouble identifying it; who shunned adulation, yet seems to do all he could to encourage it.

A close reading of his statements on a particular subject result not in a sense of illumination, but of obfuscation. He often changed his mind and many of his pronouncements amount to mental spring-clearing rather than an exposition of ideology. His opponents during his life time portrayed this as hypocrisy. To British officials he was a twister and his methods were simply devious. One provincial governor described him? as............ (a rather too crude expression to repeat). For Gandhi, truth was never a static reality, but always a fluid concept that adjusted according to his personal whim. This was to cause him considerable problems as a political negotiator, since his own recollection of discussions rarely tallied with those of other participants".

"ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں گاندھی کی شخصیت ایک انتہائی حیران کن اور پر تضاد بنی ہوئی ہے۔ ایک ایسے شخص کی جو 'سچ' کی پوجا کرتا ہے تاہم اسے اکثر اس 'سچ' کی پہچان اور نشاندہی میں دشواری پیش آتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو خوشامد سے پرہیز کرتا ہے تاہم ان ساری باتوں کو کرتا ہے جس سے (خوشامد کی) حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

کسی خاص موضوع پر گاندھی کے بیانات کو نظر غائر سے دیکھنے پر آدمی کو کسی موقف پر سیر حاصل تشریح یا وضاحتی روشنی محسوس ہونے کے بجائے Obfuscation یعنی الجھاؤ اور گم فہمی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اکثر اپنی سوچ کو بدلتے رہے ہیں اور ان کے بہت سارے

بیانات کسی ideological exposition یا اظہارِ تصورات کے بجائے Mental Spring- clearing یعنی ذہنی اُچھال کے ذریعے ایک پہلو کو چھوڑ کر دوسرے پہلو کو اپنانے والے ہوا کرتے ہیں ان کے مخالفین نے ان کی زندگی ہی میں اسے Hypocrisy یا مکاری (دوروئی) سے تعبیر کیا ہے۔

برطانوی حکام کی نظر میں وہ ایک Twister یعنی باتوں کو توڑ مروڑ کر بدل دینے والے شخص تھے۔ اور ان کے طریقے صرف کج رو یا گمراہ کن (devious) ہوا کرتے تھے۔ ایک صوبائی گورنر ان کے لیے الفاظ استعمال کیے جو دہرائے نہیں جاسکتے۔

گاندھی کی نظر میں 'سچ' کوئی مستقل حقیقت نہیں بلکہ ہمیشہ ایک fluid concept یعنی ایک سیال تصور تھا جسے ان کی اپنی ذہنی ترنگ یا خبط کے مطابق متوازن کیا جاسکتا تھا۔ اور اس نے ان کو خود ہی کافی مسائل سے دوچار کیا کیونکہ کسی گفت وشنید میں ہوئی باتوں کو جب وہ بعد میں خود یاد کرنے لگتے تھے تو ان کی تلخیص اور اس گفت و شنید کے دوسرے شرکاء کے متن مشکل ہی سے میل کھاتے تھے۔"

پیٹرک فرینچ کے اس معاندانہ روّیے کا نوٹس لیتے ہوئے (لندن کے) انیر دھ بہل اور (دہلی کے) ترون-جے-تیج پال نے ایک انٹرویو میں ان سے صراحت طلب کی۔ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

سوال- کیا آپ نے صرف اپنی کتاب پر لوگوں کی توجہ لینے کے لیے گاندھی اور جناح پر ایک تبدیلی رائے والا روّیہ اختیار کیا ہے؟

جواب- مہاتما گاندھی میرے اعلیٰ ترین ہیروز میں سے ایک تھے۔ اس لیے جب میں نے ان کی زندگی اور کارناموں پر ریسرچ شروع کی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ گاندھی کے بارے میں لوگوں کا عمومی ادراک حقیقت وسچائی سے بہت پرے تھا، تو مجھے بڑا دھچکا لگا۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ گاندھی ایک بے داغ صوفی سنت تھے تو کوشش کیجیے ان چیزوں کو پڑھنے کی جو انھوں نے تحریکِ آزادی کے مخصوص موقعوں پر جیسے کہ 1921ء 1942ء یا 1946ء میں کہیں۔ تب آپ اپنے ذہن کو بدلنے پر مجبور ہونگے۔ وہ ایک انتہائی چالاک وحیلہ باز سیاستدان تھے جو اپنے مخالفین کی بات پر توجہ دینے کے بالکل اہل نہیں تھے۔

جہاں تک جناح کا تعلق ہے تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں ہے کہ 'لبرٹی آر ڈیتھ' کے لیے ریسرچ کرنے کے ساتھ ان کے بارے میں میری ذاتی رائے کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ برطانیہ اور ہندوستان کے بہت سارے لوگوں کی مانند میں بھی پہلے جناح کو ایک کٹر اور متعصب شخص کی شکل میں جانتا تھا۔ جس نے برِّصغیر

کے ٹکڑے کرا دیے۔ لیکن گہرے مطالعے سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک بڑے ہی پر معنی و پہلو دار شخصیت کے مالک تھے جو تادمِ حیات ایک ہندوستانی نیشنلسٹ اور سیکولر بنے رہے۔

(پیٹرک فرینچ کا دوسری جگہ کہنا ہے کہ) خود پاکستان میں بھی جناح ایک بے چین بابائے قوم (Uncomfortable of the Nation) تھے۔ 1930ء اور 1940ء کی دہائیوں میں مسلمانوں کے حق بجانب مطالبوں کے تئیں بڑی حد تک کانگرس کی سخت گیری کی وجہ سے نیز نہرو، گاندھی اور پٹیل کے اس انکار کے باعث بھی کہ ہندوستان کی اقلیتوں کے ایک قابل لحاظ اکثریت کی جمہوری حمایت جناح کو حاصل ہے، جناح اور مسلم لیگ کو ایک سخت و مشکل سیاسی مقام پر پہنچا دیا تھا:

"Jinnah and the Muslim League was pushed into an extreme political position during 1930's and 1940 largerly through the intransigence of the congress in meeting justified demands by muslims, and by refused of Nehru, Gandhi and Patel , in particular to accept that Jinnah had the democratic support of substantial minority of Indian people. "

"اگر میری کتاب (revisionist) یعنی تبدیلی رائے والا یا نظر ثانی کردہ خیال ہے تو یہ سب محافظ خانوں اور لائبریریوں (کتب خانوں) میں میری تحقیق کا نتیجہ ہے۔ دوسرا کچھ نہیں۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ جناح کو کانگرس نے دھکیل کر ایک کونے میں کر دیا تھا was pushed into a corner اور ان کے لیے پاکستان کا مطالبہ کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

جواب: مسلم مطالبوں کے لیے گنجائش اتنی کم رہ گئی تھی کہ تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔ 1940ء کے لاہور ریزولیوشن کے بعد بھی جناح نے اصل میں پاکستان کا کوئی واضح تصور نہیں پیش کیا تھا یہاں تک کہ 1946ء تک انھوں نے کرپس کے ذریعے پیش کیے گئے اس موقف کی حمایت کی جس میں پاکستان کو ایک خود اختیاری (اٹانومس) مملکت کا درجہ دیا جا رہا تھا۔ بالکل واضح ہے کہ جناح لچکدار تھے۔ کلکتہ کی خونریزی نے دونوں جانب کے مواقف میں سختی لا دی۔" (2)

اندولال یاجنک جو کسی زمانے گاندھی کے دست راست رہے، نے ایک کتاب Gandhi As I know

Him لکھی جس کا ترجمہ ظفر انصاری نے کیا۔ اس کتاب کے ناشرین نے دیباچے میں گاندھی کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کا ایک حصہ کچھ اس طرح ہے۔

"آزادی کی قومی جدوجہد میں گاندھیت ایک بڑی خلفشار پیدا کرنے والی قوت ثابت ہو چکی ہے۔ اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر انتہائی رجعت پسندی کا دور قائم کیا۔ نیز مذہب، توہم پرستی اور اندھی تقلید کو جو خام تعلیم یافتہ ہندوستانی عوام کے مخصوص دماغی رجحانات ہیں، بے حد متاثر کر کے قوم کی سیاسی بیداری کو روحانیت کی دلدل میں لا پھنسایا۔ بہت سے بلونت کارکنوں نے جو برطانوی سرمایہ داری کے اقتدار کے خلاف ایک حقیقی سیاسی جنگ میں قوم کی رہنمائی کرتے، اس رجحان کے زیر اثر کھدر کی پھیری کرنے والے اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر جیل جانے والوں کا روپ دھارن کر لیا۔ اس نے عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے، تنقیدی صلاحیت کو کچل دیا اور جدت و ذہانت کے خلاف ایک جہاد شروع کیا۔"

آگے لکھتے ہیں کہ "وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے سیاسیانہ مذہبی منطقی دلائل کے ذریعے ضمنی باتوں کو بہت اہم بنا کر انھیں عوام کی توجہ کا مرکز بنا دیتے ہیں۔ اور جب خود ان کا اپنا "سیاسی فرینکن اسٹائن" (ایک افسانوی کردار جس کی ہوشیاریاں اور چالاکیاں خود اسی کے لیے مصیبت بن گئی تھیں) ان بندھنوں کو جو انھوں نے اپنی زمانہ سازی سے بنا رکھے ہیں توڑنے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ ایک لمحے میں نیچے اتر آتے ہیں۔ وہ اپنی تاویلوں سے شکست کو فتح کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں اور اپنی شکست اور ناکامیوں کی ذمہ داریوں کو آسانی سے قوم کے سر منڈھ دیتے ہیں۔"

مزید لکھتے ہیں کہ "مشینوں کی مخالفت، کھادی کا پرچار، برطانیہ کی قلب ماہیت کے لیے دعا کی تلقین، اپنے مخصوص دماغی خبط کے ماتحت عوام کی پھیلی ہوئی سیاسی تحریک سے کنارہ کشی، مذہبی اصول کے پردے میں اپنے ہی پیروؤں کو نشانہ ملامت بنانے کا عجیب و غریب طریقہ، گھمسان لڑائی میں پسپائی کا رجحان، قوم کو مشکل میں پھنسا دینے کی مسلمہ عادت اور اپنے برطانوی دوستوں کو اپنی پسند پر ہندوستان کو مطعون ٹھہرانے کا موقع دینا۔ یہ سب ان کی ایسی باتیں ہیں جنھوں نے سامراجیوں کو اپنی پوزیشن اور زیادہ مضبوط کرنے میں مدد پہنچائی اور ایسا کرنے میں انھوں نے لوگوں کی خوش اعتقادی اور مذہبی عقیدت مندی سے فائدہ اٹھایا ہے۔"(3)

ہندوستانی سیاستدان این اے رائے گاندھی ازم پر اس طرح تنقید کرتے ہیں۔

"گاندھی ازم، ہندوستان کے پسماندہ عوام کی "ہیرو کو پوجنے" اس کی اندھی تقلید کرنے اور جہالت کی پیداوار ہے۔ گاندھی ازم ہمارے عوام کی بدترین صفات، جہالت، بزدلی، احساس کمتری اور پسماندگی کا اظہار ہے "(4)

سبھاش چندر بوس گاندھی کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"مہاتما کا کردار کبھی بھی واضح اور دوٹوک نہیں رہا۔ کہیں کہیں تو وہ نہایت آدرش وادی اور دوربیں مفکر نظر آتے ہیں جبکہ دوسری جگہوں پر وہ خاص مفاد پرست سیاستدان محسوس ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ نہایت ضدی اور انتہا پسند انسان کا روپ اپنائے ہوتے ہیں اور کبھی وہ بچوں کی سی بے بسی سے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ وہ سیاسی سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی سے یکسر محروم رہے۔ بحیثیت مجموعی منجھے ہوئے فہیم برطانوی سیاستدانوں کے مقابلے میں گاندھی جی کوئی اصلیت یا مرتبہ نہیں رکھتے تھے۔"(5)

سبھاش چندر بوس نے جیل سے بھیجے کچھ خطوں میں اپنے بڑے بھائی سرت چندر بوس سے گاندھی کے متعلق اس رائے کا اظہار کیا۔ مندرجہ ذیل خط 31 اکتوبر 1940ء کو لکھا گیا:

"The more I think of Congress politics, the more convinced I feel that in future we should devote more energy and time to fighting the High Command. If power goes into the hands of such mean, vindictive and unscrupulous persons when swaraj is won, what will happen to the country? If we don't fight them now, we shall not be able to prevent power passing into their hands. Another reaon why we should fight them now is that they have no idea of national reconstruction.Gandhiism will land free India in a ditch if free India is sought to be rebuilt on Gandhian, non violent principles. India will then be offering a standing invitation to all predatory powers."

"جس قدر زیادہ میں گانگرس کی سیاست کے متعلق سوچتا ہوں اسی قدر زیادہ مجھے یقین ہوتا جاتا ہے کہ مستقبل میں ہمیں زیادہ سے زیادہ توانائی اور وقت ہائی کمان کے خلاف لڑنے پر صرف کرنا ہوگا۔ اگر طاقت ایسے کمینے، منتقم اور بددیانت افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے تو سوراج کب حاصل ہوگا، ملک کا کیا ہوگا؟؟ اگر ہم ابھی ان کے خلاف نہ لڑے تو ہم طاقت کو ان کے ہاتھوں میں جانے سے نہیں روک سکیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں

ابھی ان کے خلاف کیوں لڑنا چاہئے یہ ہے کہ انھیں قومی تعمیرِ نو کا کوئی شعور نہیں۔ گاندھی ازم آزاد ہندوستان کو کھائی میں دھکیل دے گا۔ اگر آزاد ہندوستان کی تعمیر نو گاندھی کے عدم تشدد کے اصول پر کی گئی تو ہندوستان اس صورت میں حملہ آور غاصب طاقتوں کے لیے کھلا دعوت نامہ بن جائے گا۔" (6)

12 اکتوبر 1940ء کو جیل ہی سے ایک اور خط میں سبھاش نے لکھا:

The latest phase of Ghandiism with its sanctimonious hypocrisy, its outrage on democracy and its queer and ununderstandable formula for political ills is sickening to a degree. One is force to wonder which is a great menace to India's political future—the British bureaucracy or the Gandhian hierarchy

گاندھی ازم کا آخری دور مع اپنی پارسائی کی منافقانہ نمائش کے۔۔۔۔جمہوریت پر اس کا اشتعال اور سیاسی خرابیوں کے لیے اس عجیب وغریب اور ناقابل فہم فارمولا..... آخری حد تک ناقابل برداشت ہے۔ آدمی حیران ہونے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے لیے کون بڑا خطرہ ہے .. انگریز نوکر شاہی یا گاندھی کے مقلدوں کی تنظیم۔"(7)

ایچ ایم سیروائی گاندھی سے متعلق رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

گاندھی 30 جنوری 1948ء کو اپنے قتل تک گانگرس کے اُفق پر چھائے رہے۔ہندوستان کے عوام کی جتنی عقیدت ان کے حصے میں آئی کسی اور لیڈر کو میسر نہ آسکی۔ان کے سادہ اندازِ زندگی نے انھیں پاکیزہ ہستی کا مرتبہ دے دیا۔ان کے الفاظ ہندو دھرم کا حصہ لگتے تھے اور عوام کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔اس لیے ان کی کامیابیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ویسے بھی یہ معلوم کرنا کہ ان کی شخصیت پر کب فقر اور کب سیاست حاوی ہوتی تھی، آسان کام نہیں۔"(8)

اسی طرح آگے جاکر وہ لکھتے ہیں:

"گاندھی کی روحانی بزرگی اور سادہ زندگی کے سبب لوگ ان کی جانبِ کھنچے چلے آتے تھے اور ان کی مذہبی تقاریر لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔چالاک سیاستدان کی حیثیت سے وہ گانگرس پر غالب تھے اور دوسری جماعتوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے گاندھی

بیورلے نکولس اپنی کتاب میں گاندھی کے بارے میں اپنی رائے اس طرح بیان کرتے ہیں:

"مسٹر گاندھی ایک مثالی ہندو سیاستدان کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ بے انتہا خوشامد پسند، تنگ نظر، جاہل اور دوسروں کی بات برداشت نہ کرنے والے شخص ہیں۔ اس بات کو بہت اچھالا گیا ہے کہ انھیں سچائی کا بہت خیال تھا۔ اس سلسلے میں مَیں ان سے صرف یہ کہونگا کہ وہ ڈکشنری میں اس لفظ کا مطلب دیکھ لیں۔ اگر وہ سمجھدار ہیں تو فوراً موضوع بدل دیں گے۔"(10)

ایک دوسری جگہ وہ گاندھی کے متعلق لکھتے ہیں:

"کوئی قابل سے قابل مبصر بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ گاندھی کس وقت اپنی باتوں میں مخلص ہوتے ہیں اور کس وقت نہیں ہوتے۔ ان کا ذہن مختلف متضاد باتوں اور واہموں کا ایک جنگل ہے جس میں کھوج لگانے والا ہر شخص اپنا راستہ بھول جاتا ہے اور شاید گاندھی کا مدعا بھی یہی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے طویل سیاسی کیریئر میں مختلف متضاد بیانات دیتا ہے تو اس طرح وہ ہر صورت حال کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اپنے کسی ایک بیان کا حوالہ دے کر کہہ سکتا ہے "میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ۔۔۔۔۔" گاندھی بھی ہر مشکل مرحلے میں یہی کرتے ہیں۔"(11)

نظریات

میں پہلے ہی لکھ چکا کہ ایک دفعہ جب میں نے گاندھی کے نظریات کو آوٹ ڈیٹڈ لکھا تو کچھ حلقوں کی طرف سے ایسا ردِ عمل آیا جیسے میں نے کسی مقدس ہستی کی شان مین کوئی گستاخی کی ہو۔ آیئے گاندھی کے نظریات پر نظر دوڑاتے ہیں۔

موجمدار کے مطابق جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران گاندھی جی ٹالسٹائی، تھورو اور رسکن کی تحریروں سے متاثر ہوئے۔ ان کے مطابق خصوصی طور پر رسکن کی تحریر "Unto This Last اس آخری حد تک" پڑھنے کے بعد انھوں نے جدید شہری تمدن کو مٹانے اور اس کی جگہ ایک نیا تمدن رائج کرنے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا جس کا مرکزی خیال تھا "شہر سے گاؤں کی طرف مراجعت" فطرت کی طرف مراجعت ان کے خیال میں اسی طریقے پر عمل کرتے ہوئے دنیا میں تشدد کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

"انھوں نے اپنے نظریات کا اظہار اپنی کتاب "ہند سوراج" میں کیا جو 1909ء میں شائع ہوئی۔ یہاں اس کتاب سے کچھ اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

"یہ انگریز نہیں ہیں جو ہندوستان پر حکمرانی کر رہے ہیں بلکہ یہ جدید تہذیب ہے جو اپنے ریلویز، ٹیلیگرافوں اور ان تمام ایجادات کے ذریعے (ہند پر حکمران ہے) جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تہذیب کی فتوحات ہیں۔ بمبئی، کلکتہ اور ہندوستان کے دیگر بڑے شہر اصلی طاعون زدہ علاقے ہیں۔ طبی سائنس کالے جادو کا طاقتور نچوڑ ہے۔اس کی نسبت عطائیت کئی گنا قابل ترجیح ہے۔ ہسپتال وہ آلات ہیں جنھیں شیطان اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ہندوستان کی نجات ان تمام چیزوں کو فراموش کر دینے میں پنہاں ہے جو اس نے گذشتہ 50 برس یا اتنے ہی عرصے میں سیکھے ہیں۔ریلویز، ٹیلیگراف، ہسپتال، وکلا، ڈاکٹرز اور ایسی تمام چیزوں کا جانا ہوگا۔"(12)

جب سے میں نے ہوش سنبھالا ایسی جاہلانہ باتیں میں نے صرف ایک قبائلی سردار ہی سے سُنی تھیں جس کے علاقے میں جب گورنمنٹ نے بجلی کی لائنیں بچھانے کا فیصلہ کیا تو اس نے یہ کہہ کر سادہ لوح عوام کو بھڑکا کر حکومتی ملازمین کو کھمبے لگانے سے روکا کہ بجلی فراہم کر کے حکومت ہمیں غلام بنانا چاہ رہی ہے۔

گوکھلے نے جب گاندھی کی یہ کتاب پڑھی تو اسے اس قدر عامیانہ لگی کہ اس نے پیشین گوئی کی کہ گاندھی ہندوستان میں ایک برس گزارنے کے بعد خود ہی اس کتاب کو تلف کر دیں گے۔ لیکن گوکھلے کی یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔1939 میں "ہند سوارج" کے بارے میں گاندھی نے لکھا کہ:

"Hind Swaraj was written in 1909. Since then it has undergone many editions and has been translated in many languages of the world. I was asked last year by Shrimati Sophia Wadia to write a foreword for the edition she was bringing out. I, therefore, had the pleasure of having to re-read it carefully. The reader may know that I could not revise a single idea. The key to understand that incredibly simple—so simple as to be regarded foolish—booklet, is to realize that it is not an attempt to go back to the so-called ignorant Dark Ages. But it is an attempt to see beauty in voluntary simplicit, poverty and slowness. I

have pictured that as my ideal." (13)

"'ہند سوراج' 1909 میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک اس کے کئی ایڈیشنز چھپ چکے ہیں اور اس کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ گزشتہ برس شریمتی سوفیہ واڈیا نے مجھ سے کہا کہ میں اس ایڈیشن کے لیے ایک حرفِ آغاز لکھ دوں جسے وہ شائع کر رہی ہیں۔ چنانچہ مجھے اسے دھیان سے دوبارہ پڑھنے کا خوشگوار موقع ملا۔ قاری یہ جان سکتا ہے کہ میں نے کسی ایک خیال پر بھی نظر ثانی نہیں کی۔ یہ جاہلانہ تاریک ادوار میں واپس جانے کی کوشش نہیں ہے بلکہ یہ حسن کو اس کی سادگی، غربت اور سست روی میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ میں نے اس کی اپنے آئیڈیل کے طور پر تصویر کشی کی ہے۔"

25 اکتوبر 1939ء کو گاندھی سیوا سنگھ کے سامنے تقریر میں گاندھی کی نظریات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ:

"I would ask you to read Hind Swaraj with my eyes and seetherein the chapter on how to make India nonviolent. You cannot build non violence on a factory civilization, but you can build it on self-containedvillages" (14)

"میں آپ سے کہونگا کہ ہند سوراج کو میری آنکھوں سے پڑھیں اور اس میں وہ باب دیکھیں جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کو غیر متشدد کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ آپ کارخانوں کی تہذیب میں عدم تشدد کی تعمیر نہیں کر سکتے آپ اسے صرف خود کفیل دیہات میں ممکن بنا سکتے ہیں"

اکتوبر 1945ء میں انھوں نے جواہر لال نہرو کے نام ایک خط کچھ اس طرح لکھا:

"I am now an old man... I have, therefore, named you as my heir. I must, however, undertand my heir and my heir should understand me."

"I am convinced that if India is to attain true freedom and through India the world also, then sooner or later the fact must be recognized that people willhave to live in

villages, not in towns. We can realize truth and non-violence only in the simplicity of village life and this simplicity can best be found in the charkha and connotes(15)۔"

"میں اب ایک بوڑھا انسان ہوں چنانچہ میں نے آپ کا نام اپنے جانشین کے طور پر پیش کیا ہے۔ بہر حال مجھے اپنے جانشین اور جانشین کو مجھے سمجھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہندوستان کو آزادی حاصل کرنا ہے اور ہندوستان کے ذریعے دنیا کو بھی آزاد ہونا ہے تو جلد یا بدیر اس حقیقت کو لازماً تسلیم کرنا ہو گا کہ لوگوں کو شہروں میں نہیں بلکہ دیہات میں رہنا ہو گا۔ ہم صداقت اور عدم تشدد کو صرف دیہی زندگی کی سادگی میں سمجھ سکتے ہیں اور یہ سادگی چرخے اور ان سب چیزوں میں تلاش کی جاسکتی ہے جو چرخے سے متعلق ہیں"

گاندھی کے ان نظریات پر ان کے متعقدین اور جانشینوں نے کس طرح عمل کیا آیئے دیکھتے ہیں:

بمبئی میں 14 جون 1947ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں سردار پٹیل نے ایک بے رحمی کی حد تک دوٹوک تقریر کی جس میں گاندھی جی کے عدم تشدد اور اهنسا جیسے آدرشوں کو خیر آباد کہا گیا تھا۔ "آزادی آرہی ہے۔ انھیں لازما صنعتیں قائم کرنی ہیں۔ انھیں لازما فوج قائم کرنی ہے اور اسے موثر اور مضبوط بنانا ہے"(16)

موجمدار کے مطابق "نہرو کے خیالات بھی انھی خطوط پر سفر کر رہے تھے۔ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے انھوں نے ملک میں وسیع پیمانے پر صنعتیں لگانے پر زور دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مغرب کا پس منظر جس میں مشین اور سائنس و ٹیکنالوجی کو اہم ترین گردانا گیا ہے، ہندوستان میں بھی اپنایا جانا چاہیے۔ چنانچہ یہ بے حد واضح تھا کہ اگرچہ انگریز جاچکے تھے لیکن نہرو اور پٹیل کے صاف اعلان کے بعد گاندھی جی کے یوٹوپیا کی تعمیر کا امکان نہایت موہوم تھا۔ اب گاندھی جی کی حیثیت بے حد غیر واضح تھی اور ان کے پاس اس کے علاوہ کرنے کے لیے کچھ نہ تھا کہ وہ دُعائیہ اجتماعات میں اپنے خیالات کا پرچار کریں۔"

آیئے اب اس بارے عام آدمی کا ردِ عمل دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں:

"گاندھی جی اپنے خیالات کے ساتھ عملی تجربات کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً گاندھیانہ نظام کے تحت ایک مثالی گاؤں کو کیسا ہونا چاہیئے؟ اسی مقصد کے پیش نظر اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ ضلع واردھا کے ایک گاؤں سیواگرام میں آباد ہو گئے۔ گاندھی جی کی زندگی میں

قسم کی گاند گر کی موت سے

لگ بھگ 12 برس بعد ایک سر گرم سماجی کارکن نے سیوا گرام کا دورہ کیا اور جن حالات کا انھوں نے مشاہدہ کیا وہ مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔

"باپو کے وقت میں سیوا گرام کے ہر گھر میں ایک چرخہ ہوا کرتا تھا۔ آج پورے گاؤں میں ایک چرخہ بھی نہیں۔ جہاں تک بنیادی تعلیم کا تعلق ہے جس کا سیوا گرام مرکز تھا، اس کے متعلق وہ (سیوا گرام کے عوام) ڈھکی چھپی نفرت کے بغیر کہتے ہیں "ہم اپنے بچوں کو چوتھی جماعت (پرائمری) کے بعد آشرم سکول نہیں بھیجتے کیونکہ نئی تعلیم حاصل کرنے والوں کو نوکریاں نہیں ملتیں اس لیے ہمارے لڑکے واردھا شہر جاتے ہیں۔ وہ رسمی سکول میں پڑھنے کے لیے 4 میل چلتے ہیں (دیہاتی) کہتے ہیں۔۔۔ ہم ہمیشہ زمین کے کاشتکار نہیں رہنا چاہتے۔ ہم بھی وکیل اور ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔"(17)

1940ء سال نو کے موقعے پر ایک خط میں جناح صاحب نے گاندھی کے ان مخصوص نظریات پر تنقید کرتے ہوئے اسے ہندو مسلم مسئلے بارے اپنا کردار ادا کرنے کو کہا:

"آج آپ سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی ایسا انسان نہیں جس پر ہندو انڈیا کو اس قدر اعتماد ہو اور آپ اس کے ایما پر اقدام کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ یہ امید تو اب بعید از قیاس ہے کہ آپ اپنا جائز کردار ادا کریں گے اور سراب کا پیچھا کرنا چھوڑ دیں گے۔ واقعات تیزی سے متحرک ہیں آپ کی زبانی جمع خرچ کی مہم یا ہفتہ وار ہریجن میں آپ کے مابعد الطبیعات، فلسفے، اخلاقیات یا کھڈی، اہنسا اور چرخہ کاتنے سے متعلق مخصوص نظریات ہندوستان کے لیے آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ آگے بڑھنے میں صرف عمل اور سیاسی دانش ہی ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ اب بھی ہمارے ملک کی خدمت کے لیے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں اور ہندوستان کو اطمینان اور مسرت کی طرف لے جانے میں اپنا مناسب حصہ شامل کر سکتے ہیں"

پوری دنیا کی بات تو چھوڑیں خود گاندھی کے جانشین، ہندوستان اور ہندوستانی عوام نے ایسے کسی فلسفے کو عملی زندگی میں اپنانے کی کوشش کی؟ سائنس سے نفرت، شہر چھوڑ کر دیہات میں رہنا، صنعتوں کی مخالفت۔ چرخہ چلانا، اور عدم تشدد گاندھی کا کونسا فلسفہ قابل عمل ہے؟

"اقتصادی" فلسفہ

چرخے یعنی گاندھی کے اقتصادی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے بیورلے نکولس لکھتے ہیں کہ ایسی باتیں کسی اور ملک

میں کوئی کرتا تو ایسے بندے کو مدبر کے بجائے ایک نچلے درجے کا مسخرہ ہی شمار کیا جاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ان کی اقتصادی پالیسی (اگر اس کے لیے یہ شاندار اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے) ہی کو لے لیجیے۔ وہ چرخے سے شروع ہو کر چرخے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا سارا وجود چرخے پر ہی ہے، جس کو انھوں نے اپنے "عدم تشدد" کے تصور کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے۔ اگر کسان اپنے گھروں میں اپنے لیے خود کپڑا تیار کرنے لگیں، اور ہندو زمینداروں کی ناقابل برداشت زیادتیوں کا مقابلہ "عدم تشدد" سے کرتے رہیں گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہندوستان کی ساری معاشی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور ہندوستان خود بخود آزاد ہو جائے گا۔"

اگر ہندوستان کے سوا، کسی دوسرے ملک میں کوئی شخص اس طرح کے ناقابل عمل خیالات کا پرچار کرتا، تو اس کو مدبر یا ماہر اقتصادیات نہیں بلکہ نچلے درجے کا ایک مسخرا شمار کیا جاتا۔ چرخے کے بارے میں ان کا نظریہ اتنا ہی ناقابل عمل ہے، جتنا یہ کہنا کہ اگر امریکہ میں ہر عورت، اپنے شوہر کی جرابیں بننے لگے تو وہاں بے روزگاری کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

چرخے کے "فوائد" پر بات کرتے ہوئے بیورلے نکولس لکھتے ہیں کہ:

"چرخے کا ایک بہت چھوٹا سا فائدہ یہ ضرور ہے کہ یہ لنکا شائر کی سوتی کپڑے کی صنعت پر ایک حملہ ہے۔ لیکن اس سے بڑے صنعت کاروں کے لیے کسی قسم کا سنگین خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اس امر سے ظاہر ہے کہ گاندھی کے زبردست حامیوں میں ہندو کارخانہ دار اور سٹیل ملوں کے کروڑ پتی مالک بھی شامل ہیں، جن کا منافع زیادہ مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی پر منحصر ہے۔ وہ لوگ گاندھی کے پروپیگنڈے سے بہت خوش ہیں جس کا مقصد انگریزوں سے نفرت کے علاوہ ہندوستان کے غریب کسانوں کو یہ باور کرانا ہے، کہ وہ جس حال میں ہیں بہت اچھے ہیں۔ انھیں بہتر تنخواہ کے لیے ہڑتال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی انھیں اپنے استحصال کے بارے میں حقیقی واقعات کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔ ہندو سرمایہ پرستی کے شوریدہ سر ترجمانوں کے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ ان کے پاس جہالت اور توہم پرستی کے شکار ملازموں کا جو انبوہ کثیر ہے، وہ عدم تشدد کا حامی ہے اور اپنی تمام تکلیفوں کا ذمہ دار انگریزوں کو قرار دیتا ہے۔ ایک فاشسٹ سے حکمران کے لیے یہ صورت حال جنت سے کم نہیں لیکن ہندوستانی عوام کے لیے گاندھی ازم بڑے پیمانے پر خودکشی کے مترادف ہے۔" (18)

عدم تعاون کے دوران جب گاندھی نے شدت سے اپنی ان نظریات پر عمل کرنا شروع کیا تو اندولال یا جنک، جو اس وقت گاندھی کے قریب رہے تھے اس لیے اپنی کتاب میں گاندھی کے اس "اقتصادی پالیسی" پر تفصیلی روشنی ڈالتے نظر آئے۔

> "ایک دفعہ سودیشی تحریک کے راستے پر گامزن ہونے کے بعد گاندھی جی کو اس معاملے کی گہرائی تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ اب انھیں اس کا وقت اور موقع ملا کہ اس سوال کے حل کرنے کے لیے جسے وہ ہندوستان کا اہم ترین اقتصادی جزو سمجھتے تھے، اپنے دماغ کو یکسو کریں۔ اب کی دفعہ ہمیشہ سے زیادہ شدومد کے ساتھ کہنے لگے کہ ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے لنکاشائر کے سامانوں کا خریدنا جس وقت بھی بند کر دیا اس وقت ہندوستان میں برطانوی قوت کو نابود سمجھو۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ برطانیہ نے لنکاشائر کے سامانوں کے لیے ایک مناسب بازار پیدا کرنے کی غرض سے ہندوستان میں سیاسی غلبہ حاصل کیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان مالوں کا خریدنا بند کر دینا ہے جنھوں نے ہماری پھلتی پھولتی کاتنے اور بننے کی صنعتوں کو برباد کر دیا ہے تاکہ اس عمل سے ہم برطانوی دکانداروں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کے ارادوں سے محروم کر دیں۔"(19)

آگے اندولال اپنا تجربہ بیان کرنے کے بعد گاندھی کی اس دلیل کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "ہم لوگوں نے بھی احمد آباد میں ایک شاخ کھولی اور شاید میں تمام سیاسی کارکنوں میں پہلا شخص تھا جس نے 1919ء کی خزاں میں بننا سیکھ لیا۔ یہ بہت مشکل اور تھکا دینے والا کام تھا پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس کام میں مہارت نہ حاصل کی تو بدعقیدگی کا مجرم ٹھہروں گا۔ یہ محتاج بیان نہیں کہ زیادہ تر سوت جو اس وقت کاتا جاتا تھا کوئی چیز بننے کے لیے بالکل بیکار ہوتا تھا اور نہ کمزور تاگے کو سنبھالنے کے لیے جیسا کہ اس وقت کاتا جاتا تھا کافی بننے والے دستیاب ہوتے تھے لہذا زیادہ تر دھاگہ جو چرخے پر کاتا جاتا ضائع ہو جایا کرتا۔"(20)

آگے لکھتے ہیں کہ:

> "اتنے سال سے گاندھی جی وقت بے وقت برابر یہی شور مچاتے رہے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے کپڑے لینا بند کر دے گا تو برطانیہ کے پاس ہندوستان میں ٹھہرے رہنے کی کوئی وجہ نہ باقی رہ جائے گی۔ ملکی کپڑوں کی درآمد سے جو ساٹھ کروڑ روپے کا نقصان ہندوستان کو

ہوتا ہے اس کا انھوں نے بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ تجارت میں برطانیہ کا حصہ تیس کروڑ ہے تو کیا یہ سمجھنا حماقت نہیں کہ انتفاع کے اس ایک کروڑ کو بند کر دیا جائے تو برطانوی ملوکیت کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہ رہ جائے گی۔

یہ بات تعجب انگیز ہے کہ اتنے سالوں میں کسی نے اس عامیانہ تک بندی پر کوئی تعرض نہیں کیا اور اگر لاکھوں کروڑوں نہیں تو ہزاروں ایماندار اور مخلص کارکن اس مغالطے میں کیسے مبتلا رہے کہ ہندوستان میں برطانیہ کے کپڑے کی تجارت برباد ہوتے ہی برطانوی اقتدار کا بھی یقیناً خاتمہ ہو جائے گا۔

اس شان دار مصنوعی دلیل کا کھوکھلا پن سمجھنے کے لیے بس اتنا جان لینے کی ضرورت ہے کہ برطانیہ ہر سال ہندوستان سے کئی کروڑ کی تجارت کرتا ہے اور اس کا سرمایہ جو ہندوستان میں لگا ہوا ہے فقط اُس کے سود ہی سے سالانہ پندرہ کروڑ پاونڈ وصول ہوتے ہیں۔ گاندھی جی داخلی تخیل پسندی کی رو میں بہنے اور خارجی بصیرت سے محروم ہونے کے باعث برطانوی اقتدار کے اصل مفہوم و منشا کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ برطانوی حکومت ہندوستان میں ایک لاکھ انگریزوں یا ساٹھ ہزار سپاہیوں کی حکمرانی سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حقیقی مفہوم ہندوستان کی کثیر خام پیداوار اور ہندوستان کے لاکھوں سستے مزدوروں پر برطانیہ اور اس کے مستعمرات کے وسیع سرمائے کا اقتدار ہے۔ یہ بات بالکل روشن ہے کہ جب تک ملک پر برطانوی سرمایہ داری کا سیاسی پامالی اقتدار قائم ہے یہ ہندوستانی ذرائع اور سستی مزدوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی سینکڑوں نئی ترکیبیں نکالے گا۔

اگر برطانوی کپڑے کے مقاطعے پر پوری طرح عمل کیا جاتا تو بلاشبہ اس سے مانچسٹر کے کچھ مالکان مل کو دھکا پہنچتا اور چند ہزار انگریز بے کار ہو جاتے لیکن اس سے اہل برطانیہ کو ہندوستان سے بستر بند ھوا دینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو سکتی تھی۔ بخلاف اس کے جب برطانوی سرمایہ داروں کو جن کے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ یہ گمان ہو جاتا کہ اُن کے کپڑے کے سامان کے لیے ہندوستان میں کوئی گنجائش نہیں ہے تو وہ ہندوستان کے آدمیوں کی تعداد اور ذرائع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے نئے طریقے نکال لیتے۔"

کیونکہ اس وقت گاندھی نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چلو میں ایک سال میں سواراج (آزادی) لیکر دونگا۔ اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے اندولال لکھتا ہے کہ "اس لیے یہ امر

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ برطانوی کپڑے یا غیر ملکی کپڑے کے مقاطعے سے ایک سال کیا ایک سو سال میں بھی سوراج حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔"(21)

گاندھی جی نے اپنی اس "اقتصادی پالیسی" کے اہم جز چرخے کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے مذہبی دلائل کا بھی سہارا لیا اندولال کے مطابق اُن کے ہندو اور مسلم پیروکاروں کو بہت مسرت و تعجب ہوا جب انھوں نے قرآن اور گیتا دونوں سے چرخے کی نشان دہی کی۔

عدم تعاون کے دوران طالبعلموں کو تعلیمی اداروں سے تو نکلنے پر اکسایا ہی تھا ساتھ ہی انھیں چرخے پر بھی لگا دیا۔ اندولال کے مطابق:

"گاندھی جی نے کسی گانگرس کمیٹی یا رہنما سے دریافت کے بغیر حسب ذیل آمرانہ الفاظ میں (ینگ انڈیا 19 جنوری 1921ء) قومی اداروں کے لیے نئے پروگرام کا اعلان کر کے ساری گانگرس دنیا پر ایک اچھا خاصا بم کا گولہ پھینک دیا۔

"ہم ایک روحانی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہم معمولی زمانے میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں۔ معمولی سرگرمیاں ہمیشہ غیر معمولی زمانوں میں رک جاتی ہیں۔ اگر ہم ایک سال میں سوراج حاصل کرنے کے درپے ہیں تو ہمیں اور تمام اُمور سے قطع نظر کر کے اپنی تمام توجہات کو اپنے نصب العین پر مرکوز رکھنا چاہیے۔ اس لیے میں ہندوستان بھر کے طلبا کو (جو قومی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں) یہ مشورہ دینے کی جرات کرتا ہوں کہ وہ ایک سال کے لیے اپنی معمولی تعلیم کو موقوف کر کے اپنا وقت ہاتھ سے کاتا ہوا سوت تیار کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ یہ مادرِ وطن کی سب سے بڑی خدمت ہو گی اور حصولِ سوراج کی راہ میں سب سے زیادہ فطری امداد ہو گی۔"

19 جنوری 1921ء کو بنگال کے طالبعلموں سے کہا:

"میں تمہاری معطل شدہ تعلیم کی جگہ تم پر زور دوں گا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تم اس پورے سال میں نہات خاموشی کے ساتھ جلد از جلد سوراج حاصل کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کرو۔ میں چرخے کا ہدیہ پیش کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ ہندوستان کی اقتصادی نجات کا دارومدار اسی پر ہے لیکن اگر تم چاہو تو میری اس تجویز کو مسترد کر سکتے ہو اور اس کالج میں جا سکتے ہو جس کا مسٹر داس نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ نیشنل کالج گجرات کے بیشتر طلبہ نے کم از کم چار گھنٹے یومیہ چرخہ کاتنے کی ذمہ داری لی ہے۔"(22)

گاندھی کے احکامات پر عمل درآمد کرتے ہوئے بنائے گئے نیشنل کالج گجرات کے بارے میں اندولال لکھتے

ہیں کہ:

> "مسٹر گدوانی سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنے ادارے کو از سر نو اس طرح منظم کریں کہ کتابی تعلیم سے زیادہ چرخہ کاتنے کے لیے وقت ملے۔ یہ محب وطن پرنسپل صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ بعض اوقات یہ ایک بجے رات کو کالج سے روانہ ہو جاتے تاکہ صبح کی عبادت سے پہلے دو بجے گاندھی جی سے ملاقات کر سکیں۔ مہاتما گاندھی کی گفتگو سے انھیں جو فیضان حاصل ہوا اس سے متاثر ہو کر انھیں خود یونیورسٹی کے احاطے میں سوراج آشرم کے نام سے ایک انوکھے قسم کے ادارے کے قیام کی سوجھی۔ کالج کے طلباء سے سرسری طور پر دریافت کیا گیا کہ آیا وہ دیہاتوں میں فوراً کام کرنے کی غرض سے اپنے کو چرخا کاتنے کے لیے بالکل وقف کرنے اور کچھ ابتدائی سیاسی درس لینے کی خاطر اس نئے آشرم میں شریک ہونا چاہتے ہیں یا کالج میں رہ کر اصل تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں چرخا کاتنے کا کافی کام شامل کر دیا گیا ہے۔ گدوانی کے جاذبانہ جوش کا بھلا ہو کہ اس وقت بہت سے طلبا نے نئے آشرم میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا جو فوراً سیاسی کارکنوں کی تربیت گاہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح ذہانت، جذبات اور تخیل کی پرورش کرنے کے بجائے چرخے پر طلبا کے اوقات ضائع کرنے سے قومی تعلیم کا آئیڈیل محض ایک تمسخر و تماشا بن کر رہ گیا۔"

نئی سکیم کے تحت پرائمری سکولوں کی حالتِ زار پر اندولال اس طرح روشنی ڈالتے ہیں "اس میں کچھ ٹوٹے پھوٹے چرخے رکھ دیے گئے تھے، وہ بھی ایسے کہ کسی کے کل پرزے الگ، کسی میں ایک حصہ ہے تو دوسرا نہیں، دوسرا ہے تو تیسرا نہیں۔ غرضیکہ محض بے کار جن سے کتائی کا کام بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ سوت کے پلندے (جن میں اکثر مل کے بنے ہوئے تھے) کچھ پونیاں جن میں اُلجھے ہوئے تاگے ہوتے تھے جو کرگوں پر لگائے بھی نہ جا سکتے تھے۔ غرض کہ یہ کل کائنات تھی جن سے ان اسکولوں کی تزئین کی گئی تھی۔"

اس بحث کو حتمی شکل دیتے ہوئے اندولال لکھتے ہیں کہ:

> "یہ بھی صحیح ہے کہ یہ پروگرام ایک جانب برطانوی تاجروں پر وار کرنے کی غرض سے بطور سیاسی حربہ کے وضع کیا گیا اور دوسری جانب چرخے کی سرگرمی بڑھانے کی نیت سے اختیار کیا گیا تھا۔ مگر فی الحقیقت اس سے ہندوستان کے مالکان کارخانہ جات کو بہت مدد ملی جو اپنی قیمتوں کو آسانی سے بڑھا سکتے تھے اور اپنا حد سے زیادہ جمع کیا ہوا مال غیر معمولی طور سے کم وقت میں فروخت کر سکتے تھے پہلے پہل مالکان مل کو گاندھی جی کے چرخے پر مسلسل

زور دینے سے تعجب اور صدمہ ہوا مگر جلدی ہی انھوں نے بھانپ لیا کہ گاندھی جی ان کے بڑے گہرے دوست اور پکے ساتھی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے گانگرس کے پروگرام سے کبھی کامل اتفاق ظاہر نہیں کیا مگر گاندھی جی نے اُن کے مفاد کو بالواسطہ ترقی دینے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ چونکہ 1919ء سے گاندھی جی نے کارخانوں کے مزدوروں کی کسی جدوجہد میں جو انھوں نے اپنے ہندوستانی مالکوں کے خلاف شروع کی قیادت نہیں فرمائی اس لیے انھیں بجا طور پر سرمایہ داروں کے طبقے کا میر میدان کہا جاسکتا ہے۔"(24)

چرخے سے باپو کی محبت کا اندازہ ٹیگور کو دیے گئے اس جواب سے بھی ہوتا ہے جب اس معاملے ٹیگور نے گاندھی کی پالیسی پر اعتراض کیا:

"گاندھی جی نے نہ صرف یہ پابندی عائد کرر کھی تھی کہ ہر رکن کانگرس کو کھدر پہننا ہو گا بلکہ انھوں نے یہ بھی لازمی قرار دے دیا کہ کہ کانگرس کی رکنیت صرف اور صرف اس شخص کو دی جائے گی جو باقاعدگی سے اپنے ہاتھ سے چرخہ کاتتا ہو۔ ٹیگور نے اس شرط پر متحیر ہو کر گاندھی جو کو لکھا کہ چرخہ کاتنا ہندوستان کے دیہاتی عوام کے لیے آج بھی نہایت دلچسپ اور مفید مشغلہ ہے لیکن شہری عوام اس سے آشنا نہیں ہیں۔ ان کے لیے یوں بھی چرخہ کاتنا وقت کا شدید زیاں ثابت ہو گا۔ ٹیگور نے گاندھی جی کی اس شرط پر حیرت کے ساتھ ساتھ گہرے احتجاج کا بھی اظہار کیا اور وہ خاص طور پر اس بات کو تو قطعاً سمجھ نہ پائے کہ چرخہ کاتنے سے نابلد فرد کو محض اس بنا پر کانگرس کی رکنیت سے کیوں محروم رکھا جائے گا ٹیگور نے اس شرط کو آمرانہ اور فکر و عمل کی آزادی کے منافی قرار دیا، گاندھی نے اس کے جواب میں نہایت سختی سے ٹیگور کو لکھا۔

"میں ہر شاعر، مفکر اور دانشور کے لیے بھی اپنے ہاتھ سے چرخہ کاتنا فرض قرار دیتا ہوں۔"(25)

یہ تو ہو گئی "روشن خیال "مہاتما کے اقتصادی فلسفے کی بات۔ لیکن افسوس آزاد ہندوستان کی لیڈر شپ رجعت پسند نکلی بجائے باپو کے چرخے پر انحصار کے، صنعتیں لگانا شروع کر دیں۔

گاندھی اور عدم تشدّد

گاندھی کا نام سن کر ذہن میں جو پہلا لفظ آتا ہے وہ ہے "عدم تشدد"۔ گویا گاندھی اور "عدم تشدد" آپس

میں لازم وملزوم ہیں لیکن اپنے اس نظریئے "عدم تشدد" کے ساتھ جو تشدد خود گاندھی نے کیا مناسب ہو گا انھیں لازم وملزوم کے بجائے "ظالم ومظلوم" کہا جائے۔

وہ عدم تشدد کے نام پر دیدہ دلیری سے تشدد کی حمایت کرتے نظر آئے، کہیں الفاظ کا ہیر پھیر چلا کر اپنے مؤقف کو جسٹی فائی کرتے رہے کہیں عدم تشدد کہیں اپنے ذہنی خبط کے مطابق 'عدم تشدّد' کی عجیب وغریب تعریف سامنے لاتے رہے۔ باٹم لائن یہی ہے کہ اپنے اس عدم تشدد پر گاندھی خود بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔

سیر وائی کے مطابق:

"گاندھی دعویٰ کرتا تھا کہ اھارس(عدم تشدد)میرے مسلک کا بنیادی حصہ ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ گاندھی نے عدم تشدد کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا کیونکہ وہ اپنے سیاسی مقصد کے حصول کے لیے تشدد کی حمایت کرنے پر آمادہ نظر آتا تھااور تشدد سے چشم پوشی بھی کرتا تھا۔"

اور ویول کے مطابق:

"The more I see of this old man, the more I regard him as an unscrupulous old hypocrite, he would shrink from no violence and blood letting to achieve his ends, though he would naturally prefer to do so by chicanery and a false show of mildness and friendship."

آیئے ذرا عدم تشدد پر ایک تفصیلی نظر ڈالتے ہیں۔ اس کی ابتدا کرتے ہیں جنگ عظیم دوم کے دوران "ہر برطانوی کے نام خط سے" جس کا پوری دنیا میں بڑا چرچا ہے کہ گاندھی کتنے بڑے سادھو تھے ہتھیاروں سے کتنی نفرت کرتے تھے قتل وغارت کے کتنے مخالف تھے۔ وہ اپنے خط میں لکھتے ہیں:

"میں ہر برطانوی سے درخواست کرتا ہوں۔۔۔۔ وہ بین الاقوامی تعلقات کو بحال کرنے کے لیے جنگ کی بجائے عدم تشدد کا راستہ اپنائیں۔

"میں آپ کو ایک شریفانہ اور جراتمندانہ راستہ پیش کرتا ہوں جو بہادر ترین سپاہیوں کے قابل ہے۔ میں آپ سے چاہوں گا کہ آپ نازی ازم کا مقابلہ اسلحے کے بغیر کریں اور اگر میں فوجی اصطلاح استعمال کروں تو آپ کو نازی ازم کے خلاف عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہیے۔

"آپ ہٹلر اور مسولینی کو دعوت دیں گے کہ وہ آپ کے ملک سے جنھیں آپ اپنی ملکیت کہتے ہیں جو چاہیں لے جائیں۔ آپ انھیں اپنے خوبصورت جزائر پر خوبصورت عمارتوں

سمیت قبضہ کرنے کی اجازت دے دیں۔ آپ انھیں اپنا سب کچھ دے دیں گے لیکن اپنی روحیں اور ذہن نہیں۔ اگر یہ حضرات آپ کے گھروں پر قبضہ کرنا چاہیں تو آپ انھیں خالی کر دیں گے۔ اگر وہ آپ کو آزادانہ گزرنے کا راستہ نہ دیں تو آپ انھیں خود کو مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دے دیں گے لیکن آپ ان کی وفاداری سے انکار کر دیں گے۔" (26)

کچھ لوگ گاندھی کی طرح گاندھی کے حق میں تاویلیں گھڑتے ہیں کہ مہاتما بحیثیت فرد عدم تشدد کے حامی تھے ریاست کے لیے نہیں۔ یہ خط پڑھ کر کیا نظر آتا ہے؟

گاندھی کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے موجمدار لکھتے ہیں کہ "اس غیر ارضی بیان پر کوئی بھی تبصرہ غیر ضروری ہے تاہم موازنے کے لیے نئے برطانوی وزیر اعظم ونسٹن چرچل کا بلند بانگ اعلان قابل ذکر ہے:

"ہم اپنے جزائر کا دفاع کریں گے۔ ہم ساحلوں پر لڑیں گے، ہم خشکی پر لڑیں گے، ہم کھیتوں میں اور گلیوں میں لڑیں گے، ہم پہاڑوں پر لڑیں گے، ہم کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔"

چرچل کی "ہتھیار نہیں ڈالیں گے" تقریر نے برطانوی عوام کے دلوں میں مزاحمت کا ایک ناقابل تسخیر جذبہ جگا دیا اور انھوں نے جرمنی کی جارحیت کی تندرو موج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر ہٹلر اور نازی ازم کو تباہ کر دیا۔

یہ اور بات ہے اسی جنگ کے شروع ہونے پر یہ برطانویوں کے حق میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے سامنے قرارداد لانے کی سر توڑ کوشش کرتے رہے اس کی تفصیل بھی آگے آئے گی۔ مہاتما کے یہ خطوط اور بیانات خاص کر یاد کرنے کی ضرورت ہے، برطانوی خط کے بعد وہ کانگرس کو کیا مشورہ دیتے ہیں؟

جب گاندھی سے سوال کیا گیا کہ اگر طاقت کو ختم کر دیا جائے اور عدم تشدد کو اپنا لیا جائے تو ریاست امن و امان اور جارحیت کے مسئلے سے کیسے نمٹے گی؟ ان کا جواب تھا۔

"اگر کانگرس طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کر سکتی تو اسے اس وقت تک اقتدار طلب نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ یہ عوام پر غیر متشددانہ کنٹرول حاصل نہیں کر لیتی۔ (غیر ملکی جارحیت کی صورت میں) یہ ہتھیاروں کو رد کرنے کی طرف عوام کی رہنمائی کرے گی تاکہ (اس ذریعے سے) غیر ملکی حملے کا مقابلہ کیا جا سکے اور غیر متشدد انسانوں کا ایسا دستہ تیار کرے گی جو جارح کے خلاف زندہ دیوار بن جائیں گے"(27)

گاندھی کے اس بھاشن کو ان فقروں کے ساتھ ملا کر پڑھیں جو اس نے پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے باچا

خان اور اس کے بیٹے غنی خان کے سامنے کہے:

"Mahatmaji, you have thrown us to the wolves"bitterly complained to Gandhiji after the Working committee's decision. With an aching heart, Gandhiji replied "he was sure that if the Frontier Province were not given a square deal or if the Khudai Khidmatgars were oppressed, India would feel in honour bound to come to their aid, and he for one would not hesitate to advise Indian Government to treat it as casus belli.

Gandhiji had latter repeated that statement to my son. When Ghani asked him what would happen to his non-violence in that event, Gandhiji had told him not to worry about his non-violence. "I am non-voilent, the Government is not."

"مہاتما جی آپ نے ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے۔" ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے بعد میں نے گاندھی جی سے سخت شکایت کی۔ دکھی دل کے ساتھ گاندھی جی نے جواب دیا، انھیں یقین ہے کہ اگر صوبہ سرحد کے ساتھ حسن سلوک نہ کیا گیا یا خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا گیا تو ہندوستان ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھے گا۔ اور میں ہندوستانی حکومت کو یہ مشورہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ وہ جنگ سمجھ کر اس سے عہدہ برآ ہو۔

بعد ازاں گاندھی جی کہ یہ بیان میرے بیٹے غنی کے سامنے دہرا دیا۔ جب غنی نے ان سے پوچھا، ان کے عدم تشدد کا کیا بنے گا، گاندھی جی نے اسے جواب دیا کہ میرے عدم تشدد سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں غیر متشدد ہوں، حکومت نہیں۔"(28)

کم از کم ان باتوں سے تو ہم پاکستانیوں کو یقین کر ہی لینا چاہیے کہ گاندھی پاکستان سے کتنی "محبت" کرتے تھے اور انھوں نے پاکستان کے لیے ہی جان دی تھی۔

مہاتما اپنی عدم تشدد کے متعلق مزید فرماتے ہیں:

"اگر افغان آتے ہیں تو ہمیں ان کے سامنے مر جانا چاہیے۔ حتی کہ اگر آج میرے پاس پورا ہندوستان بھی ہوتا تو میں یہی کرتا۔ میں فوج نہیں چاہتا۔ بالکل اسی طرح ڈاکوؤں کے

متعلق بھی میر ایہی خیال ہے۔ یہ ہوگی وہ ریاست جس کا کانگرس اقتدار سنبھالے گی وہ محسو
س کرتے تھے کہ وقت آگیا کہ عدم تشدد خود کو مستحکم کرے۔"(29)

جنگ عظیم اول میں عدم تشدد کے مہاتما کا کردار جو فوج نہیں چاہتا جو تب تک کانگرس کے لیے اقتدار بھی نہیں چاہتا جب تک کانگرس عدم تشدد کے ذریعے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں ہوتی جو اتحادیوں کو خط لکھ کر دنیا بھر میں اپنی واہ واہ کراتے ہیں کہ وہ نازیوں کے ساتھ ہتھیاروں سے نہیں عدم تشدد کے ساتھ لڑیں۔

1918ء میں وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے گاندھی جی وار کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ عدم تشدد کے عظیم دیوتا نہ صرف بڑے ذوق شوق سے وار کانفرنس میں شرکت کرتے ہیں بلکہ فوجی بھرتی کی مہم میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یعنی خود گھوم پھر کر لڑنے کے لیے بندے بھرتی کراتے رہے۔ موجمدار کے مطابق مہاتما کی اس حرکت سے ان کے مداحین کو بڑا شدید دھچکا لگا اور انھوں نے گاندھی کو اس سے منع کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن مہاتما باز نہیں آئے۔ اس نے فوج میں بھرتی کے لیے پمفلٹ بھی شائع کرائے۔ مثلاً ایک پمفلٹ میں وہ لکھتے ہیں:

"The easiest and straightest way, therefore, to win swaraj is to participate in the defence of the empire. If the empire perishes, with it perish our cherished aspirations"

"سوراج حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ایمپائر کے دفاع کو مضبوط بنانا ہے کیونکہ اگر ایمپائر ختم ہوگئی تو ہماری اُمیدوں اور تمناؤں کا محور بھی ختم ہو جائے گا۔"(30)

ایک اور پمفلٹ میں وہ لکھتے ہیں:

"Among the many misdeeds of the British rule in India, history will look upon the act depriving a whole nation of arms as the blackest. If we want the Arms Act to be repealed, if we want to learn the use of arms, here is a golden opportunity"

"سرکار برطانیہ کے کالے قوانین میں سے ایک آرمز ایکٹ بھی ہے جس کے تحت ہندوستانیوں کو آتشیں اسلحہ رکھنے کی ممانعت ہے لیکن اگر ہم اس آرمز ایکٹ کا خاتمہ اور اسلحہ رکھنے کی آزادی چاہتے ہیں تو یہ اس کے لیے سنہری موقع ہے۔"(31)

گاندھی نے کانگرس کے اعتدال پسند ترین رکن سریندرناتھ بینرجی کو لکھا:

"میرے بعض نہایت راسخ نظریات سے بہت سے ہمعصر رہنما متفق نہیں ہیں لیکن میرا آج بھی پختہ یقین ہے کہ اگر ہم اپنی تمام توجہ فوجی بھرتی پر مرکوز کردیں تو ہمیں مکمل آزادی ایک برس سے بھی کم عرصے میں میسر آسکتی ہے۔"(32)

بعد میں اس نے گجرات کے تمام دیہات کا دورہ کیا اور ہر گاؤں سے 20 جوان ایمپائر کی خاطر قربان ہونے کے لیے طلب کیے۔ انھوں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا:

"اگر میں اپنے ہم وطنوں کو اپنے اقدامات واپس لینے کے لیے قائل کرسکوں تو یقیناً میں گانگرس کی تمام قراردادیں بھی منسوخ کرادوں اور انھیں کہوں کہ جنگ کے دوران خود مختار حکومت کا نام بھی نہ لیں' میں اس کڑے وقت میں ہندوستان کے ہر فرزند کو ایمپائر کے لیے کٹ مرنے پر راضی کرنا چاہتا ہوں۔"(33)

ساتھ ساتھ مہاتما جی بھرتی کے غیر مشروط ہونے پر بھی زور دیتے رہے۔ اس نے اپنے اس جنون میں تلک کی توہین سے بھی گریز نہیں کیا۔

تلک نے انھیں پچاس ہزار روپے کا چیک بھیجا اور کہا کہ وہ اس صورت میں مہاراشٹر سے 5 ہزار رضاکار بھیجنے پر تیار ہیں کہ گاندھی جی وائسرائے سے وعدہ لیں کہ بعد ازاں انھی رضاکاروں کو فوج میں کمیشنڈ رینک دیا جائے گا۔ گاندھی جی نے نہ صرف تلک کا چیک مسترد کر دیا بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ رضاکاروں کی بھرتی کے ضمن میں وائسرائے سے کوئی "سودے بازی" نہیں کریں گے۔

وار کانفرنس کے بعد گاندھی نے ایک طویل خط وائسرائے کے نام لکھا۔ موجمدار اپنی کتاب میں اس کا یہ اقتباس بیان کرتے ہیں اور اندولال یاجنک نے بھی اس کا حوالہ دیا:

"میرا پختہ یقین ہے کہ ہمیں ہر موزوں فرد کو ایمپائر کی خدمت اور حفاظت کے لیے پیش کرنا چاہیئے لیکن میں مالی امداد کے متعلق اس قدر پر امید نہیں ہوں۔ مالی ذرائع سے ملنے والی اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان پہلے ہی شاہی خزانے کو اپنی بساط سے بڑھ کر پر کر چکا ہے"(خود نوشت صفحہ 548)

موجمدار کے مطابق گاندھی جی ہر شہری کو توبلا تخصیص توپ کے دھانے میں جھونکنے کو تیار تھے اور اس سلسلے میں ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ یا دباؤ نہ تھا لیکن پیسے دھیلے کے معاملے میں وہ حد سے زیادہ محتاط اور کنجوس تھے۔

گاندھی کی ان کوششوں پر اندولال یاجنک لکھتے ہیں کہ جب سارا ہندوستان سیاسی بے چینی کی کھولن میں مبتلا تھا گاندھی جی لڑائی کے لیے رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم شروع کر رہے تھے۔

رنگروٹ مہم کے دوران اندولال، مہاتما کے نائب تھے وہ لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ میں نے پہلے سے انڈیا ڈیفنس فورس میں شامل ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس لیے مجھے گاندھی جی کی صدا پر لبیک کہنے میں کوئی دشواری نہ معلوم ہوئی۔ اس زمانے میں مسٹر ولبھ بھائی پٹیل بعض خانگی ضرورتوں سے احمد آباد میں تھے۔ اس رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم میں گاندھی جی نے مجھے اپنا پہلا نائب مقرر کیا۔ مقامی کارکنوں کے دلوں میں بھی میں نے رنگروٹ بھرتی کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا اس طرح رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم میں ایک گونہ کامیابی سی نظر آنے لگی۔

گاندھی جی نے باشندگان ضلع کو اپنی کمپنی میں بھرتی ہونے کی دعوت دیتے ہوئے ایک بہت موثر تقریر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی بدنظمیوں اور خرابیوں میں ان کا کارنامہ سیاہ ترین ہے کہ اس نے ایک پوری قوم کو اسلحے سے محروم کر دیا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ قانون اسلحہ کی تنسیخ کی جائے اور ہم ہتھیاروں کے استعمال سے واقف ہو جائیں تو ہمارے لیے یہ ایک زرّیں موقع ہے۔ اگر درمیانی طبقے کے لوگوں نے اس آڑے وقت حکومت کی مدد کی تو حکومت کی بے اعتمادی دور ہو جائے گی اور ہتھیاروں کے رکھنے پر جو پابندی ہے اُٹھالی جائے گی۔"

جب لوگوں نے انھیں یاد دلایا کہ آپ تو عدم تشدد کے علم بردار ہیں تو اندولال مہاتما کی چال باز فطرت پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

"آپ تو عدم تشدد کے علم بردار ہیں، بھلا آپ ہمیں ہتھیار اُٹھانے کی تلقین کیوں کر کر سکتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ان سے کیے جانے لگے۔ گاندھی جی منطقی داؤ پیچ کے بڑے استاد ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں عدم تشدد کے عقیدہ کا سختی سے حامی ہوں اور میں کسی حال میں ہتھیار اُٹھانے کے لیے تیار نہ ہوں گا خواہ مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہی کیوں نہ ہو رہی ہو لیکن دوسرے لوگ اپنی بزدلی اور کمزوری کی بنا پر عدم تشدد کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے فرائض سے جان چرانے کے لیے عدم تشدد کے مقدس اُصول کو بہانہ نہ بنانا چاہیے۔"

اسی جنگِ عظیم کے دوران گاندھی نے جناح صاحب کو بھرتیوں کے لیے مندرجہ ذیل خط بھی لکھا:

"Can you not see that if every Home Rule Leagur became a potent recruiting agency whilst at the same time fighting for constitutional

rights we should ensure the passing of the Congress- League scheme? ..." Seek ye first the recruiting office and every thing will be added unto you."

"کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ہوم رول لیگ کا ہر رکن ریکروٹنگ ایجنسی بن جائے اور ساتھ ساتھ آئینی حقوق کی جنگ لڑتا رہے تو کانگرس لیگ سکیم منظور ہو سکتی ہے۔ اگر ایک بار ریکروٹنگ آفس مل جائے تو پھر تمھیں ہر چیز مل جائے گی۔"(34)

اب یہ سب دیکھ کر پڑھ کر کیا گاندھی کی شخصیت کے بارے میں "منافق" سے بہتر کوئی لفظ تجویز کیا جا سکتا ہے؟

نمک ٹیکس لگنے پر مہاتما نے نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔ ستیہ گرہ شروع کرنے سے پہلے مہاتما نے وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ یہ خط 2 مارچ 1930ء کو لکھا گیا۔ اس میں اپنے عدم تشدد والے فلسفے کے ساتھ ایک بار پھر کھلواڑ کرتے نظر آئے۔

"And why do I regard the British rule as a curse? "It has impoverished the dumb millions by a system of progressive exploitation and by a ruinously expensive military and civil administration which the country can never afford."It has reduced us politically to serfdom. It has sapped the foundations of our culture. And, by the policy of cruel disarmament, it has degraded us spiritually."

"میں انگریز راج کو لعنت کیوں قرار دیتا ہوں؟ اس نے کروڑوں ناسمجھ انسانوں کے روز افزوں استحصال سے مفلسی کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔ اس نے سیاسی اعتبار سے ہمیں غلاموں سے بدتر بنا دیا ہے۔ اس نے ہمارے کلچر کی جڑیں تک چوس لی ہیں۔ اسلحے سے محروم کر کے انگریز راج نے ہمیں روحانی طور پر بھی کمزور کر دیا ہے"(35)

"راہِ سلوک" کے یہ عظیم مسافر تو چونکہ سورگباش ہو چکے اس لیے ان سے پوچھنا تو ممکن نہیں ہو سکتا ہے ان کے مداح اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کریں کہ اسلحے کے زور پر عدم تشدد والے مہاتما ہندوستانیوں کو کس قسم کی روحانی ترقی دلوانا چاہتے تھے؟

تحریکِ خلافت اور عدم تعاون کا تذکرہ پہلے ہی آچکا کہ گاندھی اس وقت کیا کرتے رہے اندولال یاجنک لکھتے

ہیں تحریک خلاف کے دوران:

"سیاسی حلقے گاندھی جی کے پُر تشدد لہجے اور انداز پر حیران بلکہ پریشان تھے کیونکہ اسلام کی محبت اور حمایت میں گاندھی جی انتہاپسند ترین مسلمانوں پر بھی سبقت لے گئے تھے۔"

"Pakistan Or Partition Of India" میں ڈاکٹر امبیڈکر خلافت مومنٹ کے دوران ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جب ان کی توجہ جہاد کی آیتوں کی طرف دلائی جو مولانا اس موقعے پر تلاوت کر رہے تھے تو مہاتما مسکرا کر فرمانے لگے کہ ان کا اشارہ انگریز بیوروکریسی کی طرف ہے یعنی اگر تشدد کی زد میں انگریز بیوروکریسی آئے تو مہاتما کے خیال میں جائز ہے۔

"There was another prominent fact to which I drew the attention of Mahatma Gandhi. Both of us went together one night to the Khilafat Conference at Nagpur. The Ayats (verses) of the Quran recited by the Maulanas on that occasion, contained frequent references to Jihad and against, killing of the Kaffirs.

But when I drew his attention to this phase of the Khilafat movement, Mahtma smiled and said "They are alluding to the British Bureaucracy." In reply I said that it was all subversive of the idea of non-violence and when the reversion of feeling came the Mohammdan Maulanas would not refrain from using these verses against the Hindu."

"ایک اور اہم نکتے کی جانب میں نے گاندھی جی کی توجہ مبذول کروائی۔ ایک رات کو ہم ناگپور میں اکٹھے تھے جہاں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مولاؤں نے اس موقعے پر قرآن کی ایسی متعدد آیات کا حوالہ دیا جن میں جہاد کا ذکر بکثرت موجود تھا۔ جب میں نے گاندھی جی کی توجہ تحریک خلافت کے اس پہلو کی جانب دلائی تو مہاتما مسکرائے اور کہا ان کا (مسلمانوں کا) تو انگریز بیوروکریسی کی جانب ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جہاد کا یہ تصور تو آپ کے فلسفہ عدم تشدد کے عین مخالف ہے اور بعض حالات میں یہی مسلمان علما انھی قرآنی آیات کا سہارا ہندوؤں کے خلاف بھی لے سکتے ہیں۔"(36)

لیکن باپو اپنے لچکدار فلسفہ عدم تشدد میں پہلے ہی لچک لا چکے تھے۔

ٹنڈولکر مہاتما جلد اوّل کے صفحہ نمبر 424 میں لکھتے ہیں کہ:

"But Muslims have special Koranic obligations in which Hindus may or may not join. They, therefore, reserve to themselves the right, in the event of the failure of non-co-operation cum non-violence, in order to enforce justice, to resort to all such methods as may be enjoined by the Islamic scriptures. I venture heartily to associate myself with this resolution."

"مسلمانوں پر قرآن نے کچھ ایسے ذمہ داریاں عائد کی ہیں جن میں ہندو شمولیت اختیار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے پاس یہ حق محفوظ ہے کہ وہ عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک کی ناکامی کی صورت میں اسلامی فقہ کے رو سے اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔ حصول انصاف کے لیے ان پر ہر طریقے کا دروازہ کھلا ہے۔ میں دل و جان سے اس قرارداد کی حمایت کا اعلان کرتا ہوں"۔(37)

سیر وائی اپنی کتاب میں بھی ایسے بہت سارے حوالے پیش کر چکے مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

انتقال اقتدار کے حوالے سے ایک نوٹ آیا جو میجر واٹ نے 13 اپریل 1946ء کو تیار کیا تھا جو اُن کی گاندھی سے گفتگو پر مشتمل تھا:

"وہ (گاندھی) سمجھتا ہے کہ ہندوستان کے مسائل کے حل کے لیے خون بہانا پڑے گا۔ وہ کانگرس پر عدم تشدد کے لیے زور دے گا لیکن اُسے توقع نہیں کہ وہ اس پر عمل کریں۔ خانہ جنگی کی صورت میں وہ توقع کرتا ہے کہ کانگرس اچھی طرح لڑے گی اور ایک دانت کے بدلے ایک دانت لے گی اور برطانیہ کی مانند ایک دانت کے بدلے سو دانت نہیں لے گی۔"(38)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے پیروکاروں کی مہاتما نے کم از کم اتنی تربیت ضرور کی اور مہاتما کو اس حوالے سے یقین بھی تھا کہ وہ دورانِ تشدد دوسری دانت توڑنے سے پہلے مہاتما کے اس فرمان کو یاد کر کے مزید تشدد کرنے سے رک جائیں گے کہ ہمیں مہاتما کی طرف سے صرف ایک دانت توڑنے کی اجازت ہے۔

والپرٹ "جناح آف پاکستان" میں مہاتما کی 1942ء امریکی صحافیوں سے گفتگو نقل کرتے ہیں جس میں مہاتما "خالص عدم تشدد" کے حصول کے لیے ایک اور "پھکی" تجویز کرتے ہیں کہ دونوں فریق پہلے کتوں کی طرح ایک دوسرا سے لڑیں پھر اس کے بعد مہاتما کے اخذ کردہ نتیجے کے مطابق "خالص عدم تشدد" ابھر کر سامنے آئے گا۔

"Two American Journalists interviewed Gandhi that week in Wardha, and one asked , but what does a free India mean, if as Mr Jinnah said , Muslims will not accept Hindu rule?

The Mahatma replied: 'I have not asked the British to hand over to the Congress or to the Hindus.let them entrust India to God or in modern Parlance to anarchy. Then all parties will fight one another like dogs,or will, when real responsibility faces them, come to a reasonable agreement. I will expect non violence to arise out of that chaos'."

"اپریل 1942ء دو امریکی صحافیوں نے اس ہفتے واردھا میں مہاتما گاندھی کا انٹرویو کیا تھا ایک جرنلسٹ نے سوال کیا تھا۔ " لیکن ایک آزاد ہندوستان کے معنی کیا ہوں گے ؟ جب، جیسا کہ مسٹر جناح کہتے ہیں مسلمان ہندو حاکمیت کو منظور نہیں کریں گے۔"
مہاتما نے جواب دیا: "میں نے برٹش حکومت سے ہندوستان کو کانگرس کے ہاتھوں سونپ دینے کو نہیں کہا ہے وہ اسے بھگوان کے حوالے کر دیں یا آج کی زبان میں انارکی کے حوالے۔ تب سبھی پارٹیاں ایک دوسرے سے کتوں کی طرح لڑیں گی جب انھیں اصل ذمہ داری کا احساس ہو گا تب وہ معقول تصفیہ پر پہنچیں گی، مجھے امید ہے ایسی افراتفری کے درمیان عدم تشدد سامنے آئے گا۔" (39)

عدم تشدد کے نام پر تشدد بھڑکانے کا عمل

بیورلے نکولس نے لکھا کہ گاندھی کا عدم تشدد ایک ایسا اصول ہے جس پر عمل کرنے کا نتیجہ لازمی طور پر ہمیشہ اتنے بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، جن کی پہلے مثال نہیں ملتی۔ مزید وہ لکھتے ہیں کہ گاندھی یہ بات اچھی طرح جانتا بھی ہے۔ اب یہاں کچھ واقعات دیکھتے ہیں جہاں عام لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر عدم تشدد کے نام پر ان سے تشدد کرایا گیا

جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہوا تو موجدار کے مطابق گاندھی اس موقع پر بھی عوام کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے فوراً دھمکی دی کہ اگر رولٹ بل منظور کیا گیا تو وہ ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دیں گے۔ جونہی گاندھی جی نے ایسے غیر ذمہ دار بیانات دینے شروع

کیے مسز بیسنٹ نے انھیں آگ سے کھیلنے سے منع کیا حالانکہ وہ خود بھی رولٹ بل کے سخت نقادوں میں سے تھیں مسز بیسنٹ ہندوستانی عوام کی جذباتیت اور عمومی نفسیات سے اچھی طرح آگاہ تھیں اس لیے انھوں نے گاندھی جی کو بروقت خبردار کیا کہ اگر انھوں نے سول نافرمانی جیسی تحریکوں کا آغاز کیا تو اس سے صرف قانون شکن اور شر پسند عناصر کو شہ ملے گی اور لازماً تخریب کاری کا نتیجہ عوام کے حقوق کے عین برعکس ہو گا۔
لیکن گاندھی جی حالات و واقعات سے سیکھنے پر تیار نہ تھے وہ اپنے جنوبی افریقہ کے تجربات ہندوستان میں دہرا کر ان کی افادیت اور قوت کا اندازہ کرنا بلکہ کروانا چاہتے تھے۔ لہٰذا مسز بیسنٹ اور دیگر لبرل سیاسی رہنماؤں کی بار بار تنبیہات کے باوجود گاندھی جی سول نافرمانی اور ستیہ گرہ سے باز نہ رہ سکے۔ گاندھی جی نے 6 اپریل کو کل ہند ہڑتال کا اعلان کر دیا جس پر عوام نے بھرپور لبیک کہا لیکن گاندھی جی کی رسمی اپیل کے باوجود تشدد نہ رک سکا۔
موجمدار پر تشدد واقعات اور جنرل ڈائر کی سفاکی پر شدید تنقید کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس موقعے پر جس بدترین انداز میں ایک انگریز عورت کی آبروریزی کی گئی اس سے خود ہندوستان کے مقدمے کو زک پہنچی اور انگریزوں میں مزید تشدد بھڑک اٹھا۔ اس مقام پر مزید سپاہی متعین کیے گئے اور یہاں سے گزرنے والے ہر ہندوستانی کو نہایت غیر انسانی انداز میں رینگنے اور پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔"

موجمدار کے مطابق "ابتداً حکومت نے ان سب واقعات پر کسی تاسف کا اظہار نہیں کیا۔ حکومت نے گاندھی جی اور ان کی خاموش مزاحمت پر تمام الزام عائد کرتے ہوئے انھیں تمام سانحوں کا براہ راست ذمہ دار قرار دیا۔ گاندھی جی کو سخت وارننگ دی گئی کہ وہ اپنی تمام سرگرمیاں فوری طور پر بند کر دیں۔ سرکاری تنبیہ موصول ہوتے ہی گاندھی جی نے بالکل بھگوڑوں کا سا مظاہرہ کیا اور سخت شرمناک انداز میں فی الفور ہتھیار ڈال دیے۔

21 جولائی 1919ء کو گاندھی جی نے ایک اخباری بیان میں کہا:

"سرکار نے مجھے خبردار کیا ہے کہ سول نافرمانی کے نتیجے میں عوام کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا چنانچہ اس تنبیہ اور کچھ رہنماؤں کی تاکید سے میں اپنی تحریک کو کچھ عرصے کے لیے مؤخر کرتا ہوں۔ ان حضرات میں دیوان بہادر ایل اے، گوندار گھوایر، سر نارائن چند اور کر اور متعدد اخبارات کے مدیر شامل ہیں۔ (اس کے بعد گاندھی نے مارشل لا کے توہین آمیز ریمارکس کو نہ صرف غلامانہ انداز میں قبول کر لیا بلکہ پنجاب میں بے چینی پر

انکوائری کمیٹی کے قیام کے سرکاری وعدے پر حکومت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا) میں نے گہرے غورو خوض کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ حکومت کی اس قدر شفقت اور پر درد ممانعت کے باوجود میری طرف سے تحریک کا جاری رکھنا غیر دانشمندانہ ہو گا۔ درحقیقت میری طرف سے سرکاری ہدایت کا قبول کرنا ہی میری مزاحمت کی نوعیت کا عکاس ہے۔ میری قسم کا رہنما کبھی بھی حکومت کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔"

گاندھی کی اس شرمناک پسپائی پر موجمدار تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہاں جو پہلا سوال فوری طور پر قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اگر گاندھی جی جیسا رہنما اپنی مزاحمت اور سول نافرمانی سے حکومت کو ناراض اور پریشان نہیں کرنا چاہتا تو پھر وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ ناخواندہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے وہ کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟ سرکار کی ذلت آمیز تنبیہ کو مان لینے والا اینی بیسنٹ اور لبرل رہنماؤں کے باعزت مشورے قبول کیوں نہیں کرتا؟"(40)

گاندھی کی اس حرکت پر اس وقت کے نامور صحافی سر سی وائی چنتامنی نے ان الفاظ میں تنقید کی:

"رولٹ بل کی منظوری نے گاندھی جی کو منظر عام پر نمایاں کیا۔ گاندھی جی نے اپنے فرسودہ فلسفے کا یہاں بھی سہارا لیا۔ اس کی مدد سے وہ جنوبی افریقہ اور گجرات اور بہار کے دو قصبات میں چھوٹے پیمانے پر کامیابی حاصل کر چکے تھے چنانچہ اس سے غلط اندازے لگا کر انھوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف بھی ستیہ گرہ کا آغاز کر دیا۔ حالانکہ انھیں بار بار متنبہ کیا گیا تھا کہ ملک میں انگریز کے خلاف جذبات پہلے ہی بھڑکے ہوئے ہیں لہٰذا محض اپنی مقبولیت کا اندازہ کرنے کے لیے وہ عوام کو تشدد کی تحریک نہ دیں کیونکہ اس صورت میں خونریزی کی لہر کو روکنا مشکل ہو جائے گا لیکن انھوں نے ہر اعتراض کو پس پشت ڈال کر اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنایا جس کے نتائج ماہرین کے خدشات سے بھی کہیں بدتر شکل میں ظاہر ہوئے۔"(41)

اپنی سودیشی تحریک میں مہاتما غیر ملکی کپڑوں کے پیچھے پڑ گئے۔ سیاسی ورکروں اور اپنے پیروکاروں کو اس کام پر لگا دیا کہ جہاں سے غیر ملکی کپڑے ملیں اکٹھے کیے جائیں تاکہ انھیں جلا کر "غلامی کی زنجیریں" توڑی جا سکیں۔ ایسے ہی ایک تقریب کا حوالہ ٹنڈولکر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"On July 31 Gandhi ceremoniously celebrated the bonfire of foreign cloth at Umar Sobani's yard at Parel in Bombay—a

spectacular scene witnessed by thousands of citizens. As the flame leapt up and enveloped the whole pyramid, there was a shout of joy resounding through the air as if India's shackles had been broken asunder. It was not rags that were burnt but some of the finest saris, shirts and jackets were consigned to the flames. In some cases the choicest silks kept by mothers for their daughters' wedding were given up for burning. No less than one lakh and a half pieces of foreign cloth were consigned to flames."

"31جولائی 1921ء کی صبح گاندھی جی نے بمبئی کے عمر سبحانی یارڈ میں ایک الاؤ دہکایا جس میں قیمتی غیر ملکی کپڑے کی لاتعداد گانٹھیں جلا کر خاکستر کی گئیں۔ اس قابل دید منظر کو عوام کے بڑے ہجوم نے دیکھا۔ جونہی شعلوں نے کپڑے کے بلند و بالا ڈھیر کو اپنی لپیٹ میں لیا مجمعے نے فرط انبساط سے اس طرح نعرے بلند کیے جیسے ہندوستان کی ساری زنجیریں اس آگ میں پگھل گئی ہوں۔ اس انبار میں نہایت بیش قیمت ساڑھیاں، قمیضیں اور کوٹ شامل تھے۔ بعض ایسا ایسا قیمتی ریشم بھی یہاں نذر آتش کیا گیا جو بچیوں کی ماؤں نے بڑے چاؤ سے ان کے بیاہ کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ اس موقعے پر کپڑے کے ڈیڑھ لاکھ سے زائد نایاب ٹکڑے بے دردی سے جلا کر راکھ کر دیے گئے"(42)

Addressing a meeting on the Chowpati sands, on August 1, Gandhi said:

"Bombay the Beautiful lit yesterday a fire which must remain forever alive, even as in a Parsi temple, and which must continually burn all our pollutions, as yesterday we burnt our greatest outward pollution, our foreign clothing. Let it be a token of our determination never to touch foreign cloth.

It was, therefore, a noble sacrifice were made yesterday"

"یکم اگست کو گاندھی نے خطاب کرتے ہوئے کہا" بمبئی کل ایک مقدس آگ سے جگمگاتا رہا جو میرے خیال میں زرتشت کی عبادت گاہوں کی طرح ہمیشہ جلتی رہنی چاہیے تاکہ ہماری آلائشیں مستقلاً بھسم ہوتی رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کل ہم نے غیر ملکی کپڑا جلا کر اپنی

ایک آلودگی کو جلاڈالا۔ اس آگ کو آپ ایک علامت سمجھیں اس عہد کی کہ ہم کبھی غیر ملکی کپڑے کو چھوئیں گے بھی نہیں۔۔ کل کی آگ ایک سچی قربانی کی آگ تھی۔"(43)

موجمدار کے مطابق اس عظیم مذہبی خطاب کا عوام کے ذہنوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کا ردِ عمل یکسر مختلف تھا۔

ریورنڈ سی ایف اینڈریوز نے اپنی کتاب "مہاتما گاندھی کے افکار" کے صفحہ 269 پر لکھا:

"گاندھی جی کے ایسے کاموں کا نہایت منفی اثر پورے ملک کے عوام پر پڑا اور خصوصا بمبئی کے عوام تو بہت شدت سے تشدد کی جانب مائل ہوئے۔ غیر ملکی کپڑا جلنے کا منظر دیکھنے کے لیے ایک لاکھ افراد کا ہجوم اکٹھا ہوا تھا جو یہاں سے تخریب اور دہشت پسندی کا نہایت شاندار سبق لیکر پورے شہر میں پھیل گیا"(44)

موجمدار کے مطابق خود اینڈریوز گاندھی جی کی اس منتقم مزاجی اور انتہا پسندی سے سخت دل گرفتہ ہوئے اور اس نے گاندھی کو ایک دلسوز خط بھی لکھا جواب میں گاندھی فرماتے ہیں کہ:

"تخریب تعمیر کی سب سے بڑی محرک ہے۔ میں تو بڑی عظیم تباہی کا متمنی ہوں جس کے ذریعے ہندوستان اپنے صدیوں پرانے خواب غفلت سے دہل کر جاگ سکے۔" پھر اس نے اپنے ایک جرمن دوست کے دوربین سمندر میں پھینکنے کا واقعہ بیان کیا۔

جنوبی افریقہ میں ایک جرمن ماہر تعمیرات گاندھی جی کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔ وہ ایک دولتمند شخص تھا اور بہت پر تعیش زندگی گزارنے کا عادی تھا لیکن گاندھی جی کا مقلد بننے کے بعد اس نے اپنی تمام جائیداد ان کے حوالے کر دی اور نہایت سادہ زندگی بسر کرنے لگا۔ کیلن باخ کے پاس ایک نہایت قیمتی دوربین تھا جسے وہ بے حد عزیز رکھتا تھا گاندھی جی اس سادہ لوح شخص کو فلسفہ تیاگ سے روشناس کروانا چاہتے تھے۔ یہ سب گاندھی جی نے کس طرح کیا اس کا تذکرہ ان کے اپنے الفاظ میں سنیے۔

"کیلن باخ کو اپنی دوربین بے حد عزیز تھی جس کی قیمت اس دور میں 7 سٹرلنگ پاؤنڈ تھی۔ لیکن میں اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ اتنی قیمتی دوربین پاس رکھنا سادگی کے اعلیٰ آدرشوں سے متصادم ہے۔ ایک روز ہم بحری جہاز کے عرشے پر کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ میں اسے اس مہنگی دوربین کے اخلاقی نقصانات سمجھا رہا تھا جب کہ وہ اس کے حق میں بول رہا تھا۔ یکلخت میں نے کہا۔ کیوں نہ میں اس منحوس شے کو سمندر میں پھینک دوں جو میرے اور تمھارے درمیان اختلاف کا باعث بن رہی ہے تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ کیلن باخ نے مجھے دوربین پھینک دینے کی اجازت دے دی۔ میں نے پھر وضاحت کی کہ میں سچ

مچ دوربین کو پھینک دینے کی بات کر رہا ہوں۔ کیلن باخ نے ایک مرتبہ پھر مجھے اجازت دے دی۔ یہ سنتے ہی میں نے دوربین سمندر کی بے کراں لہروں کے حوالے کر دی۔ کیلن باخ کو میں نے محض ایک آلے سے نجات نہیں دلائی بلکہ اسے خواہشات کی شدت سے آزاد کیا۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے موجمدار لکھتے ہیں کہ "اس داستان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو جرمن شہری کی دوربین اپنے ہاتھ سے ضائع کیے بغیر چین نہیں آیا اور وہ ہر اس چیز کو بھی برباد کر دینے کے عادی تھے جو ان کی خواہش کی راہ میں مزاحم ہوتی تھی۔ موجمدار ہی کے مطابق پھر وہ اپنی اس تباہی پسند طبیعت کو درست ثابت کرنے کے لیے طرح طرح کے دلائل اور جواز تراشتے رہتے تھے"۔(45)

عدم تشدد کی بدلتی تعریفیں

اندولال یاجنک لکھتے ہیں ایک دفعہ جیل میں ایسا ہوا کہ ایک طرف تو ہمیں درس دیتے تھے کہ جیل کے قواعد وضوابط کی پابندی لازمی ہے لیکن ساتھ دوسری طرف ہم چوری چھپے جیل قواعد سے ہٹ کر انھیں اخبار بھی فراہم کرتے ہیں جس پر مہاتما کوئی اعتراض بھی نہیں کرتے میں نے سوچا کہ ایک بار پوچھ کر دیکھ تو لوں کہ اپنے قول وفعل کے اس تضاد کو جسٹی فائی کیسے کرتے ہیں؟

> "اندولال کے پوچھنے پر مہاتما فرماتے ہیں "میں جیل کے حکام کو بتا چکا ہوں کہ میرے پاس مختلف ذرائع سے جن میں اخبار بھی شامل ہیں خبریں پہنچتی رہتی ہیں اور ایسی خبروں کو اپنے تک پہنچنے سے میں روک نہیں سکتا۔"

گاندھی کے اس تاویل پر پر اندولال یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> "اس طریقے سے ہمارے ہوشیار، رشی، قول وفعل کے نمایاں تضاد میں اکثر نہایت کامیابی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیا کرتے تھے اور اپنے پوپلے منہ کے ایک ضیابار تبسم میں سب کچھ چھپالے جاتے تھے۔"

ایسی ہی تاویلوں کے ذریعے مہاتما اپنے عدم تشدد کی نئی نئی ڈیفینیشنز بھی سامنے لاتے رہے آیئے ذرا ان عجیب وغریب ڈیفینیشنز پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

بیورلے نکولس لکھتے ہیں کہ:

> "شاید گاندھی عدم تشدد کے اس نظریے کا پرچار کرنے میں مخلص ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مخلص نہ ہوں۔ لیکن دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ایک ایسے شخص

کے لیے جس کا ذہن اس قدر دقیانوسی، اور خیالات خلط ملط ہوں، خلوص کا ہونا یانہ ہونا، بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں میں ان کی تازہ ترین تعریفوں میں سے ایک "تعریف" کا ذکر کرونگا۔ بشر طیکہ ان کے خلط ملط خیالات کے ایک مبہم سے دھبے کو کس چیز کی تعریف کالقب دیا جاسکتا ہو۔

"اگر کوئی شخص تن تنہا مسلح ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا مقابلہ ایک تلوار سے کر رہا ہو، تو میں کہونگا کہ وہ شخص ڈاکوؤں کا مقابلہ عدم تشدد سے کر رہا ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک چوھیا، بلی کا مقابلہ اپنے تیز دانتوں سے کر رہی ہے تو کیا اس چوہیا پر آپ تشدد کرنے کا الزام لگائیں گے؟ اسی طرح پولینڈ کے باشندوں کا، جرمنی کے فوج کے سامنے، جو تعداد اور طاقت میں ان سے کہیں زیادہ تھی، بہادری سے کھڑا ہو جانا تقریباً تقریباً عدم تشدد کی ایک مثال تھی۔"

اگر کوئی شخص ہمیں یہ بتا سکے کہ ان الفاظ سے ان کی کیا مراد تھی، بلکہ کیا مراد نہیں تھی تو وہ یقیناً بہت ذہین شخص شمار ہو گا۔ بظاہر گاندھی اس بات کا تاثر دینا چاہتے ہیں، کہ پولینڈ کی ایک مشین گن پچاس جرمنوں کو قتل کر کے بھی "تقریباً" عدم تشدد کی مثال پیش کرتی ہے، کیونکہ اس کے ساتھ، دوسری مشین گنوں کی تعداد کم تھی یا بالفاظِ دیگر اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر اپنے سے بڑی تعداد کے خلاف تشدد استعمال کیا جائے تو وہ خود بخود عدم تشدد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایک تنقید نگار نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ نظریہ کسی بھی غیر مسلح بغاوت کے دوران باغیوں کے لیے نہایت معقول مفروضہ ثابت ہو سکتا ہے"

واقعی یہ نظریہ بہت معقول ہے۔ عدم تشدد کے پجاری قوم پرستوں کے لیے تو یہ بے پناہ تسلی کا باعث ہے جو پولیس والوں پر عدم تشدد کا پٹرول چھڑک کر اسے "عدم تشدد" کی ماچس سے جلا دیتے ہیں اور ان پر امن ہجوموں کے لیے بھی جن کی تعداد اگر ایک کے مقابلے میں ایک ہزار ہو، عدم تشدد کے ڈنڈے مار مار کر برطانوی اور کینیڈین لڑکوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

اور گاندھی اب بھی اپنی پالیسی کا شکار ہونے والوں کی لاش پر مسکراتے ہوئے کہہ سکتے ہیں "آپ کو تو بخوبی علم ہے کہ یہ سب کچھ "تقریباً" عدم تشدد ہے۔"(46)

اپنی اسی کتاب میں بیورلے نکولس گاندھی کے عدم تشدد کی ایک اور تعریف کچھ اس طرح سامنے لاتے ہیں "گھما پھرا کر بات کرنے کا ایک شاہکار انھوں نے اپنی گرفتاری سے قبل اپنے اخبار "ہریجن" میں شائع کیا

تھا۔ وہ ایک "سنجیدہ سوال" کے جواب میں لکھتے ہیں:

سوال: عدم تشدد کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، حکومت کے خلاف کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: میں صرف اپنی ذاتی رائے ہی دے سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بالکل بے داغ عدم تشدد کے ذریعے

یہاں تک بات ٹھیک تھی لیکن دوسرے ہی فقرے میں وہ فرماتے ہیں۔

"ایسی جدوجہد میں بجلی کے تار کاٹنے، ریل کی پٹڑیاں اکھاڑنے اور چھوٹے پل تباہ کرنے پر بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔"

کیا خوب الفاظ استعمال کیے ہیں، مسٹر گاندھی، چھوٹے پل۔ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس وقت کونسا پل چھوٹا ہوتا ہے، اور کونسا نہیں ہوتا؟ اور ٹرین کے حادثے کا شکار ہونے والوں کے لیے نیک نیتی کے وہ الفاظ بے کار ثابت ہوتے ہیں، جو ان کے عدم تشدد کے حامی قاتلوں نے ٹرین کی پٹڑی اکھیڑتے وقت استعمال کیے ہونگے"

آگے چل کر بیورلے نکولس گاندھی اور کانگرس کے کچھ تشدد آمیز بیانات کا حوالہ بھی دیتے ہیں

"آیئے ان کی اپنی تقریروں، اور منشوروں کے چند اقتباسات سے اس بیان کی تشریح کرتے ہیں۔

"ہم لڑیں گے یا مر جائیں گے"

"یہ ایک کھلی بغاوت ہے"

"اگر فسادات ہوتے ہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے"

"آپ اپنے آپ کو آزاد تصور کریں، ہر کام ایک آزاد انسان کی طرح کریں"

"ہماری اس تحریک کو ساری دنیا محسوس کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ برطانوی فوجوں کی نقل و حرکت میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالے، لیکن برطانیہ کی توجہ اس کی جانب ضرور مبذول ہو گی۔"

ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں عدم تشدد پر مبنی ہیں! ساری باتیں نہایت نپے تلے الفاظ میں ان سر پھرے لوگوں کا ہاتھ روکنے کے لیے کی گئی ہیں، جو طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں اور گاندھی ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں طاقت کے استعمال سے نفرت ہے! یہ بات اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس کو کانگرس کے ان بلیٹنوں کے ساتھ پڑھیں، جن کی ہندوستان میں بھرمار ہے۔ یہ بلیٹن گاندھی کے

خیالات کو ان کے منطقی انجام تک پہنچاتے تھے۔

یہ بلیٹن لوگوں کو کھلے بندوں قتل وغارت پر اکساتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ "ٹامیوں پر چھپ کر حملہ کرنے کے لیے گوریلا دستے فوری طور پر تشکیل دیے جائیں"

ان میں یہ ہدایات شائع ہوتی تھیں کہ انگریزوں کے لیے کھانا پکانے والوں کو منظم کیا جائے تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے لیے خراب کھانا پکائیں۔ ملاحظہ کیجیے کتابچہ، ورکرز آف انڈیا جو اے آئی سی سی آفس کے نام پر 27 اگست 1942ء کو شائع ہوا تھا۔ یعنی نرم الفاظ میں انھیں اس بات پر اکسایا جا رہا تھا، کہ وہ لوگوں کو بڑے پیمانے پر زہر دے کر ہلاک کریں۔"(47)

نمک ستیہ گرہ اور عدم تشدد

اس ستیہ گرہ میں بھی مہاتما جو کرتے ہیں وہ بھی وہی روایتی چالبازیوں اور حیلہ سازیوں کا مرکب ہے۔

موجمدار کے مطابق چونکہ گاندھی کے مطابق ہوا اور پانی کی طرح نمک بھی عوام کی فطری ملکیت ہیں جس پر سرکار کو غاصبانہ قبضے کا کوئی حق نہیں۔ گاندھی جی کے مطابق ڈپوؤں میں ذخیرہ شدہ نمک عوام کی ملکیت تھا جسے لوٹ لینے کا حق وہ محفوظ رکھتے تھے۔

ان کی تحریک (نمک ستیہ گر) کا اگلا مرحلہ چارسدہ اور دھرسنا میں نمک کے سرکاری ڈپوؤں پر حملہ کرنا تھا۔ اس موقعے پر وائسرائے کو انھوں نے مندرجہ ذیل خط لکھا "عزیز دوست خداوند کے کرم سے میرا ابھی ارادہ ہے کہ میں اپنے رفیقوں کے ہمراہ دھرسنا روانہ ہو جاؤں اور نمک کے ذخائر پر قبضہ کرلوں۔ آپ کے لیے تین راستے کھلے ہیں جن کے ذریعے آپ میرے حملے کو رکوا سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ لفظ غلط ہے لیکن اسے بڑی مہارت سے میری کارروائی کے لیے رائج کر دیا گیا ہے۔

نمک پر سے ٹیکس ہٹا کر (48)

لیکن مہاتما کی نظر میں حکومت کو ڈیڈ لائن دینا، کسی قسم کے وسائل کا لوٹنا ان پر قبضہ کرنا بھی عدم تشدد ہے یا کم از کم "تقریباً عدم تشدد" تو ضرور ہو گا:

> "کیبنٹ مشن پلان جس طرح مہاتما نے ناکام کیا اس کے بعد کلکتہ قتل وغارت کے بعد بھی ویول کے ساتھ ملاقات میں ایک ہندو سیاست دان بن کر مہاتما نے لیگ کے جائز تحفظات کو ماننے سے انکار کیا وہ بھی شاید عدم تشدد کی ہی ایک کوشش ہو گی۔ اس بات سے قطع نظر کہ کلکتہ قتل وغارت کا ذمہ دار کون تھا یہ تو حقیقت تھی کہ لوگ بے دردی سے مارے

گئے بدترین تشدد ہوا اس بات کے بھی پورے پورے امکانات تھے کہ مزید تشدد بھڑکے گا اور بعد میں نواکھلی اور بہار میں یہی کچھ ہوا بھی۔ باپو جو دوران جنگ مغربیوں تک کو کہتا ہے کہ عدم تشدد سے لڑو وہ اپنے ملک میں بدترین تشدد دیکھ کر اور مزید تشدد کے امکانات پر بھی پریشان ہونے کے بجائے ویول کے سامنے میز پر مکے مار مار کر کہتا رہا کہ "اگر ہندوستان خون میں نہانا چاہتا ہے تو اس کو نہانا چاہیئے"

شخصیت کے کچھ اور پہلو

بوس کے علاوہ ویول کی بھی گاندھی بارے یہی رائے تھی کہ وہ کبھی بھی دوٹوک اور صاف بات کرنے کے عادی نہیں رہے۔

"لاسٹ ڈیز آف برٹش راج" میں موسلے لکھتے ہیں کہ ایک انٹرویو میں مجھے ویول نے گاندھی کے بارے میں بتایا:

"He spoke to me for half an hour , and I am still not sure what he meant to tell me. Every sentence he spoke could be interpreted in at least two different ways."

"وہ مجھ سے آدھا گھنٹہ بات چیت کرتے رہے۔ لیکن میں ابھی تک پوری طرح سمجھ نہیں پایا کہ وہ مجھے کیا کہنا چاہتے تھے۔ ہر جملہ جو انھوں نے بولا اس کی کم از کم دو مختلف طریقوں سے تشریح ہو سکتی تھی۔"

مزید لکھتے ہیں:

There came a time when the prospect of another talk with Gandhi filled him with so much mental discomfort that he could not sleep the night before.

"ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ گاندھی جی کے ساتھ ایک اور مذاکرے کے تصور نے انھیں اس قدر ذہنی بے سکونی سے دوچار کر دیا کہ وہ رات بھر سو نہ سکے۔"(49)

ساتھ ساتھ جناح صاحبؒ کی مختلف مواقع پر گاندھی کے متعلق رائے یا کہے گئے کچھ جملے بھی پڑھ لیں اور سوچیں کہ جناح صاحب کی مہاتما کی شخصیت کے متعلق "تشخیص" کتنی درست تھی۔

ایک بار جناح صاحب کے ساتھ کسی معاملے مہاتما کی بات چیت ہوئی۔

جناح صاحب کا خیال تھا کہ گاندھی نے معاملے میں وعدہ شکنی کی ہے اور گاندھی کا دعوی تھا کہ ان کی روحانی

قندیل نے انھیں اپنا خیال بدلنے پر مجبور کیا ہے۔ اس پر جناح نے جھلا کر اپنے سیکریٹری سے کہا: "روحانی قندیل کی ایسی کی تیسی، یہ شخص ایمان داری سے یہ کیوں نہیں تسلیم کر لیتا کہ اس سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔"

"ایک اور مرتبہ جناح صاحب نے گاندھی کے متعلق رائے دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کا مطلوبہ مطلب نہیں ہوتا وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندے نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کا واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان پر لاتے ہیں جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو برت رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستانی کا معمہ ہیں۔"(50)

گاندھی کی مختلف "حیثیتوں" کے بارے میں رائے دیتے ہوئے جناح صاحب نے کہا:

"کوئی شخص مسٹر گاندھی سے کس طرح بات کرے۔ ان کی کئی حیثیتیں ہیں اور وہ حیثیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً ان کی ذاتی حیثیت، کانگرس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت، پھر یہ حیثیت کہ وہ کانگرس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں، تیسری حیثیت یہ کہ وہ ہندو مسلمان سب کے نمائندے ہیں۔ چوتھی حیثیت اور وہ سب سے عظیم ہے اور وہ ان کی مہاتمائی ہے اور پھر یہ کہ ان کی اندرونی آواز ہے اور اس آواز کی تاویل کا حق انھیں کو اور فقط انھیں کو پہنچتا ہے۔ غرض کوئی آدمی یہ نہیں جان سکتا کہ مسٹر گاندھی کس وقت میں کس حیثیت کے مالک ہونگے۔" (51)

"مدر انڈیا" ایک امریکن مصنفہ مس کیتھرین میو نے لکھی جس میں ہندوستانی معاشرت، مذہب اور کلچر پر تنقید کی تھی جواب میں گاندھی نے ایک تحریر لکھی جو "دی ڈرین انسپیکٹرز رپورٹ" کے عنوان سے شائع ہوئی۔

کتاب میں کیا لکھا گیا، میرا موضوع نہیں، اس کتاب کا تذکرہ گاندھی کی حسبِ روایت غلط بیانی کو آشکار کرتا ہے۔ بیورلے نکولس اس کتاب پر گاندھی کے ردِ عمل پر لکھتے ہیں کہ:

"انھوں نے سب سے زیادہ سخت تنقید کتاب کے اس حصے پر کی جو ان کے ایک انٹرویو کے بارے میں ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے دنیا کے نام ایک پیغام دیا تھا" مجھے کچھ یاد نہیں" کہ میں نے ایسا پیغام دیا تھا جیسا کہ مس میو نے مجھ سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت صرف ایک شخص موجود تھا جس نے میرے نوٹ لیے تھے اسے بھی قطعاً یاد نہیں ہے کہ میں نے وہ باتیں کہی تھیں جو اس کتاب میں مجھ سے منسوب کی گئی ہیں۔"

گاندھی کے اس جواب کہ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کوئی پیغام دیا، پر بیورلے نکولس لکھتے ہیں کہ:

"بد قسمتی سے۔۔۔بلکہ ہندو جارج واشنگٹن کے لیے نہایت بد قسمتی سے اس امر کا ناقابلِ تردید تحریری ثبوت موجود ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پیغام، جو گاندھی اور ان کے ساتھی یک دم، اور اتنی آسانی سے بھول گئے، نہ صرف دیا گیا تھا بلکہ اس پر نظر ثانی بھی کی گئی تھی، گاندھی نے خود اس کے متن کی منظوری دی تھی، ان کے سیکرٹری نے اسے ٹائپ کیا تھا۔ گاندھی نے اس پر دستخط کیے تھے، اور پھر ایک خط کے ہمراہ سے مصنفہ کے نام روانہ کیا تھا اور شومئ قسمت دیکھیئے کہ یہ خط "ڈیئر فرینڈ" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے"

مدر انڈیا پر تنقید کے جواب میں بعد میں ہیری ایچ فیلڈ نے "آفٹر مدر انڈیا" لکھی جس میں باپو کا پیغام اور خط صفحہ نمبر 29 پر موجود ہیں جن کے وجود سے مہاتما انکاری تھے یہ کتب انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔

بیورلے نکولس اس معاملے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"مس میو کی کتاب کا سب سے زیادہ پر اثر حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے پرنس آف ویلز کے بمبئی پہنچنے پر شاندار استقبال کا ذکر کیا ہے۔ تمام اخبارات، نہ صرف ہندوستان بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات اس استقبال کے حالات اور تصاویر سے پُر تھے۔

جس وقت یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا، اس وقت ساری دنیا کے کیمرے شہزادے کے دورے کے اس نقطہ عروج پر فوکس کیے ہوئے تھے۔۔۔۔ لیکن گاندھی نے اپنے چھوٹے چھوٹے مگر تیز کان زمین کے ساتھ لگائے ہوئے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں افق کا جائزہ لے رہی تھیں۔"

ان کے کان ذرا ذرا سی آہٹوں پر اور آنکھیں شہزادے کی ہر نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھیں۔ کس لیے؟ کیونکہ وہ شاہی آمد کے بائیکاٹ کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ انھیں اس استقبال کا علم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں وہ ان واقعات کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"وہ ایک استقبال کا بیان کرتی ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ پرنس آف ویلز کا استقبال تھا لیکن ہندوستان کو اس استقبال کا کوئی علم ہی نہیں ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ یہ استقبال کیا گیا ہوتا اور ہمارے علم میں نہ ہوتا"

لہٰذا اس موقعے پر گاندھی کی بات پر یقین کرنے کے لیے ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ انھیں یا تو لمبے عرصے تک بے ہوش رکھنے کی دوا دے دی گئی ہوگی یا پھر وہ کسی طویل مراقبے میں ہونگے۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

> "دی ڈرین انسپیکٹرز رپورٹ" کے بارے میں میں پھر کہتا ہوں کہ یہ گاندھی کے ذہن کا مطالعہ کرنے والے طالبعلموں کے لیے عجائب گھر میں رکھا جانے والا ایک نمونہ ہے، یہ بات ٹالنے، دھوکا دہی اور جھوٹی باتیں دوسروں سے منسوب کرنے کا ایک شاہکار ہے۔
> یہ ایک ایسے شخص کی نمائندہ تحریر ہے جو "سچ" کے لفظ کی اس قدر گردان کرتا ہے کہ بالکل طوطا لگنے لگا ہے اور جس نے دنیا کو یہ غلط تاثر دے رکھا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے جو تاج پہن رکھا ہے، اس میں جھوٹے کام کی چمک نہیں بلکہ وہ خدا کے نور کا ہالہ ہے۔"(52)

دوسری جنگ عظیم، مہاتما اور عدم تشدد

چونکہ دوسری جنگ عظیم کے دوران مہاتما نے اپنا مشہور زمانہ خط برطانویوں کے نام لکھا جس میں وہ انھیں عدم تشدد سے لڑنے کے لیے کہتے ہیں اس لیے اس جنگ کے شروع سے لیکر بعد تک مہاتما اور اس کے عدم تشدد پر علیحدہ نظر ڈالتے ہیں۔ یہ مشہور خط لکھنے سے پہلے موصوف وائسرائے سے مل کر جنگ کی حمایت کا یقین دلا چکے تھے۔ بعد میں مہاتما کے اندر عدم تشدد کے خیالات نے اودھم مچانا شروع کر دیا۔

وائسرائے نے جب ہندوستان کو متحارب ملک قرار دیا تو اس نے گاندھی اور جناح صاحب کو ملاقات کے لیے شملہ مدعو کیا۔ گاندھی پہلی دستیاب ٹرین سے شملہ روانہ ہوگئے۔ گاندھی کے اوّلین ردِّ عمل کو ٹنڈولکر نے اس طرح بیان کیا:

> "And as I was picturing before him the Houses of Parliament and the Westminster Abbey and their possible destruction, I brokedown."

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ:

> "I hope that it is clear to my critics that my sympathy for England and France is not a result of momentary emotion or, in cruder language, of hysteria. "

"انگلینڈ اور فرانس سے میری ہمدردی کسی وقتی جذباتیت یا بھونڈے الفاظ میں ہسٹیریا کا نتیجہ نہیں ہیں۔(53)

وائسرائے کو گاندھی نے بتایا کہ وہ اس سلسلے میں ان سے ذاتی حیثیت سے ملنے آئے ہیں اور انھیں اس سلسلے میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کی آشیر باد حاصل نہیں ہے۔

15 ستمبر 1939ء کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک قرار داد پیش کی جس میں کہا گیا کہ "ورکنگ کمیٹی بلا ہچکچاہٹ جرمنی کی نازی حکومت کی پولینڈ کے خلاف تازہ ترین جارحیت کی مذمت کرتی ہے اور اس کے خلاف مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔۔۔۔ لیکن ہندوستان خود کو کسی ایسی جنگ سے وابستہ نہیں کر سکتا جو جمہوری آزادی کے نام پر لڑی جارہی ہو جبکہ ہندوستان کو خود اس آزادی سے محروم رکھا گیا ہے اور جو محدود سی آزادی اس کے پاس ہے وہ بھی اس سے چھین لی گئی ہے۔"

مہاتما نے ورکنگ کمیٹی کے اندر سرکار برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کے لیے تنہا جنگ لڑی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے مندرجہ بالا قرار داد پر گاندھی جی نے کچھ یوں تبصرہ کیا:

"The Working Committee's statement on the world crisis took four days before reeived it final shape. Every member expressed his opinion freely on the draft that was, at the committee's invitation, prepared by Pandit Jawaharlal Nehru. I was sorry to find myself alone in thinking that whatever support was to be given to the British should be given unconditionally.

"عالمی بحران پر ورکنگ کمیٹی کے بیان کو حتمی شکل اختیار کرنے میں چار روز لگے۔ ہر رکن نے اس ڈرافٹ پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کیا جسے کمیٹی کی دعوت پر پنڈت جواہر لال نہرو نے تیار کیا تھا۔ مجھے خود کو برطانوی حکومت کی غیر مشروط حمایت کے معاملے پر خود کو تنہا پا کر بے حد رنج پہنچا۔"(54)

بعد کی کہانی موجمدار اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اگرچہ وائسرائے کے ساتھ پہلے مذاکرات میں جو جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہوئے گاندھی جی نے انگلستان اور اس کے اتحادیوں کے لیے گہری جذباتی وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ اور انھیں غیر مشروط حمایت کی پیشکش کی تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے روّیے میں تبدیلی آگئی۔ بعد میں انھوں نے وضاحت کی کہ غیر مشروط حمایت کا مفہوم خالصتاً

عدم تشدد کی بنیاد پر اخلاقی تائید کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے روّیے میں یہ سختی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس پٹنہ منعقدہ 28 فروری 1940ء کو نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ یہ اجلاس اس پالیسی قرارداد کا خاکہ تیار کرنے کے لیے بلایا گیا تھا جسے کانگرس کے آئندہ اجلاس رام گڑھ میں پیش کیا جانا تھا۔ اس کانگرس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ یہ قرارداد ہندوستان میں برطانوی راج پر کڑی نکتہ چینی سے شروع ہوئی اور اس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس میں کسی ایسی جنگ میں شرکت سے معذروی ظاہر کی گئی تھی جو استعماری مقاصد کے حصول کی خاطر لڑی جارہی ہو۔ آخر میں اس میں دھمکی دی گئی کہ کانگرس وزارتوں سے استعفیٰ کے منطقی نتیجے کے طور پر سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کردے گی۔"

کانگرس کے اجلاس رام گڑھ کے فوراً ہی بعد اتحادیوں کے لیے جنگ کی صورتحال بے حد بگڑ گئی۔ جرمنی کی فوج نے ہالینڈ اور بیلجئم پر قبضہ کرلیا اور فرانس کی مزاحمت بھی ٹوٹ گئی خود ڈنکرک کے مقام پر برطانیہ کی تیز رفتار فوج کو شکستِ فاش ہوئی اور اب انگلستان پر جرمنی کا حملہ یقینی تھا۔ نئی صورتحال پر غور کرنے کے لیے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس دہلی میں ہوا۔

موجمدار کے مطابق اس لمحے گاندھی جی کے دماغ میں خیالات کی نئی رو آئی اور اہنسا، اور عدم، تشدد، جیسے خیالات نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا۔

"اس نے مجھے حتی الامکان عدم تشدد سے بھر دیا ہے، انھوں نے کہا میرے خیال میں برطانیہ اور شکست خوردہ وہ اقوام کو عدم تشدد سے بہتر کوئی چیز پیش نہیں کی جاسکتی"(55) تب مہاتما نے اپنا معروف خط "ہر برطانوی کے نام" لکھا۔

"میں ہر برطانوی سے درخواست کرتا ہوں۔ وہ بین الاقوامی تعلقات کو بحال کرنے کے لیے جنگ کے بجائے عدم تشدد کا راستہ اپنائیں۔

"میں آپ کو ایک شریفانہ اور جراتمندانہ راستہ پیش کرتا ہوں جو بہادر ترین سپاہیوں کے قابل ہے۔ میں آپ سے چاہوں گا کہ آپ نازی ازم کا مقابلہ اسلحے کے بغیر کریں اور اگر میں فوجی اصطلاح استعمال کروں تو آپ کو نازی ازم کے خلاف عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑنا چاہیے۔

آپ ہٹلر اور مسولینی کو دعوت دیں گے کہ وہ آپ کے ملک سے جنھیں آپ اپنی ملکیت کہتے ہیں جو چاہیں لے جائیں۔ آپ انھیں اپنے خوبصورت جزائر پر خوبصورت عمارتوں

سمیت قبضہ کرنے کی اجازت دے دیں۔ آپ انھیں اپنا سب کچھ دے دیں گے لیکن اپنی روحیں اور ذہن نہیں۔ اگر یہ حضرات آپ کے گھروں پر قبضہ کرنا چاہیں تو آپ انھیں خالی کر دیں گے۔ اگر وہ آپ کو آزادانہ گزرنے کا راستہ نہ دیں تو آپ انھیں خود کو مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دے دیں گے لیکن آپ ان کی وفاداری سے انکار کر دیں گے۔" (56)

یاد رہے اس وقت چرچل نے برطانوی عوام کو مخاطب کر کے کہا: "ہم اپنے جزائر کا دفاع کریں گے۔ ہم ساحلوں پر لڑیں گے، ہم خشکی پر لڑیں گے، ہم کھیتوں میں اور گلیوں میں لڑیں گے، ہم پہاڑوں پر لڑیں گے، ہم کبھی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔"

اس سے عوام کے دلوں میں مزاحمت کا نیا جذبہ پیدا ہوا اور انھوں نے نازیوں کو شکست سے دوچار کیا۔
لیکن مہاتما اب ضرورت سے زیادہ ہی اپنے عدم تشدد پر عمل پیرا ہوتے ہوئے نظر آئے اس لیے کانگرس نے عافیت اسی میں جانی کہ مہاتما کو ان کی ذمہ داریوں سے "مستثنیٰ" کیا جائے۔
ایس ایم نمبوردری پد "مہاتما اور ازم" میں لکھتے ہیں کہ کانگرس کمیٹی نے اس قرارداد کے ذریعے مہاتما کو کانگرس کی ذمہ داریوں سے الگ کر دیا:

> "But they recognize that he should be 'free' to pursue his great ideal in his own way and therefore absolve him from the responsibility for the programme and activity which the congress has to pursue."
>
> "وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مہاتما کو اپنے عظیم آدرشوں پر اپنے انداز میں عمل کرنے کی آزادی ہونی چاہئے چنانچہ انھیں کانگرس کے اس پروگرام اور سرگرمیوں کی ذمہ داری سے مستثنیٰ رہنا چاہئے جس پر وہ عمل کرنا چاہتی ہے۔" (57)

موجمدار کے مطابق گاندھی جی کو کانگرس کے سیاسی پروگرام سے بری الذمہ کرنے کے بعد ورکنگ کمیٹی کا ایک ہنگامی اجلاس دہلی میں 3 سے 17 جولائی تک منعقد ہوا جس میں خطرناک صورتحال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا گیا۔ حکومت کے ساتھ مفاہمت کے اظہار کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں حکومت کو ملکی دفاع کے لیے ایک موثر تنظیم کے قیام کی خاطر بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروائی گئی تھی بشرطیکہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے فوری اعلان کے ساتھ ہی مرکز میں ایک عبوری قومی حکومت قائم کی جائے۔ اس قرارداد کے حقیقی مصنف چکرورتی راج گوپال اچاریہ تھے۔ جولائی کے اختتام تک آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس پونا

میں ہوا جہاں اسی قرارداد کی رسمی منظوری دی گئی اسے ہی کانگرس کی جانب سے "پونا پیشکش" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

اس پیشکش کے جواب میں وائسرائے نے ٹوری وزیر خارجہ برائے امور ہند امرے کی ہدایات پر حکومت برطانیہ کے ایماء پر 18 اگست کو ایک اعلان کیا جسے "اگست پیشکش کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک اعلان نامہ شامل تھا۔

" حکومت برطانیہ امن اور فلاحِ ہند کے لیے اپنی ذمہ داریاں کسی ایسے نظام حکومت کو منتقل نہیں کرسکتی جس کے اختیارات کی ہندوستان کی قومی زندگی کے زیادہ اور طاقتور عناصر نفی کر رہے ہیں نہ ہی حکومت برطانیہ ایسے کسی نظام میں فریق بن سکتی ہے جو ان عناصر کو طاقت کے بل بوتے پر اپنا حامی بنائے۔(58)

سادہ لفظوں میں برطانویوں نے کانگرس کی پیشکش ٹھکرا دی۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے فوری اجلاس منعقد کیا اور بیان دیا کہ۔

کانگریس کی تجاویز کا مسترد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان پر بزور شمشیر قبضہ جاری رکھنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔(59)

میلوں میں اکثر و بیشتر یہ دیکھا گیا کہ ٹھگوں کا ایک ٹولہ متحرک رہتا ہے جو سادہ لوح دیہاتیوں کو اپنا شکار بناتے ہیں۔ یہی کچھ مہاتما اور کانگرس ورکنگ کمیٹی مل کر برطانوی حکومت (گو کہ برطانوی سادہ لوح دیہاتی نہیں تھے لیکن مہاتما اور کانگرس کا برطانویوں سے نمٹنے کا بندوبست بالکل ٹھگوں والا ہی تھا) کے ساتھ کرتے رہے تھے۔ اس سے پہلے آپ دیکھ چکے کہ جب معاملات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لینے کا وقت آ گیا، کانگرس نے مہاتما کو سیاسی معاملات سے "الگ" کر دیا۔ اب جب برطانوی نہیں مانے تو مہاتما اور کانگرس کے "اختلافات" ختم ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی اور مہاتما کے درمیان چوہے بلی والا کھیل شروع ہو گیا۔ قرارداد دیکھ لیں۔

ایس ایم نمبو دری پد لکھتے ہیں کہ:

"This open rejection of the congress offer by the British Government once again led to the resolution of conflict between Gandhiji and the Working committee."

کانگرس کی پیشکش اس طرح مسترد ہونے پر ایک بار پھر ورکنگ کمیٹی اور گاندھی کے اختلافات ختم ہوئے:

"The committee called an emergency meeting of the AICC at which president Azad said"

کمیٹی نے ایک ایمر جنسی میٹنگ طلب کی جس میں آزاد نے کہا:

"These events made us decide to again request Mahatma Gandhi to assume the active leadership of the congress I am glad to inform you that he has agreed to do this, as now there is no differences whatsoever between him and the Working committee. "

ان واقعات نے ہمیں یہ فیصلہ کرنے کے قابل کر دیا ہے کہ ہم دوبارہ مہاتما گاندھی سے درخواست کریں کہ وہ کانگرس کی سرگرم قیادت سنبھال لیں۔ میں آپ کو بتاتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ وہ اس پر راضی ہو گئے ہیں اور اب ان کے اور ورکنگ کمیٹی کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہیں رہا۔"

تب ایس ایم نمبودری کے مطابق جو قرارداد پاس کی گئی جسے گاندھی نے کچھ اس طرح ڈرافٹ کیا تھا:

"Committee firmly believes in the policy and practice of non-violence not only in the struggle for swaraj but also, in so far as this may be possible of application in free India."(60)

سادہ لفظوں میں کانگرس کمیٹی ایک بار پھر "عدم تشدد" پر ایمان لے آئی۔

موجمدار کے مطابق بہت جلد گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے درمیان آویزش دوبارہ شروع ہو گئی۔ یہ کشمکش اس وقت ابھری جب 7 دسمبر 1941ء کو جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا اور اس کے بعد ملایا اور سنگاپور کا رخ کیا جس سے جنگ بالکل ہندوستان کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی دونوں کو خطرے کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا تھا چنانچہ ایک مرتبہ پھر گاندھی جی سے کہا گیا کہ وہ کانگرس کی قیادت سے دستبردار ہو جائیں۔

کانگرس اور ورکنگ کمیٹی کے ساتھ گاندھی جی کی وقتاً فوقتاً آویزشیں اور کانگرس سے ان کی جزوی کنارہ کشی اور پھر ان کا اپنے تعمیری کام کی جانب متوجہ ہو جانا ان کی نفسیات کے ایک لطیف نکتے کا عکاس ہے۔ یہ چپقلشیں حقیقی سے زیادہ ظاہری ہوتی تھیں جنھیں وہ کسی مقصد کے حصول کی خاطر انھیں سوچ سمجھ کر پیدا کرتے تھے۔ کانگرس کی قیادت سے ان کا وابستہ ہونا، پھر علیحدہ ہونا اور پھر وابستہ ہو جانا فی الاصل انگریزوں کے خلاف ان کی جنگی چالوں کا ایک حصہ تھا جس کا عدم تشدد کے ارفع اصولوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ای ایم ایس نمبودری پد اس بارے وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The question, at issue between the Congress working Committee

violence in national defiance, but one of how to negotiate with, and put pressure on, the British.

Gandhiji advocacy of non-violence pure and simple, his determination to fight the war efforts in a non-violent way, proved effective as a form of pressure against the British. The working Committee, therefore, always put itself under his leadership whenever there was necessity for giving a threat of struggle or for organizing a struggle.

On the other hand, whenever there was an opportunity for negotiations with the British, the Working Committee took a 'realistic position' that negotiation Could be Conducted only on the basis of offering India's Cooperation with British if power is transferred. On all such occasions, Gandhiji himself asked that he should be relieved of leadership and to which the working Committee readily agreed."

"کانگرس ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی کے درمیان اصل مسئلہ اخلاقی یا قومی دفاع کے لیے طاقت کے استعمال سے متعلق ہرگز نہیں تھا بلکہ اصل اختلاف یہ تھا کہ انگریزوں سے بات چیت کیسے کی جائے اور ان پر دباؤ کیونکر ڈالا جائے۔

گاندھی جی کی تبلیغ عدم تشدد اور جنگ کو غیر متشدد انداز میں لڑنے کا عزم انگریزوں کے خلاف دباؤ کے لیے موثر حربہ ثابت ہوا۔ چنانچہ جب کبھی بھی جدوجہد کی دھمکی دینے یا جدوجہد شروع کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، ورکنگ کمیٹی خود کو فوراً گاندھی جی کی قیادت کی تحویل میں دے دیتی تھی۔

دوسری جانب جب کبھی انگریزوں کے ساتھ بات چیت کا موقع آتا تھا ورکنگ کمیٹی فوراً "حقیقت پسندانہ "انداز اپنالیتی کہ بات چیت صرف اس بنیاد پر ہوگی کہ ہندوستان کے تعاون کی پیشکش انتقالِ اقتدار کے ساتھ مشروط ہوگی۔ ایسے تمام مواقع پر گاندھی جی خود کہتے تھے کہ انھیں قیادت سے سبکدوش کر دیا جائے جس سے ورکنگ کمیٹی فورا متفق ہوجاتی تھی۔"(61)

ہارن مکرجی اپنی کتاب "گاندھی جی" میں لکھتے ہیں:

"گاندھی جی یوں مظاہرہ کر رہے تھے جیسے وہ بیک وقت ایک صوفی سنت اور سیاستدان ہوں اور وقتاً فوقتاً نظریاتی تبلیغ سے قطع نظر، وہ اور گانگرس فی الحقیقت کسی اخلاقیات یا قومی دفاع میں عدم تشدد کے استعمال سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے بلکہ انھیں زیادہ دلچسپی ان موثر حربوں سے تھی جو برطانیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ نہایت آسانی سے ایک موقف کو دوسرے موقف میں بدل لیا جاتا تھا۔ جب کبھی بات چیت کے ذریعے معاملہ کرنے کے امکانات روشن نظر آتے، کانگرس عدم تشدد کا نام تک لینا ترک کر دیتی تھی۔ لیکن جب برطانیہ کو دھمکانا مقصود ہوتا تو گاندھی جی کو مع عدم تشدد دوبارہ طلب کر لیا جاتا۔ یہ ایک ایسا انتظام تھا جس میں گاندھی جی اپنے ساتھ کوئی تشدد کیے بغیر فریق بن سکتے تھے۔ کیونکہ وہ نہ تو مکمل سیاستدان تھے اور نہ کوئی ثابت قدم صوفی۔

گاندھی جی کی کانگرس سے علیحدگی یا ریٹائرمنٹ حقیقتاً اس لیے بے معنی تھی کہ خواہ وہ کانگرس کے اندر ہوتے یا باہر ورکنگ کمیٹی ان کی ہدایت کے بغیر ایک قدم تک نہیں اٹھاتی تھی۔ چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے انھیں کانگرس کی عملی قیادت سے بری الذمہ کرکے اپنے عظیم آدرش کو اپنے طریقہ سے حاصل کرنے کے لیے آزاد کیا تھا، یہ عمل دھوکے یا ڈھونگ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔"(62)

1941ء اور 42 میں گاندھی جی اور کانگرس کے کارکنوں سے معاملات طے کرنے کے متعلق نمبو دری پد لکھتے ہیں کہ:

"It was for the specific purpose of enabling the Congress working Committee to carry on the negotiations that Gandhiji gave up his leadership of the Congress towards the end of 1941 and in the beginning of 1942.while the negotiations were formally conducted by the Congress president and the working Committee, Gandhiji advice was nevertheless sought at every stage. While Gandhiji himself kept formally out of the negotiations, his was the voice which was decisive in shaping the policy of the Congress negotiators. Furthermore, the moment of negotiations, broke down, the moment it was Clear that the British were not prepared to grant the minimum that was demanded of the by Congress, Gandhiji once again Came to the forefront as the leader of the anti-war anti-

British mass movement."

"خاص اس مقصد کے لیے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی مذاکرات جاری رکھنے کے قابل ہو سکے، گاندھی جی نے 1941ء کے اختتام اور 1942ء کے آغاز میں کانگرس کی قیادت چھوڑی۔ جب کانگرس کے صدر اور ورکنگ کمیٹی با قاعدہ طور پر مذاکرات کر رہے تھے تب بھی ہر قدم پر گاندھی جی سے ہدایت لی جاتی تھی۔ اگر چہ گاندھی جی نے رسمی طور پر خود کو مذکرات سے باہر رکھا لیکن کانگرس کے مذاکرات کی پالیسی تشکیل دینے میں فیصلہ کن آواز انھی کی تھی۔ لیکن جو اور بات چیت کا سلسلہ ٹوٹا، جونہی یہ واضح ہوا کہ انگریز کا کانگرس کے پیش کردہ کم سے کم مطالبات تسلیم کرنے پر بھی تیار نہیں گاندھی جی فوراً جنگ اور انگریزوں کے خلاف عوامی تحریک کے رہنما بن کر محاذ پر آ گئے۔" (63)

یہ ہے مہاتما کے عدم تشدد کی حقیقت۔ "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں گرفتار ہوئے۔ مئی 1942ء میں قید سے رہائی ہوئی۔ مہاتما نے رہا ہو کر ایک اور قلابازی کھائی اور عدم تشدد کو ایک بار پھر بھول گئے۔

مہاتما نے اپنے نئے لائحہ عمل کا آغاز ایک پریس انٹرویو سے کیا جو انھوں نے لندن کے اخبار دی نیوز کرونیکل، کے نمائندے سٹیورٹ گیلڈر کو دیا۔

سٹیورٹ گیلڈر سے ان کی بات چیت کا مفہوم یہ تھا کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ 1942ء سے 1944ء تک دنیا بہت بدل چکی ہے اور اب سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کرنا ممکن نہیں۔ مہاتما نے (عدم تشدد بھول کر) اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ کانگرس کو ہدایت کریں گے کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا فوراً اعلان کر کے ایک قومی حکومت تشکیل دی جائے تو اسے جنگی کارروائیوں میں بھرپور تعاون کرنا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر وہ وائسرائے سے ملاقات کر سکے تو انھیں بتائیں گے کہ ان کا مقصد عسکری کاروائیوں میں اتحادیوں کی مدد کرنا ہے نہ کہ رکاوٹیں ڈالنا۔

تقریباً یہی بات انھوں نے وائسرائے کی طرف دستِ تعاون بڑھا کر مندرجہ ذیل خط میں بھی لکھی:

"I am prepared to advise the working committee to declare that, in view of the changed conditions, mass civil disobedience, envisaged by the resolution of August 1942, cannot be offered and that full cooperation in the war effort should be given by the congress, if a declaration of immediate Indian independence is made and a national government responsible to the central assembly be formed

subject to the proviso that during the pendency of war, the military operations should continue as at present, but without involving any financial burden on india, if, there is a desire on the part of the british government for a settlement, friendly talks should take the place of correspondence. but I am in your hands."

" میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کو ہدایت کرنے کے لیے تیار ہوں کہ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اگست 1942ء کی قرارداد کے تحت منظور کردہ سول نافرمانی کی تحریک اب نہیں چلائی جاسکتی اور کانگرس حکومت کو جنگی کارروائیوں میں پورا تعاون کرنا چاہیے بشرطیکہ ہندوستان کی آزادی کا فوری اعلان کیا جائے اور ایک قومی حکومت قائم کی جائے جو مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہو۔ مزید شرط یہ رکھی جائے کہ جنگ کی طوالت کے دوران فوجی کارروائیاں حالیہ طور پر جاری رہیں لیکن ان سے ہندوستان پر کوئی مالی بوجھ نہ پڑے۔ اگر حکومتِ برطانیہ کسی معاہدے کی خواہش مند ہے تو دوستانہ مذاکرات خطوط کی جگہ لے سکتے ہیں لیکن میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں۔"(64)

یہ وہ عدم تشدد والے مہاتما ہیں جو دوسروں کو میدان جنگ میں بھی یہ تبلیغ کرتے نظر آئے کہ ہتھیاروں کے بجائے عدم تشدد کے ہتھیاروں سے لڑو، جو کھل کر کہتا ہے کانگرس کو اس وقت تک اقتدار نہیں حاصل کرنا چاہیے جب تک عدم تشدد کے طریقوں سے عوام کنٹرول کرنے کے قابل نہیں ہوتی، جو افغانیوں کی مداخلت پر مرجانا پسند کرتا ہے لیکن ہتھیار اٹھانے کے خلاف ہے لیکن یہی مہاتما، پاکستان سکیم حقیقت بن جانے پر تو باچاخان اور غنی خان کے سامنے اپنے عدم تشدد کو قربان کرنے پر تیار نظر آتے ہیں۔

وہ مہاتما جو بنگال کے علیحدہ ملک بننے کی صورت میں 45 فیصد ہندو اقلیت، جو سیاسی، معاشرتی اور معاشی حوالے سے 55 فیصد مسلم اکثریت سے کہیں آگے تھی، اس کے لیے انتظامیہ اور مقننہ میں دو تہائی اختیارات مانگتا ہے اور کل ہند سطح پر کہیں زیادہ پسماندہ 25 فیصد مسلم اقلیت کو وہ حقوق دینے تک کو تیار نہیں۔ اس کے باوجود ہمیں بتایا جاتا ہے مہاتما کی سیاست جمہوری اور مذہبی تعصب سے بالاتر تھی اس مہاتما نے پاکستان کے لیے جان دی جو ہمارے وجود میں آنے سے اپنے برانڈ عدم تشدد تک کو کھلے عام قربان کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکے۔

وہ عدم تشدد والے مہاتما جو کلکتہ قتل وغارت پر پریشان ہونے کے بجائے میز پر مکے مار مار کر ویول کے سامنے کہتے ہیں کہ ہندوستان کو خون میں نہانا پڑا تو نہائے۔ اور بجائے بامقصد بات چیت کے پوری وکالت کرتے رہے

کہ کسی طرح اقتدار کانگرس کی بے رحم اکثریت کے حوالے کیا جائے۔
ویول کے بعد بھی جب ان کے فرمائشی پروگرام پر ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آئے تب بھی یہی کوشش کرتے رہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ماؤنٹ بیٹن کا کردار انتہائی جانبدارانہ رہا، اپنی ایک ملاقات میں گاندھی کی ایک "تجویز" پر کہ اقتدار کانگرس کے حوالے کیا جائے، سن کر لکھتے ہیں کہ گویا مجھ میں قوت گویائی نہ رہی۔ ماؤنٹ بیٹن پیپرز کے ڈاکیومنٹ 131 اور 165 میں گاندھی کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کی روداد میں ماؤنٹ بیٹن کہتے ہیں۔
"تب انھوں نے مجھے کو عبوری حکومت کو مستحکم بنانے کی ہدایت کی اور کہا کہ اس کو آئندہ 14 ماہ ٹھیک طریقے سے کرنے کے قابل بنایا جائے ان کے خیال کے مطابق اس کے بعد اقتدار اسی عبوری حکومت کو سونپا جائے۔ اسی مرحلہ پر لارڈ اسمے اور میں نے (یعنی ہم دونوں نے) کہا کہ اس کا مطلب ہے کہ اقتدار ایک پارٹی یعنی کانگرس کے حوالے کر دیا جائے، اس طرح تو دوسری پارٹی مسلم لیگ کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا اور وہ ایسا خون خرابہ شروع کر دے گی جو خانہ جنگی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔
مسٹر گاندھی کے چہرے پر عیارانہ تبسم نمودار ہوا اور کہا کہ مسٹر جناح اس بیان پر دستخط کر دیں جو ان کو ارسال کیا جا رہا ہے تو اس صورت میں سیاسی مقصد کے لیے طاقت کا استعمال نہیں کر سکیں گے۔
میں یہ بات ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ان کی تجویز سن کر مجھ میں قوتِ گویائی نہ رہی۔"
ماؤنٹ بیٹن کا مزید کہنا تھا کہ "میں یہاں یہ بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں اس اخلاق باختہ تجویز کو سن کر سکتے میں آگیا اور ان کی باتوں پر حیرانی سے انگلیاں ہلاتا رہا۔ لیکن انھوں نے میری حیرانی پر اغماض برتا اور مسکراتے رہے۔"
لیکن ایسی باتوں سے پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں نہ ہی کوئی ایسی بات سوچنے کی ضرورت ہے جس سے باپو کی عظمت پر آنچ آئے۔ باپو کی "عظمت مسلمہ" ہے کیوں کہ پوری دنیا گاندھی کو جانتی ہے جب "سب لوگ" یہی کہتے ہیں تو اس سے بڑھ کر بھی کسی "دلیل" کی ضرورت ہے؟
حقیقت یہ ہے جہاں تک ہندوستان کی آزادی کے لیے کی گئی ان کی کوششوں کا تعلق ہے اس حوالے سے انھیں ہندو ضرور کریڈٹ دے سکتے ہیں کہ بطور ایک شاطر سیاستدان اس نے برطانویوں کے خلاف ان کی آزادی کی جنگ لڑی۔ انسانیت کے لیے مہاتما کی کونسی خدمات ہیں؟ کیا کنٹریبیوشن ہے؟ جس کو بنیاد بنا کر مہاتما کی عظمت کو ہم "مجبوروں" پر بھی مسلّط کیا جائے؟
مغرب کو مخاطب کر کے عدم تشدد کے بارے میں خط تو ضرور لکھے۔ جنگ سے اکتائے کسی بھی فرد کو یقیناً

ایسی باتیں اچھی لگتی ہیں کہ ہتھیاروں سے نہیں عدم تشدد سے لڑو، لیکن اسی جنگ کے دوران مہاتما کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ جنگ سے پہلے اور جیل سے رہا ہونے کے بعد اسی جنگ میں برطانویوں کو جنگ میں اپنی حمایت کا یقین دلاتے رہے۔اس طرز عمل کو منافقت کے سوا کوئی نام دیا جا سکتا ہے؟

ان تمام حقائق کی روشنی میں سیر وائی اور ویول سے اتفاق کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ مہاتما عدم تشدد کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے اور اُن کے عدم تشدد کا کسی اعلیٰ وارفع اخلاقی اصول سے ہر گز کوئی واسطہ نہیں تھا۔

مہاتما کے مثالی گاؤں اور چرخے کا حال بھی اوپر بیان ہو چکا۔اس پر مزید کچھ کہنے یا لکھنے کے بجائے میں پڑھنے والوں پر چھوڑتا ہوں کہ بہتر ہے خود ہی پڑھ کر مہاتما کی 'مہاتمائیت' کا فیصلہ کر لیں۔

حوالہ جات

1. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ 182، 181
2. تقسیم ہند 1947ء کیا اصلاً مسلمان ہی اس کے ذمہ دار ہیں؟ منصور احمد انڈین مسلم صفحہ نمبر 236 تا 240
3. گاندھی ایز آئی نو ہم، اندولال یاجنک
4. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر 193
5. انڈین سٹر گل از بوس، جناح اور گاندھی ایس کے موجمدار ترجمہ ثوبیہ طاہر صفحہ 150
6. کراس روڈز از سبھاش چندر بوس، صفحہ نمبر 328
7. ایضاً۔ صفحہ 327
8. سیر وائی صفحہ نمبر 23-24
9. ایضا صفحہ نمبر 57
10. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس صفحہ نمبر 176
11. ایضا صفحہ نمبر 191
12. مہاتما گاندھی کے نظریات از ریورینڈ سی ایف اینڈریوز، صفحات 186- 188 از موجمدار "جناح گاندھی" صفحہ نمبر 14
13. مہاتما از ٹنڈولکر والیوم 5
14. ٹنڈولکر جلد 5 صفحہ نمبر 276
15. ٹنڈولکر جلد ہفتم صفحہ نمبر 20
16. مہاتما گاندھی ۔۔۔۔ آخری دور، جلد دو صفحہ 255 از ایس کے موجمدار صفحہ نمبر 24
17. دھول کے پھول از کسم نائر صفحہ 187 از موجمدار "جناح اور گاندھی" صفحہ نمبر 26، 25
18. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر 192-94)
19. گاندھی ایز آئی نو ہم، اندولال یاجنک صفحہ نمبر 137
20. ایضا صفحہ نمبر 140
21. ایضا صفحہ نمبر 233 تا 235

22. ایضاً صفحہ نمبر 241 تا 243

23. ایضاً صفحہ نمبر 245 تا 247

24. ایضاً صفحہ نمبر 287

25. از ایس کے موجمدار صفحہ نمبر 110-111

26. کانگرس کی تاریخ از پتہ بھائی ستہ رمیا، جلد دوم، صفحہ 218 از ایس کے موجمدار صفحہ نمبر 237

27. سیتارمیہ جلد 2 صفحہ 191 صفحہ 192) از موجمدار جناح گاندھی صفح نمبر 17

28. عبدالغفار خان -ڈی جی ٹینڈولکر پہلا ایڈیشن 1967ء صفحات 424-25

29. موجمدار، جناح گاندھی صفحہ 238

30. مہاتما از ٹنڈولکر جلد 1 صفحہ نمبر 346

31. مہاتما از ٹنڈولکر جلد اول صفحہ 348

32. ایس کے موجمدار صفحہ نمبر 76-77

33. موجمدار صفحہ نمر 77

34. جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ صفحہ نمبر 57

35. مہاتما جلد 3 از ٹنڈولکر صفحہ نمبر 20

36. پاکستان آر پارٹیشن از ڈاکٹر امبیڈکر

37. مہاتما جلد اول صفحہ نمبر 424

38. سیروائی صفحہ نمبر 189

39. جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ صفحہ نمبر 206

40. موجمدار صفحہ نمبر 81، 83 84

41. ہند کی تاریخ بعد از غدر از موجمدار صفحہ نمبر 84-85

42. مہاتما جلد دوم 72

43. ایضاً 73

44. از موجمدار صفحہ نمبر 137

45. از موجمدار صفحہ نمبر 140-141

46. بیورلے نکولس صفحہ نمبر 194

47. ایضاً

48. ٹنڈولکر جلد سوم از موجمدار صفحہ نمبر179-180

49. لاسٹ ڈیز آف برٹش راج اموزلے صفحہ نمبر16

50. انسائیکلوپیڈیا قائداعظم مرتبہ زاہد حسین انجم از پروفیسر محمد مظفر صفحہ نمبر 29

51. مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ۔۔ عبدالوحید خان صفحہ نمبر408 تا412 از قائداعظم اور گاندھی پروفیسر محمد مظفر صفحہ نمبر23

52. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر177 تا180

53. مہاتما از ٹنڈولکر جلد5 صفحہ نمبر223

54. ٹنڈولکر جلد5 صفحہ نمبر 226

55. ٹنڈولکر، جلد5 از موجمدار صفحہ نمبر234

56. کانگرس کی تاریخ از پٹہ بھائی ستہ رمیا، جلد دوم، صفحہ218 از ایس کے موجمدار صفحہ نمبر237

57. ایس ایم نمبودری پد، "گاندھی اور ازم" صفحہ نمبر86

58. مہاتما از ٹنڈولکر، جلد5 صفحہ نمبر317 از موجمدار صفحہ نمبر240

59. مہاتما از ٹنڈولکر، جلد5 از موجمدار صفحہ نمبر240

60. ایس ایم نمبودری پد، "گاندھی اور ازم" صفحہ نمبر87

61. ایس ایم نمبودری پد، "گاندھی اور ازم" صفحہ نمبر90

62. از موجمدار صفحہ نمبر242-243

63. ایس ایم نمبودری پد، "گاندھی اور ازم" صفحہ نمبر91

64. مہاتما از ٹنڈولکر جلد6 صفحہ نمبر369

باب۔۔۔4

ولی خان کے الزامات کا جواب

پس منظر

ولی خان کی کتاب اور الزامات کے ذریعے جناح صاحب کو برطانوی ایجنٹ ثابت کرنے کی کوشش کرنے والوں کو جب دیکھتا ہوں تو ہمیشہ مشتاق یوسفی کا ایک فقرہ ذہن میں آتا ہے: "مجھے حیرت اس بات پر نہیں ہوتی کہ لوگ خونی بواسیر کا علاج تعویذ گنڈوں سے کرتے ہیں مجھے حیرت ٹھیک ہونے والوں پر ہوتی ہے۔" اسی طرح مجھے ولی خان کے بے سروپا الزامات پر نہیں، ان الزامات کو صحیح سمجھنے والوں پر ہوتی ہے۔ ولی خان نے جس ذہنی کیفیت سے گزر کر وہ کتاب لکھی تو سمجھ بھی آتی ہے باچاخان اور اس کے وارثوں کی جاگیر دارانہ انا نے وہ شکست قبول نہیں کی جو انھیں جناح صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

ولی خان کی کتاب پر بات کرنے سے پہلے اس پورے معاملے کے پس منظر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ کانگرس نے جب ان کی توقعات کے برعکس تقسیم کا منصوبہ قبول کیا تو باچاخان پر سکتہ طاری ہو گیا اور وہ توبہ توبہ کا ورد کرنے لگے۔

ڈی۔جی۔ٹنڈولکر اس بارے لکھتے ہیں کہ:

> " Both Sardar Patel and Rajagopalachari strongly favoured holding referendum in the Frontier province. Ultimately, when the Working Committee accepted the partition and the referendum in the Frontier Province, Abdul Ghaffar Khan told Gandhi and the Working Committee "We Pakthun stood by you and had undergone great sacrifices for attaining freedom, but you have now deserted us and

thrown us to the Wolves. We shall not agree to hold referendum because we had decisively won the elections on the issue of Hindustan versus Pakistan and proclaimed the Pakhtun view on it to the world. Now as India has disowned us, why should we have a referendum on Hindustan and Pakistan? Let it be on Pakhtunistan or Pakistan."

Abdul Ghaffar emerged from the committee meeting numbed and dejected. It was a death warrant to the Pakhtuns. He sat on the steps, uttering "Toba Toba". He records "the decision about partition and referendum in the Frontier Province was taken by the High Command without consulting us. Only Gandhiji and I opposed it. Sardar Patel and Rajagopalachari were in favour of partition and holding referendum in our province. The Sardar said I was worrying over nothing.

Maulana Azad was sitting near me. Noticing my dejection he said to me "you should now join Muslim League". It pained me to find how little these companions of ours had understood what we had stood for and fought for all these years. Did they imagine we would compromise our principles for the sake of power?"Mahatmaji, you have thrown us to the wolves" I bitterly complained to Gandhiji after the Working committee's decision. With an aching heart, Gandhiji replied "he was sure that if the Frontier Province were not given a square deal or if the Khudai Khidmatgars were oppressed, India would feel in honour bound to come to their aid, and he for once would not hesitate to advise Indian Government to treat it as casus belli.

Gandhiji had latter repeated that statement to my son. When Ghani asked him what would happen to his non-violence in that event, Gandhiji had told him not to worry about his non-violence. "I am

non-voilent,the Government is not."

"سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ، دونوں نے صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے انعقاد کی پُرزور حمایت کی۔ بالآخر جب ورکنگ کمیٹی نے تقسیم اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم منظور کیا، عبدالغفار نے گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کو بتایا "ہم پختونوں نے آپ کا ساتھ دیا اور حصول آزادی کے لیے عظیم قربانیاں دیں لیکن اب آپ نے ہمیں چھوڑ دیا اور بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا۔ ہم ریفرنڈم پر راضی نہیں ہوسکتے کیونکہ ہم ہندوستان بمقابلہ پاکستان کے ایشو پر انتخابات میں فیصلہ کن کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور اس پر پختون نقطہ نظر سے دنیا کو آگاہ کر چکے ہیں۔ اب جب ہندوستان نے ہمیں رد کر دیا ہے، ہم ہندوستان اور پاکستان کی بنیاد پر ریفرنڈم کیسے قبول کرلیں؟ یہ پختونستان یا پاکستان پر ہونا چاہیے"

عبدالغفار خان میٹنگ میں سے چپ چاپ اور افسردہ دل ہو کر چلے گئے۔ یہ پختونوں کے لیے موت کا پروانہ تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے "توبہ توبہ"۔ انھوں نے کہا "ہائی کمان نے تقسیم اور صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے متعلق فیصلہ ہمارے ساتھ مشورہ کیے بغیر کیا۔ صرف گاندھی جی اور میں نے اس کی مخالفت کی۔ سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ تقسیم اور ہمارے صوبے میں ریفرنڈم کے حق میں تھے۔ سردار نے کہا، آپ خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد میرے نزدیک بیٹھے تھے۔ میری افسردگی دیکھ کر انھوں نے مجھ سے کہا "اب آپ کو مسلم لیگ میں شامل ہو جانا چاہیے" اس سے مجھے دکھ ہوا کہ ان برسوں میں ہم جس مقصد کے لیے کھڑے رہے اور جدوجہد کی اس سے ہمارے ان ساتھیوں کی آگاہی کس قدر نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیا ان کا خیال ہے کہ ہم اقتدار کی خاطر اصولوں پر سمجھوتہ کرلیں گے "مہاتما جی آپ نے ہمیں بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے۔" ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کے بعد میں نے گاندھی جی سے سخت شکایت کی۔ دکھی دل کے ساتھ گاندھی جی نے جواب دیا، انھیں یقین ہے کہ اگر صوبہ سرحد کے ساتھ حسن سلوک نہ کیا گیا یا خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا گیا تو ہندوستان ان کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھے گا۔ اور میں ہندوستانی حکومت کو یہ مشورہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ وہ جنگ سمجھ کر اس سے عہدہ برآ ہو۔

بعدازاں گاندھی جی نے یہ بیان میرے بیٹے غنی کے سامنے دہرا دیا۔ جب غنی نے ان سے پوچھا، تب ان کے عدم تشدد کا کیا بنے گا، گاندھی جی نے اسے بتایا کہ میرے عدم تشدد سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں غیر متشدد ہوں، حکومت نہیں۔"(1)

تقریباً ایسے ہی ملتے جلتے الفاظ مولانا آزاد نے بھی لکھے مولانا کے مطابق باچاخان کہنے لگے کہ میرے دشمن مجھ پر ہنسیں گے کہ ہم نے ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیا اب ہمیں اکیلا چھوڑا جارہا ہے:

"ان پر سکتہ طاری ہوگیا اور وہ کئی منٹ تک ایک لفظ بھی ادانہ کر سکے۔ پھر انھوں نے ورکنگ کمیٹی سے درخواست کی اور اسے یاد دلایا کہ انھوں نے ہمیشہ کانگرس کی حمایت کی۔ اگر اب کانگرس نے انھیں چھوڑ دیا تو فرنٹیئر کا ردِ عمل خوفناک ہوگا۔ میرے دشمن مجھ پر ہنسیں گے حتیٰ کہ میرے دوست کہیں گے، جب تک کانگرس کو فرنٹیئر کی ضرورت تھی اس نے خدائی خدمتگاروں کی حمایت کی۔ جب کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا چاہا اس نے فرنٹیئر اور اس کے لیڈروں کے ساتھ مشورہ کیے بغیر تقسیم کی مخالفت ترک کر دی۔۔ خان عبدالغفار خان نے بار بار کہا، اب کانگرس نے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے آگے دال دیا تو فرنٹیئر اسے غدارانہ فعل قرار دے گا۔"(2)

اپنی آپ بیتی میں بھی یہی کچھ لکھتے نظر آئے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمن کے حوالے کر دیا۔

"مجھے افسوس اور دکھ اس بات سے ہے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے لیے کوئی غیرت نہ دکھائی اور ہماری حقیر سی امداد کے لیے بھی، جس کی ہمیں ان سے توقع تھی، ہمارے آڑے نہ آئی۔ اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا، حالانکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی سنگ دلی، بے رخی، اور بے حسی آسام کے صوبے کے حق میں ایسی نہیں تھی، جبکہ وہاں کے وزیراعظم گوپی ناتھ باردولائی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کر دیا کرپس لارنس پلان 1946ء اور شور مچا تھا۔ باردولائی کی چیخ و پکار اور شور کی وجہ سے کانگرس اس بات پر اڑ گئی اور گروپ بندی کی وہ سکیم نہیں مانی تھی۔ حالانکہ میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ جب مجھ سے گاندھی جی نے دریافت کیا تو میں نے انھیں کہہ دیا تھا کہ تقسیم کے بجائے ہر ایک سکیم اچھی ہے۔ اس حال میں اور ایسے سلوک کے بعد ایک پٹھان کی حیثیت میں ہم سے یہ پوچھنا بے محل تھا کہ آیا ہم ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ کانگرس نے، جو ہندوستان کی نمائندہ جماعت تھی ہمیں نہ صرف اپنے سے دور ہی پھینک دیا تھا۔ بلکہ ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ ان سے ملنا تو ہماری پٹھانی غیرت اور اخلاقیات و روایات کے لیے ایک طرح کی موت تھی۔"(3)

باچاخان کی ہی کتاب سے ایک اور اقتباس پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ پاکستان سے کس قدر "شدید محبت" کرتے تھے:

"میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں، کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گھٹی میں نفرت، بغض و حسد، کینہ و دشمنی اور حقارت کے جذبات بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی مرہون منت ہے پاکستان انگریزوں نے اس لیے بنایا کہ زندگی بھر کے لیے ہندو اور مسلمانوں میں فسادات ہوتے رہیں۔"(4)

"تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی بارے تو سنا تھا لیکن یہ پہلی دفعہ پڑھ اور سن رہے ہیں کہ پاکستان بنانے کے پیچھے انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان زندگی بھر آپس میں لڑتے رہیں۔ کوئی احمق ترین بندہ بھی ایسا نتیجہ اخذ نہیں کر سکتا جو باچاخان کر رہے تھے۔ جب تک انگریز یہاں موجود تھے اپنی حکومت بر قرار رکھنے کے لیے تو ایسی کسی پالیسی کا ہونا عین ممکن ہے لیکن جب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے گئے تو اس میں انگریزوں کا کیا فائدہ کہ ہندو مسلم آپس میں لڑیں؟

یہاں ایک بات غور کرنے کے قابل ہے کہ آج کل کچھ مخصوص حلقوں کی طرف سے تسلسل کے ساتھ ایک دہائی دی جاتی ہے کچھ رٹے رٹائے جملے بولے جاتے ہیں مثلاً ہمیں غدار سمجھا گیا، ہمیں قبول نہیں کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔۔۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کو وجود میں آتے ہی بھیڑیے سے تشبیہ دی جارہی ہے، پاکستان کو دشمن کہا جارہا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے اپنے وجود میں آنے سے پہلے پاکستان نے ان کے کونسے حقوق صلب کیے تھے؟

کوئی شک نہیں یہ ملک سب کا ہے ان کا بھی ہے جنھوں نے ایک وقت میں اس کی مخالفت کی لیکن بحیثیت ایک ذمہ دار شہری دہائی دینے والوں کی کیا کوئی ذمہ داری نہیں بنتی کہ وہ اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھیں؟ ایک ایسے وقت میں جب چاروں طرف سے جب پاکستان اور قائداعظم کو تختۂ مشق بنایا جارہا تھا آپ مخالفین کے ساتھ مل کر اس کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور بجائے اپنے اس عمل پہ شرمندہ ہونے یا اس کی تلافی کرنے کے اگلے کو کٹہرے میں کھڑا کر رہے ہیں۔ اگر باچاخان ذرا بھی فہم و فراست کا مالک ہوتا تو بدلتے حالات کو سمجھ کر اپنے موقف کو نئے حقائق کے مطابق ڈھالتا جیسا کہ مولانا آزاد نے اسے مشورہ بھی دیا لیکن جاگیر دارانہ انا کا جو آڑے آگئی۔

ذرا "عدم تشدد" کے دیوتا کا بیان بھی ایک بار پھر پڑھ لیں جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران مغربیوں کو خط لکھتا ہے کہ نازیوں کو سب کچھ لوٹنے دو، مر جاؤ، نقصان قبول کر لو لیکن تم لوگوں نے تشدد کا جواب تشدد سے

نہیں دینا۔ جو مہا منافق کہتا رہتا ہے کہ کانگرس کو اس وقت تک اقتدار حاصل نہیں کرنا چاہیے جب تک عدم تشدد کے ذریعے عوام پر کنٹرول کرنے کے قابل نہیں ہو جاتی ایک ایسی مملکت کے بارے میں رائے دیتے ہوئے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی، اپنے اس "برانڈ" یعنی عدم تشدد کو بھی قربان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

تین جون کا پلان جسے لیگ اور گانگرس دونوں نے قبول کیا، سرحد کانگرس آل انڈیا کانگرس کا ہی حصہ تھا لیکن "باپو" اور اس کے "فقیر" نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے باچاخان کو اختیار دیا کہ وہ صوبے میں صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو اقدام مناسب سمجھیں کریں۔

حالانکہ اس سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے جو پلان برطانیہ بھیجا اس میں ہر صوبے کو تین چوائس دیے گئے تھے کہ ہندوستان میں شامل ہوں، پاکستان میں یا علیحدہ ریاست۔۔ اس پر گانگرس نے شدید ردِ عمل دیا اور نہرو نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ:

> "اس سے ہندوستان بلقان کی ریاستوں کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور یہاں بہت سارے السٹر (شمالی آئرلینڈ) پیدا ہو جائیں گے۔ کانگرس کا مطالبہ تھا کہ صوبے کو آزاد ریاست بن جانے کی جو تیسری چوائس ختم کر دی جائے۔
>
> کانگرس کے شدید ردِ عمل کی وجہ سے یہ منصوبہ ترمیم کے لیے واپس لندن بھیجا گیا اور خود ماؤنٹ بیٹن کو لندن جا کر برطانوی کابینہ کو اس ترمیم پر قائل کرنا پڑا اور جاری ہونے والے تین جون کے اعلان میں صوبوں کے لیے آزاد رہنے کی تیسری چوائس ختم کر دی گئی۔"(5)

لیکن سرحد کے معاملے میں کانگرس کے اصول بدل گئے۔

مولانا آزاد اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "کانگرس ورکنگ کمیٹی نے خان عبد الغفار خان کو یہ اختیار دیتے ہوئے، فرنٹیئر کانگرس کے فیصلے کی توثیق کر دی، کہ وہ صوبے میں صورت حال سے عہدہ آبر ہونے کے لیے جو اقدام مناسب سمجھیں کریں۔ اب فرنٹیئر کانگرس نے آزاد پٹھان مملکت کی تخلیق کا مطالبہ کر دیا جس کا آئین اسلام کے تصورِ جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف پر ہو گا۔"(6)

اس پر جناح صاحب کا ردِ عمل کچھ اس طرح تھا۔

> "3 جون کا پلان قبول کرنے کے بعد سرحد کانگرس کی طرف سے پٹھانستان کی قرارداد وعدہ خلافی ہے" جناح نے مزید کہا: "برطانوی سکیم کے مطابق سرحدی عوام کے سامنے اب کوئی تیسری راہ عمل نہیں ہے۔ آل انڈیا گانگرس کمیٹی کی طرف سے برطانوی سکیم کی منظوری

کے بعد سرحد کانگرس کے لیے ہر فیصلہ کی پابندی اور احترام ضروری ہو چکا ہے کیونکہ وہ آل انڈیا کانگرس کی ایک شاخ ہے۔ جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور کانگرس ورکنگ کمیٹی نے برطانوی سکیم منظور کی تو سرحد کانگرس کے نمائندے بھی اجلاس میں موجود تھے۔ لہٰذا اب کانگرس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ برطانوی سکیم کے مندرجات کا احترام کرے۔ لیکن اس کے برعکس گاندھی اپنی پراتھناؤں میں جن نظریات کی ترجمانی کرتے رہے ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ خان برادران برطانوی سکیم کو ناکام بنانے کی شہہ پائیں، سرحدی عوام کو بھڑکائیں اور اس طرح سرحدی مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کریں۔"(7)

گاندھی اس دوران کیا کرتے رہے اور اپنی پراتھناؤں میں کس قسم کے نظریات کی ترجمانی کرتے رہے؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

ایلن کیمبل جانسن "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ خان صاحب کی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"When Khan Sahib turned to the question of Pathanistan the discussion became somewhat disjointed and explosive. Gandhi has for some time been actively interested in this concept and has lately been stressing its virtues with renewed vigour. If it were to prevail it would create a new frontier nationailsm cutting across the Province's communal and political solidarity with Pakistan." if you destroy the Pathan nation " warned Khan Sahib, "terrible thing will happen"

"جب ڈاکٹر خان صاحب نے پٹھانستان کا ذکر کیا تو بحث قدرے بے ربط اور دھماکہ خیز ہو گئی۔ کچھ عرصہ سے گاندھی اس تصور میں سرگرمی سے دلچسپی لے رہا تھا اور اب وہ اس کے فوائد پر پہلے سے زیادہ پرجوش طریقے سے زور دے رہا تھا۔ اگر یہ تصور قبول کر لیا جائے تو اس سے ایک نیا فرنٹیئر نیشنلزم پیدا ہو جائے گی جو صوبہ کا پاکستان کے ساتھ فرقہ وارانہ اور سیاسی یک جہتی کے منافی ہو گا۔ خان صاحب کی دھمکی یہ تھی کہ اگر آپ نے پٹھان قوم کو تباہ کر دیا تو اس کے خوفناک نتائج برآمد ہونگے۔"(8)

چوہدری محمد علی "ظہور پاکستان" میں ایک واقعہ درج کرتے ہیں جسے پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ باپو پاکستان سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لیے اس وقت کس قسم کے نظریات کی آبیاری کر رہے تھے:

"مئی کو عبد الغفار خان نے بڑے حسرت واندوہ کے ساتھ کہا کہ بہت جلد ہم ہندوستان میں اجنبی بن جائیں گے۔ آزادی کے لیے ہماری طویل جدوجہد پاکستان کی محکومی کی صورت میں نکلے گی۔ ہم باپو (گاندھی) سے دور ہو جائیں گے۔۔بھارت سے اور آپ سب سے دور ہونگے۔کون جانتا ہے کہ مستقبل میں ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟جب گاندھی نے یہ باتیں سنیں تو اس نے کہا بادشاہ خان تو سچ مچ کا فقیر ہے۔ آزادی تو آئے گی لیکن بہادر پٹھان اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔ وہ بہت ہی سنگین صورت حال سے دوچار ہیں لیکن بادشاہ خان تو مردِ خدا ہے۔" (9)

ذرا سوچیں باپو کا "سچ مچ کا فقیر" مسلم اکثریتی پاکستان میں اپنی آزادی کھو بیٹھے گا اور ہندو بالادستی والے ہندوستان میں ان کی آزادی کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

جو باپو کہا کرتا تھا کہ پاکستان سکیم بھارت ماتا کو زندہ پھاڑ دینے کے مترادف ہے وہی اب الٹی قلابازی کھاتے ہوئے ایک تیسرے ملک کی وکالت کرنے لگ گیا۔

پاکستان کے ایک عملی حقیقت بننے سے پہلے یہی لوگ پختون نیشنلزم کو انڈین نیشنلزم کے نام پر رد کیا کرتے تھے، پاکستان سکیم کا عملی حقیقت بنتے ہی انھیں پختون آزادی خطرے میں پڑتے ہوئے نظر آئی۔

اس عمل کی آخر کیا توجیہ دی جا سکتی ہے؟ پختونوں کی آزادی کو بھی اچانک خطرے میں ڈالا گیا اور ساتھ ساتھ مذہب کا تڑکا بھی لگایا گیا۔

زاہد چوہدری اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

عبد الغفار خان قائد اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے بعد صوبہ سرحد پہنچا تو 20 جون کو بنوں میں اس کی سرخ پوش تنظیم اور صوبائی کانگرس کمیٹی کا ایک جرگہ ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا گیا کہ "سارے پختونوں کی ایک آزاد پٹھان ریاست قائم کی جائے گی۔ جس کے آئین کی بنیاد جمہوریت، مساوات اور معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور پر ہو گی۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ مجوزہ ریفرنڈم میں سرحد کے عوام کو یہ رائے ظاہر کرنے کا بھی حق دیا جائے کہ وہ اپنے لیے آزاد ریاست چاہتے ہیں یا نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کی 02 جون کی قرارداد کے مطابق ریفرنڈم میں سرحد کے عوام سے دو کی بجائے تین سوال پوچھے جائیں۔ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟ وہ ہندوستان کا حصہ بننا چاہتے ہیں؟ یا دونوں سے الگ آزاد مملکت کی صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں؟"(0)

یہی بات مولانا آزاد نے اپنی کتاب میں لکھی:

"اب فرنٹیئر کانگرس نے آزاد پٹھان مملکت کی تخلیق کا مطالبہ کر دیا جس کا آئین اسلام کے تصور جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف پر ہو گا۔"

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فیض احمد فیض کے زیر ادارت 'پاکستان ٹائمز' نے لکھا:

اب جبکہ سچ کی تجرباتی لیبارٹری پر سردار پٹیل اور اس کے حواریوں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔ سرحدی گاندھی نے اپنے طور پر بھی کچھ تجربات کرنے شروع کر دیے ہیں۔۔۔ ہندو دروں جاذبیت کی اسلامی ریاست موہن داس گاندھی اور عبدالغفار گاندھی کے لیے بھی کچھ زیادہ ہی مکارانہ ہے۔ اگر خان برادران نے اسلامی نظام حکومت کے بارے میں ابتدائی درسی کتابیں بھی دیکھی ہوتیں تو انھیں پتا ہوتا کہ کسی ایسی اسلامی ریاست کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو صرف پٹھانوں، راجپوتوں،، بنگالیوں یا دوسرے نسلی گروہوں کے لیے مخصوص ہو۔ نسلی بنیادوں پر کسی ریاست کے قیام کا تصور اسلام کے منافی ہے۔

(دی پاکستان ٹائمز 25 جون 1947ء)(11)

آیئے ذرا ان کی ایک اور قلابازی پر نظر ڈالتے ہیں۔ پہلے پہل انھوں نے پشتونستان کا نعرہ کانگرس کی ہندو لیڈر شپ کی آشیر واد سے پاکستان سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لیے لگایا جب اس میں افغانستان نے مداخلت شروع کر دی اور برطانویوں نے اس بات کی سختی سے مخالفت کی اور افغانستان کو اس معاملے میں مداخلت سے باز رہنے کو کہا تو حسب سابق مکر کر کہنے لگے کہ اس سے ہمارا مقصد صوبائی خود مختاری کی بات کرنا تھا۔

23 جون کے 'انڈین نیوز کرانیکل' میں نہرو کا ایک بیان شائع ہوا جو اس نے ہندوؤں کے متبرک مقام ہری دوار میں جاری کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:

"صوبہ سرحد کی کانگرس مجوزہ ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرے گی۔ تاہم پھر بھی ریفرنڈم ہوا تو صوبے کی کانگرسی حکومت مستعفیٰ ہو جائے گی اور پاکستان یا آزاد پٹھانستان کے سوال پر تازہ انتخابات لڑے گی۔ صوبے کا فوری مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، حریت پسند پٹھان ایک آزاد پٹھان ریاست کے قیام تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

جناح نے اس بیان پر سخت احتجاج کیا چنانچہ اگلے روز ماؤنٹ بیٹن نے یہ بیان نہرو کو دکھایا اور اسے غیر مناسب قرار دیا لیکن نہرو اپنے بیان سے صاف منکر ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے کوئی انٹرویو یا بیان جاری نہیں کیا البتہ وہاں موجود ایک رپورٹر سے بات چیت کی تھی جس سے اس نے خود ہی یہ بیان اخذ کر لیا ہے۔"(12)

چوہدری محمد علی "ظہور پاکستان" میں لکھتے ہیں کہ گاندھی اور عبدالغفار خان نے پختونستان کے لیے جو مہم شروع کی، افغانستان کی حکومت نے بھی اس میں حصہ لیا۔ سنا گیا تھا کہ کانگرس کے ایلچی افغان حکومت کے پاس پہنچے ہیں۔ افغان حکومت نے برطانیہ اور ہند کی حکومتوں کو لکھا کہ دریائے سندھ کے مغرب کے علاقوں کو 'جہاں افغان آباد ہیں' یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے کہ آیا وہ افغانستان یا ہندوستان میں شامل ہوں یا اپنی آزاد مملکت قائم کریں۔ لارڈ لسٹوول نے، جو لارڈ پیتھک لارنس کی جگہ وزیر مملکت ہند بن چکا تھا، دوٹوک الفاظ میں یہ کہا کہ:

"افغانستان کو شمال مغربی سرحدی صوبے کے حقوق میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کہ جیسے وہ کوشش کر رہا ہے۔"

(وی پی مینن، دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ نمبر 389)

افغانستان کی مداخلت پر برطانوی ردِ عمل کے بعد ہندو لیڈر شپ نے بتدریج پسپائی اختیار کرتے ہوئے آزاد پختونستان کے بجائے اسے صرف صوبائی خود مختاری کی جنگ قرار دیا۔

نہرو کا 04 جولائی کو لکھا گیا مراسلہ جو اس نے ہندوستان کے قائم مقام کمشنر ایم-کے ولوڈی کے نام لکھا، پشتونستان کے نعرے کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

"آزاد پٹھانستان کے نظریئے کا مطلب مکمل آزادی یا انڈیا سے علیحدگی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوبہ کو مکمل خود مختاری دی جائے اور اسے یہ آزادی حاصل ہو کہ وہ جس ڈومینین میں چاہے شمولیت اختیار کرے" اور آگے چل کر لکھا کہ "یہ بالکل واضح ہے کہ ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا ہے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ صوبہ سرحد اس قدر چھوٹا اور کمزور ہے کہ وہ آزاد ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔"(13)

یہی بات گاندھی نے 30 جون کو اپنی پراتھنا میں یوں پیش کی:

"جہاں تک میں جانتا ہوں عبدالغفار خان کے ذہن میں فقط داخلی امور میں پٹھانوں کی آزادی کا تصور ہے۔ وہ ایک علیحدہ ریاست نہیں بنانا چاہتا۔ اگر وہ اپنا ایک مقامی آئین وضع کر لے تو وہ خوشی کے ساتھ دو میں سے کسی ایک ملک میں شمولیت کا فیصلہ کر لے گا۔"(14)

اب ذرا ذہن پر زور دیں اور سوچیں اگر یہ معاملہ صرف صوبائی خود مختاری تک محدود تھا تو اس میں اتنا ہنگامہ

کرنے کی کیاضرورت تھی؟ کیاریفرنڈم میں انھیں یہی آپشن نہیں دیا گیا تھا؟ جس میں عوام الناس کو عوامی سطح پر یہ فیصلہ کرنے کی مکمل آزادی دی گئی تھی کہ "وہ جس ڈومینین میں چاہیں شمولیت اختیار کر لیں۔" کبھی پختونوں کی آزادی، کبھی اسلام، کبھی صوبائی خود مختاری۔۔۔ کس بات پر کوئی اعتبار کرے؟ حقیقت یہ ہے کہ جیسے چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان نے اپنی کتاب میں لکھا کہ:

"گاندھی کے اسلحہ خانہ میں جتنے ہتھیار تھے وہ سب کے سب اس نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کے لیے استعمال کر ڈالے لیکن جغرافیائی حقائق، حالات کے منطقی تقاضوں اور پٹھان عوام کے عزم وارادے نے اسے بے بس کر دیا۔"

جناح صاحب کی شخصیت کے متعلق مختلف لوگوں کی رائے

بیک گراؤنڈ جاننے کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔ موجودہ کے پی میں ریفرنڈم ہوتا ہے جس میں پختونوں کی بھاری اکثریت نے ان کے بائیکاٹ کو مسترد کرتے ہوئے پاکستان کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس ریفرنڈم کے حوالے سے موصوف نے اپنی کتاب میں جس بد دیانتی کا مظاہرہ کیا اس کے بارے بھی آگے چل کر بات کرتے ہیں لیکن پہلے ولی خان کے مخصوص الزامات سے ہٹ کر آیئے ایک نظر جناح صاحب کی شخصیت پر بھی ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا واقعی جناح صاحب ایسی کمزور شخصیت کے مالک تھے کہ انھیں دوسروں کے سہارے کی ضرورت پڑتی۔

ہیکٹر بولتھو کی کتاب "Jinnah: Creator of Pakistan" سے اقتباسات

ہیکٹر بولتھو نے "حیات قائد اعظم" میں جناح صاحب کے پیشہ ورانہ زندگی کے ساتھیوں کے تاثرات لکھے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

"موجودہ ہندوستان میں بمبئی کے پرانے ہندو وکیل اب بھی بڑے احترام سے انھیں یاد کرتے ہیں۔

پھر بوڑھے وکیل نے پاس کے ایک دفتر سے دو دوستوں کو بلایا اور تینوں نے باری باری جناح کے متعلق قصے سنائے، ان میں سے ایک شخص ان کو اس زمانے سے جانتا تھا، جب ان کے مالی حالات اچھے نہ تھے، لیکن اس وقت بھی ان کا لباس ان کا طرۂ امتیاز تھا اور اس مشکل وقت میں بھی ان میں انتہا کی خود اعتمادی اور بے باکی تھی، شاید اس سے بھی زیادہ جس کے لیے وہ بعد میں اتنے مشہور ہوئے۔ اور ان کی دیانت بھی انتہا درجے کی تھی، بے شک وہ

ذرا ٹیڑھے آدمی تھے، لیکن میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ انھوں نے کوئی ناانصافی یا ہیر پھیر کیا ہو۔ یہ باتیں ان کی فطرت کے خلاف تھیں۔

تیسرے وکیل نے کہا: یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ان کی قسمت نے صحیح معنوں میں پلٹا کیوں کر کھایا، 1903ء میں جیمز میک ڈونلڈ نامی ایک اسکاٹش بمبئی کارپوریشن کا صدر تھا، اور نہایت اہم شخص تھا اور کارپوریشن کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا تھا۔ ایک دن ہائی کورٹ میں ایک بڑا مقدمہ سنا جا رہا تھا اور عدالت کا کمرا اتنا بھر گیا تھا کہ اس کے دروازے بند کرنا پڑے۔ کمرے کے اندر ایک حصہ وکلاء کے لیے مخصوص تھا، لیکن جب جناح اندر آئے تو اس میں ایک بھی کرسی خالی نہ تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ وکیلوں کی کرسیوں میں سے ایک پر جناب جیمز میک ڈونلڈ صاحب تشریف فرما ہیں۔ جناح نے ان سے کرسی خالی کرنے کو کہا۔ جب وہ نہ مانے تو جناح نے عدالت کے منشی سے شکایت کی اور مطالبہ کیا کہ میک ڈونلڈ کو کرسی سے اٹھا لیا جائے، منشی ہچکچایا تو جناح نے دھمکی دی کہ وہ جج کو شکایت کریں گے۔ اس پر بے چارہ منشی مجبور ہو کر میک ڈونلڈ کے پاس گیا اور ان سے کرسی خالی کرائی۔ میک ڈونلڈ بھی غیر معمولی آدمی تھا۔ بجائے ناراض ہونے کے اس نے کرسی چھوڑ دی اور جناح کا نام دریافت کیا۔ کچھ دن بعد ان نے ان کو 1000 روپے ماہوار پر کارپوریشن کا وکیل مقرر کر دیا۔"(15)

آگے لکھتے ہیں کہ:

"ہاں یہ ٹھیک ہے کہ جناح کے طور طریقے ذرا انوکھے تھے۔ ایک مقدمے کی سماعت کے دوران ایک جج نے انھیں بلند آواز سے بولنے کو کہا: "مسٹر جناح میں آپ کی آواز نہیں سن سکتا۔" جناح نے جواب دیا: "میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں۔" جج بات پی گیا، لیکن ذرا دیر کے بعد پھر مجبور ہو کر بولا، "مسٹر جناح میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ ذرا اونچا بولیے۔" اب کے جناح نے کہا کہ "اگر جناب کتابوں کا انبار اپنے سامنے سے ہٹا دیں تو آپ آسانی سے مجھے سن سکیں گے۔"

"میں اس طرح کے بہت سے قصے آپ کو سنا سکتا ہوں۔ لیکن اگر آپ جناح کے غیر معمولی کردار کو سمجھ لیں تو ان کی بظاہر غیر معمولی باتیں آسانی سے آپ کی سمجھ میں آ جائیں گی۔ میرے خیال میں ان کی ظاہری کج خلقی ان کی پکی دیانت داری سے متعلق تھی۔ آپ شاید آسانی سے اس بات پر یقین نہ کریں۔ لیکن آپ یہ نہ بھولیں کہ جناح ایک ایسے ملک میں

رہتے تھے جہاں ذاتی اخلاق بالعموم پست تھے اور جناح نے اپنے لیے ایمان داری کا جو معیار قائم کیا تھا وہ ان کے گرد و پیش کے لوگوں کے اخلاق سے بہت مختلف تھا۔

"اس زمانے میں ایک مشہور تاجر حاجی عبدالکریم تھے جنھیں کسی سنگین الزام میں عدالت میں طلب کیا گیا۔ وہ جناح کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ وہ مقدمے کی کتنی فیس لیں گے؟

جناح نے کھرے پن سے جواب دیا: "پانچ سو روپے روز۔" حاجی صاحب محتاط آدمی تھے، پوچھا: "مقدمہ کتنے عرصے چلے گا؟ میرے پاس کل پانچ ہزار روپے ہیں، کیا آپ یہ ساری رقم بطور معاوضہ قبول کر لیں گے؟" جناح اپنی بات پر اڑے رہے: " میں یہ رقم قبول نہیں کروں گا۔ میری فیس 500 روپے روزانہ ہے یا تو آپ اس فیس پر مجھے اپنا وکیل کر لیں یا کوئی اور وکیل تلاش کریں۔"

عبدالکریم نے ان کی شرط منظور کر لی اور جناح نے تین دن میں مقدمہ جیت لیا۔ ان کی کل فیس 1500 روپے بنی، جو انھوں نے بہ خوشی قبول کر لی"(16)

ایک اور واقعہ، ہیکٹر بولتھو نے اپنی کتاب کے میں درج کیا اسے پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جناح صاحب تصنع، بناوٹ اور ظاہر داری سے کس قدر پاک تھے۔ مسلم لیگ کے کچھ ممبروں نے جناح صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ بھی گاندھی کی طرح ریل کے تیسرے درجے میں سفر کریں تو یہ سن کر جناح صاحب برہم ہوئے اور انھوں نے ممبران کو یہ جواب دیا:

"آپ مجھے یہ حکم نہیں دے سکتے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ میں آپ کا روپیہ خرچ نہیں کر رہا۔ میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گا اور جو خود چاہوں گا وہی کروں گا۔"(17)

بولتھو لکھتے ہیں کہ " جناح نے عوام کو خوش کرنے اور ان میں ہر دل عزیز بننے کا گر کبھی نہ سیکھا۔ ان کے دل میں ہر دل عزیزی کی کوئی قدر نہ تھی اور نہ وہ اس کے لطف سے آشنا تھے۔ اخباری نمائندوں کے ساتھ ان کا رویہ اکثر روکھا ہوتا اور بمبئی کے اخباری دفتروں میں اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ واقعات سننے میں آیا کرتے۔ تاہم اخبار نویس قائداعظم کا بہت احترام کرتے تھے۔

ایک پرانے صحافی نے اس تاریخی دور کی یاد تازہ کرتے ہوئے کہا: "انھوں نے کبھی ہم سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنا کام نکالنے کی کوشش نہ کی۔ دوسرے سیاست دانوں کی نسبت وہ بڑے ٹیڑھے آدمی تھے اور ہمارے ساتھ تکبر اور تنگ مزاجی سے پیش آتے تھے۔ وہ پریس کانفرنس کے لیے اکثر ہمیں اپنے گھر بلاتے لیکن کبھی

انھوں نے ہمیں چائے یا سگریٹ نہ پلائی۔ شاید وہ اس قسم کی تواضع کو بھی ایک طرح کی رشوت سمجھتے تھے۔ ایک دن بمبئی میں ایک پریس کانفرنس کے ختم ہونے کے بعد مسٹر جناح کمرے سے باہر نکلنے والے تھے کہ میرے ساتھی نے ان سے ایک اور سوال پوچھ لیا۔ انھوں نے فوراً ڈانٹ کر جواب دیا: "کانفرنس ختم ہو چکی، اب آپ محض وقت ضائع کر رہے ہیں۔"(18)

راؤ بہادر ایم سی راجا جو اچھوتوں کے رہنما تھے، نے جناح صاحب کی چونسٹھویں سالگرہ پر ان کے نام اپنے پیغام میں لکھا کہ :

> "دنیا کے تمام مذاہب کا یہ عقیدہ ہے کہ وقتاً فوقتاً، اور بالخصوص نازک مواقع پر خدا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے لائق اور صالح بندے دنیا میں بھیجتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے جناح کو اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کو اس غلط راستے سے ہٹائیں جو انھوں نے گانگرس اور مسٹر گاندھی کے زیر اثر اختیار کیا ہے۔ گانگرس اپنے ابتدائی دور میں بڑی معقول پالیسی پر عمل پیرا رہی۔ وہ برطانوی حکومت کی غلطیوں اور کاتاہیوں پر برابر نکتہ چینی کرتی رہی، لیکن ملک کے حق میں جس قدر تعاون حکمت کے ساتھ ضروری تھا، اس سے اس نے کبھی گریز نہ کیا۔ یہ پالیسی دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے نے وضع کی تھی۔ لیکن بعد میں گانگرس نے مسٹر گاندھی کا مکمل عدم تعاون کا پروگرام قبول کر لیا اور برطانیہ کی طرف معاندانہ روّیہ اختیار کر لیا۔ اس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور حق پرستی اور اہنسا کے پردے میں عوام کے دلوں میں قانون شکنی کا جذبہ بیدار کر دیا۔ مزید برآں اس نے مسٹر گاندھی کو مہاتما بنا کر ہندوؤں کے جذبہ بت پرستی اور مذہبی توہمات کے سہارے ان میں اپنا اثر پیدا کیا او اس طرح انھیں تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہونے پر آمادہ کیا۔ اس طریق کار کا یہ اثر ضرور ہوا کہ حکومت برطانیہ گھبرا کر گانگرس کے مطالبات تسلیم کرنے لگی، لیکن دوسری طرف ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہندو اور غیر ہندو سیاسی میدان میں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے۔
>
> حالات کی بڑی ضرورت تھی کہ کوئی سربر آوردہ شخص گانگرس کے مقابل کھڑا ہو سکے اور اس کے لیڈروں کو یہ بتا سکے کہ گو کہ گانگرس کے ساتھیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور مالی لحاظ سے بھی وہ بہت مضبوط ہے، تاہم وہ سارے ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

میں مسٹر جناح کا بڑا مداح ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں۔ یہ اس لیے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے لیے جو جدوجہد وہ کر رہے ہیں، اس سے ان تمام طبقوں کو نفع پہنچے گا جو آج اونچی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں اور مسٹر گاندھی کے احکام کے مطابق کچلے جا رہے ہیں۔"(19)

جنرل گریسی کی رائے

ہیکٹر بولتھو اپنی کتاب میں جنرل گریسی کے ساتھ اپنے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انھی دنوں حکومت ہند نے ایک کمیٹی اس مقصد کے لیے مقرر کی کہ فوج میں ہندوستانی افسروں کی بھرتی اور سینڈ ہرسٹ کے نمونے پر ایک فوجی ٹریننگ کالج کے قیام کی بابت حکومت کو مشورہ دے۔ فروری 1925ء میں جناح بھی اس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ راقم الحروف کے ساتھ ایک ملاقات کے دوران میں جنرل گریسی نے بتایا کہ جو افسر کمیٹی کے وفد کے سامنے شہادت دینے آئے، ان کی طرف جناح کا رویہ بڑا تحکمانہ تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عدالت میں مخالف گواہوں پر جرح کر رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ اتنا نامناسب تھا کہ بالآخر مجھے انھیں ٹوکنا پڑا۔ میں نے کہا؛" آپ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جو افسر کمیٹی کے سامنے پیش ہو رہے ہیں انھوں نے اپنی خوشی سے یہ خدمت قبول کی ہے تاکہ وہ کمیٹی کے کام میں مدد دے سکیں۔ آپ لوگوں کو ان سے اچھی طرح پیش آنا چاہیے اور ان کا لحاظ کرنا چاہیے۔" اس احتجاج پر جناح دھیمے پڑ گئے۔ اس موقع کے برسوں بعد مجھے ان سے بڑی مختلف حیثیت سے سابقہ پڑا۔ لیکن اس زمانے میں بھی میں ان کی اس خوبی سے بہت متاثر ہوا کہ جب بھی ان کی طرف سے زیادتی ہوتی اور انھیں اس پر ٹوک دیا جاتا تو وہ فوراً اپنی غلطی محسوس کر لیتے اور پھر اپنا رویہ ٹھیک کر لیتے۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ بات کبھی دل میں نہ رکھتے۔

سینڈ ہرسٹ میں میں نے جس سختی سے انھیں ٹوکا تھا وہ کوئی معمولی بات نہ تھی اور اگر جناح کی طبیعت میں چھوٹا پن ہوتا تو ہو وہ میری اس گستاخی کو کبھی معاف نہ کرتے اور اس کی تلخ یاد ساری عمر ان کے دل میں رہتی۔ لیکن وہ ایسے نہ تھے اور ان کا ذہن ان چیزوں سے بالاتر تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد جب میرا نام پاکستانی فوج کے سپہ سالاری کے لیے تجویز کیا گیا تو انھوں نے تجویز منظور کر لی اور خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں انھیں اچھی طرح یاد تھا لیکن انھوں نے کبھی کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہ کیا۔"(20)

کانجی بھی اپنی کتاب میں جنرل گریسی والے واقعے کا تذکرہ کرتے نظر آئے:

"فروری 1925ء میں حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کا مقصد افواج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی عنصر داخل کرنے اور سینڈ ھرسٹ اکیڈمی کے نمونے پر فوجی کالج قائم کرنے کی سفارشات پیش کرنا تھا۔ جناح اور موتی لال نہرو اس کمیٹی کے ارکان مقرر کیے گئے تھے۔ لیکن کچھ مہینوں کے بعد موتی لال نہرو مستعفی ہو گئے۔ جناح نے کمیٹی کی طرف سے شہادتیں جمع کرنے میں قانونی جرح کے وہ سارے گر استعمال کیے، جن کے وہ ماہر تھے۔ ان کی جرح جن انگریز فوجی افسروں کو بہت ناگوار گزری، ان میں ڈگلس گریسی بھی تھے، لیکن اس کے باوجود اس کام میں کہیں بھی کسی قسم کی تلخی پیدا نہ ہونے پائی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ 1948ء میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے جناح نے مسٹر ڈگلس گریسی ہی کو پاکستانی افواج کا کمانڈر انچیف مقرر کیا۔"(21)

جناح صاحب کے بارے میں، ہیکٹر بولتھو کچھ مزید برطانویوں کی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

"ہر آدمی کی شخصیت کے بے شمار متنوع پہلو ہوتے ہیں اور جن لوگوں کو اس سے سابقہ پڑتا ہے ان میں سے ہر ایک کو اس کی شخصیت کا رنگ جدا نظر آتا ہے۔ یہی حال محمد علی جناح کا تھا۔ ان کی سیرت اور مزاج کے متعلق ان کی شناساؤں میں خاصا اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ جناح انتہائی دیانتدار انسان تھے اور ساری عمر کسی نے ان کی دیانت پر شبہ نہ کیا۔"

سر سٹیفورڈ کرپس انھیں 1930ء سے جانتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ "جناح انتہائی راست باز اور خوددار شخص تھے۔ ان سے معاملہ کرنا اس لیے دشوار تھا کہ وہ اپنے مقصد کو ترک کرنے پر کبھی تیار نہ ہوئے۔

"فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلیک کہتے ہیں "میں جناح کا بڑا مداح تھا۔ وہ زبردست شخصیت کے مالک تھے اور دھن کے پکے تھے۔ کوئی چیز ان کی غیر معمولی قوت ارادی کو دبا نہ سکتی تھی۔"

لارڈ ویول کے عہد حکومت کے آخری دنوں میں جناح سے ان کے مراسم خوشگوار نہ رہے تھے۔ ان سے جب جناح کے متعلق رائے پوچھی گئی تو انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ان سے معاملہ کرنا واقعی بہت مشکل تھا۔"(22)

جناح صاحب کی زندگی کا ایک اور واقعہ جو اسی کتاب میں درج ہے جب جناح صاحب مرض الموت میں مبتلا تھے ایسے وقت میں بھی انھیں اس بات کی فکر تھی کہ کہیں لوگ مجھے کسی کے سہارے پر چلتے ہوئے نہ دیکھ لیں:

"16 اگست کو کرنل الہی بخش نے اپنے مریض کو یہ خوش خبری سنائی کہ ان کے پھیپھڑے کی حالت اب پہلے کی نسبت 40 فیصد بہتر ہے۔ اس پر قائد اعظم نے پوچھا: "100 فیصد اصلاح کب تک ہو جائے گی؟" دو روز بعد ان کی حالت اتنی سدھر گئی کہ انھوں نے اپنا کام دوبارہ شروع کر دیا اور روزانہ ایک گھنٹہ سرکاری کاغذات کے مطالعے پر صرف کرنے لگے۔ انھی دنوں مسٹر محمد علی کراچی سے آکر پھر قائد اعظم سے ملے اور انھیں دیکھ کر یہ رائے قائم کی کہ ان کی ذہنی کیفیت اب پہلے سے بہت بہتر ہے اور بہ حیثیت مجموعی وہ روبہ صحت معلوم ہوتے ہیں۔"

تھوڑے دن بعد قائد اعظم اس قابل ہو گئے کہ اٹھ کر کمرے میں چند قدم چل سکیں۔ انھوں نے اسپگیٹی، انگور اور آڑو کھائے اور کراچی واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگائی کہ " کہ مجھے وہاں بیساکھیوں کے سہارے نہ چلنا پڑے۔ میں ہر گز گوارا نہ کرونگا کہ لوگ مجھے اسٹریچر پر ڈال کر موٹر سے میرے کمرے تک لے جائیں۔"(23)

ڈاکٹر سچدانند سنہا کی رائے

ڈاکٹر سچدانند سنہا جو ایک ممتاز وکیل، اخبار نویس، سیاستدان اور ماہر تعلیم تھے، نے جناح صاحب بارے اپنے تاثرات "محمد علی جناح جنھیں میں جانتا ہوں" میں لکھتے ہیں کہ:

"جناح کا مسئلہ (یعنی قوم پرستی سے فرقہ پرستی کی جانب مراجعت Supcgo (کی مرضیات کا مطالعہ ہے جس کے متعلق علم نفسیات کے معالجوں کا خیال ہے کہ یہ لا علاج مرض ہے۔ اس مرض کے آثار ان کے یہاں بہت پہلے دکھائی دیے تھے، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے مرض بد سے بدتر ہو گیا۔ ان کی وکالت کے ابتدائی دنوں میں وہ قابل شناخت تھا کیونکہ جب بمبئی ہائی کورٹ کے ایک جج نے کہا: 'یاد رکھیں مسٹر جناح، آپ کسی تیسرے درجے کے مجسٹریٹ سے نکتے کی وضاحت نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری ہی ساعت جواب ملا: "مائی لارڈ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ آپ کسی تیسرے درجے کے وکیل سے بات نہیں کر رہے ہیں۔" کوئی تیسرا یا دوسرا کلاس کسی صورت یا ہئیت میں جناح کو پسند نہیں تھا۔ ان کا جست کرتا ہوا حوصلہ انھیں یہ سمجھاتا تھا کہ وہ ہر جگہ مقدم رہیں یا پھر کچھ نہ رہیں۔ یعنی یہ کہ جناح ہوں تو سب کچھ ہوں، اپنی ساری زندگی وہ اپنی اعلیٰ استعداد کے

سلسلے میں حد درجہ باشعور رہے، وہ شخص جس نے خود کو کبھی کسی دباؤ میں آنے نہ دیا خواہ کوئی شعبہ یا سرگرمی ہو، قانون، سیاست یا سماجی زندگی۔

جناح کسی کے ماتحت میں کام نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یا تو لازمی طور پر قیادت کریں گے یا پھر کہیں نہیں رہیں گے۔ ان کا مطمع نظر واضح طور پر یہ تھا کہ جہنم میں حکومت کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کے اشتراک سے جنت میں حکومت کریں۔ ایک کرم خوردہ تقسیم شدہ اور کٹے پھٹے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بننا بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ فیڈریشن آف انڈیا کی سب سے بڑی ریاست کے گورنر یا اس کے گورنر جنرل۔ جناح کی کامیابی میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری بارہ برسوں میں اسلامیان ہند کے تسلیم شدہ لیڈر رہے کیونکہ مسلمانوں کے اپنے وطن کا فسوں اتنا زبردست تھا کہ جب جناح مذہبی جوش اور متشددانہ دیوانگی کی آگ کو بھڑکاتے تو اس کا مقابلہ کرنا، ان کے لیے ناممکن ہو جاتا اور اس طرح واقعات کی منطق میں آکر جناح بہت سمٹ گئے اور ایک ایسے ملک کے لیے رضامند ہو گئے جس کے نا صرف دو حصے کر دیے گئے تھے جن کا آپس کا ہزار میل سے بھی زیادہ فاصلہ تھا، ان کی مرضی کے خلاف بنگال اور پنجاب کے صوبے سفاکانہ انداز سے بانٹ بھی دیے گئے تھے۔ جناح کی کامیابی کی خاص وجہ تھی۔ ایک فرد کی آرزو، ایک نظریہ ایک مقصد، پاکستان بمقابلہ گانگرس پارٹی کے بار بار رنگ بدلنے کے، جس نے اپنے اعلان کے ساتھ کہ وہ حق خود داری کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوئی کہ وہ صوبے یا صوبے کے حصے جو ایک واضح مسلم اکثریت رکھتے تھے، انھیں یہ استحقاق حاصل ہو کہ اس اصول پر وہ انڈین یونین سے علیحدگی اختیار کر سکیں۔"

ڈاکٹر مبارک علی کے سہیل وڑائچ کے ساتھ انٹرویو سے اقتباس

ڈاکٹر مبارک علی جو ایک مشہور، مؤرخ ہیں، نے سہیل وڑائچ سے ایک انٹرویو میں جناح صاحب کی شخصیت اور دو قومی نظریے کے بارے میں مندرجہ ذیل گفتگو کی:

سوال: آپ سمجھتے ہیں کہ تاریخی حوالے سے تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی؟

ڈاکٹر مبارک علی: جی بالکل ناگزیر ہو گئی تھی کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہیں رہی تھی۔

سوال: یعنی آپ اس تھیوری سے متفق نہیں ہیں کہ دو قومی نظریہ انگریزوں نے بنایا؟

ڈاکٹر مبارک: نہیں یہ تو خیر بالکل غلط ہے کہ انگریزوں نے دو قومی نظریہ بنایا یہ بات ہمارے ہاں جو تھوڑی سی سازش کی عادت ہے اس کی وجہ سے ہے۔ ایسا تو نہیں ہوتا کہ کوئی نظریہ اوپر سے بنا کر نافذ کر دیا جائے۔ نظریات کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ آپ تاریخ دیکھیں، خاص طور پر نو آبادیاتی دور میں یہ بات ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

سوال: آپ اس بات سے بالکل متفق نہیں ہیں کہ (جیسا کہ ولی خان اور نیشنلسٹ کہتے ہیں) کہ جناح صاحب نے برطانیہ کے کہنے پر سب کچھ کیا؟

ڈاکٹر صاحب۔ نہیں نہیں اس سے میں بالکل متفق نہیں ہوں اگر چہ جناح صاحب کی بہت سی باتیں مجھے پسند نہیں ہیں لیکن کم از کم ان کے کریکٹر کے لحاظ سے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ کسی کے ایجنٹ کے طور پر کام کر سکتے .اس معاملہ میں بہت دیانتدار اور سچے کھرے آدمی تھے جو انھوں نے صحیح سمجھا وہ کیا۔ اب آپ اس کو کچھ بھی کہہ لیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے انگریزوں کے اشارے پر سب کچھ کیا یہ صحیح نہیں اس سے میں متفق نہیں۔

سوال: اور وہ جو کہتے ہیں کہ تاریخ کے حوالے سے ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں؟ ولی خان اکثر برٹش ریکارڈ کا حوالہ دیتے ہیں؟

ڈاکٹر مبارک۔ نہیں، نہیں ان کی جو کتاب ہے Facts and Facts میں بھی کوئی حوالے اور کوئی ریفرنس نہیں ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "میں نے کہا"، "میں نے یہ دیکھا" لیکن انھوں نے ریفرنس وغیرہ نہیں دیے تو یہ کہنا کہ جناح صاحب انگریزوں کے کہنے پر کچھ کرتے تھے۔ یہ میں سمجھتا ہوں کہ بالکل غلط ہے اور یہ تاریخی حقائق نہیں ہیں۔"(24)

اودن بینٹ جونز، نامہ نگار بی بی سی

اودن بینٹ جونز، بی بی سی کے نامہ نگار ہیں جنھوں نے پاکستان پر ایک کتاب Pakistan Eye of the Storm لکھی جس کا ترجمہ یاسر جواد نے " پاکستان بھنور کی زد میں" کے نام سے کیا۔ کتاب میں جناح صاحب بارے رائے دیتے ہوئے اودن بینٹ جونز لکھتے ہیں کہ:

> "انتقالِ اقتدار سے پہلے بر صغیر کے مخصوص حالات میں جناح کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ایک ایسا کارنامہ سر انجام دینے میں کامیاب ہوئے جس کی جدید دور میں مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے کامل قانونی انداز میں ایک نئی ریاست تخلیق کی۔ انھوں نے کبھی پستول کو ہاتھ تک نہ لگایا اور نہ ہی کسی اور کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ اور کسی ملک کے بانی کے بارے میں تصور کرنا مشکل ہے جس نے ساری زندگی ایک دن بھی جیل میں نہ گزارا ہو۔ جناح اپنی زندگی میں صرف

ایک مرتبہ گرفتار ہوئے۔1893ء میں آکسفورڈ-کیمبرج کشتی ریس میں غیر منظم طرزِ عمل کی وجہ سے۔

جناح کی یادگار کامیابی کا دارومدار کچھ مخصوص خوبیوں کے امتزاج پر تھا جنھوں نے برطانویوں کو مشکل میں ڈالے رکھا۔ سمجھوتہ کرنے سے انکار اور نہایت پیچیدہ قانونی معاملات کو سمجھنے اور بیان کرنے کی شاندار صلاحیت۔۔۔"(25)

کانجی دوارکاداس کے تاثرات

کانجی دوارکاداس نے دو کتابیں لکھی ہیں ایک کا نام"India Fight for Freedom" ہے۔ یہ کتاب 1966ء میں شائع ہوئی اور اس پر برطانیہ کے سابق وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے مقدمہ لکھا اسی موضوع سے متعلق مصنف کی دوسری کتاب "Ten Years to Freedom"1968ء میں شائع ہوئی۔ پہلی کتاب میں 1913ء سے 1937ء تک اور دوسری کتاب میں 1937ء سے 1947ء تک کے واقعات قلمبند کیے گئے۔ ان دونوں کتابوں میں جناح صاحب سے متعلق جو کچھ موجود ہے اس کا ترجمہ اور ترتیب، مصنف کی اجازت سے سید شہاب الدین دسنوی نے "محمد علی جناح" کے نام سے کیا۔ اسی کتاب سے کچھ اقتباسات بھی پڑھ لیں:

> "جناح کی بے مثال ایمانداری کا ہر شخص معترف تھا اور ان کی اس نیک نامی کی شہرت آخر وقت تک قائم رہی۔ ان کی غیر معمولی ذہانت سے انھیں اپنے قانونی پیشے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی بے حد مدد ملی۔ ان کا ذہن مسائل کو صاف اور واضح ڈھنگ سے سوچنا جانتا تھا، ان کی طبیعت انصاف پسند تھی۔ اپنے مخالفوں سے مقابلہ کرنے میں ان کی یہ دونوں خصوصیتیں بہت کام آئیں۔ سیاست کے میدان میں جہاں وہ گاندھی جی کی بدلتی ہوئی پالیسیوں کا سدِباب کر سکے تو دوسری طرف جواہر لعل نہرو کی سیماب مزاجی پر بھی قابو پانے میں کامیاب ہوئے۔"(26)

آگے لکھتے ہیں:

> "جناح پر کبھی یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ درشت مزاج واقع ہوئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی ظاہراً سخت مزاجی ان کی بے پناہ ایمانداری اور کھری طبیعت کا نتیجہ تھی۔ سر چمن لال اپنی کتاب ری کولیکشنز اینڈ ریفلیکشنز میں لکھتے ہیں "جناح نے ابتدا ہی سے اپنی بے باکی قائم رکھی تھی۔ وہ کسی بڑے سے بڑے جج یا حریف بیرسٹر سے مرعوب نہیں

ہوتے تھے۔ایک بار اسٹرینگ مین (اس زمانے کا مشہور انگریز بیرسٹر) اور جناح ایک مقدمے میں ساتھ پیروی کر رہے تھے۔جناح مشورے کے لیے اسٹرینگ مین کے چیمبر میں گئے تو اس ملاقات کے دوران اسٹرینگ مین نے کچھ اس طرح گفتگو کی کہ جس سے جناح کو ہتک محسوس ہوئی۔پھر اس کے بعد جناح اسٹرینگ مین کے چیمبر میں کبھی نہیں گئے"

مجھے عدالت کا ایک اور واقعہ یاد ہے۔ مرحوم جسٹس مرزا کے اجلاس پر جناح اور میں فریقین کی جانب سے کام کر رہے تھے۔اس کیس کے سلسلے میں کئی دوسرے وکلا بھی حاضر تھے۔بحث کے دوران جناح نے جج کو کچھ ایسے انداز سے مخاطب کیا کہ اسے برا لگا۔جج نے جناح کو متنبہ کیا کہ وہ توہینِ عدالت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔پھر جسٹس مرزا نے مجھ سے پوچھا: کیا مسٹر جناح عدالت کی توہین نہیں کر رہے ہیں؟ یہ بڑا احمقانہ سوال تھا۔میں نے جواب دیا اس کا فیصلہ کرنا تو آپ کا کام ہے، میں کیسے کوئی رائے دے سکتا ہوں۔ لیکن مسٹر جناح کو تھوڑا بہت جانتا ہوں اور اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔اس واقعے کے بعد ایک مدت تک جناح نے جسٹس مرزا کے اجلاس پر کام نہیں کیا۔"(27)

کانجی اپنی اس کتاب میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کے ساتھ جناح صاحب کی ایک ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے فخریہ انداز میں لکھتے ہیں کہ اُس زمانے کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو وائسرائے کو اس کے منہ پر کھری کھری سنانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ:

"دوسرا واقعہ 17 اگست 1940ء کو بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس میں پیش آیا۔8 اگست کی تجاویز کے بعد جناح کو وائسرائے سے بمبئی میں ملنے کی دعوت دی گئی۔اس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے لارڈ لنلتھگو (وائسرائے) ایک وار ایڈوائزری کونسل تشکیل دے کر اس کا اعلان کر چکے تھے۔اس کونسل میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات خان کا نام بھی شامل تھا۔مسلم لیگ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنا طے کیا تھا۔اس کے باوجود سر سکندر حیات خاں (جو مسلم لیگ کے اہم رکن تھے) کونسل میں شریک ہو گئے۔جناح کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔انھوں نے اخباروں میں یہ بیان دیا کہ لارڈ لنلتھگو کی یہ حرکت نہایت نا معقول ہے۔اب ہوا یوں کہ وائسرائے سے ملاقات کا وقت گیارہ بجے دن کو مقرر تھا لیکن اس وقت تک جناح وہاں نہیں پہنچے تھے۔ہر شخص جناح کی طبیعت سے واقف تھا کہ وہ وقت

کے کتنے پابند تھے۔ ٹیلی فون پر ٹیلی فون ہوتے رہے۔ آخر سوا گیارہ بجے جناح گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ وائسرائے کو انتظار کی زحمت دینا خود جناح کے اخلاق سے بعید تھا لیکن اس موقع پر جناح نے کوئی معذرت نہیں کی۔ ہاتھ ملانے کے بعد جب دونوں بیٹھے تو وائسرائے نے ان کے اخباری بیان کا ذکر کیا اور کہا کہ شاید جناح کو ان کے طریقہ کار سے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے جسے وہ دور کرنا چاہتے تھے۔ یہ سنتے ہی جناح اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے " جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے وائسرائے سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" اتنا کہا اور وائسرائے کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ لنلتھگو کے دبدبے سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ ہمیں اس واقعے پر فخر ہوتا ہے کیونکہ جب دوسرے ہندوستانی لیڈر (جن میں کانگرسی ہائی کمان کے لوگ بھی شامل تھے) اس برطانوی وائسرائے کے لیے "شریف ترین انگریز" اور "شریف ترین کرسچین" کی توصیفی صفتیں استعمال کر رہے تھے، کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو حق گوئی و بے باکی سے کام لیکر اس کے منہ پر کھری کھری سنا دینے کی جرات رکھتا تھا۔"(28)

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران برطانوی وزیر اعظم ریمزے فیلڈ کے ساتھ جناح کی ملاقات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جس میں جناح صاحب نے برطانوی وزیر اعظم کو اپنی صاف گوئی سے بدمزہ کر دیا:

"برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈونلڈ نے جناح کو بلا کر سمجھایا کہ حالات جس طرح پلٹنے والے ہیں ان کے پیشِ نظر برطانوی وزیر اعظم کو ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت ہو گی جو صوبوں کے گورنر بن سکیں گے۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اگر جناح نے "نیک بختی" کا ثبوت دیا تو انھیں بھی گورنری کے عہدے سے سرفراز کیا جا سکتا تھا۔ جناح نے ریمزے میکڈونلڈ سے پوچھا کیا برطانوی تجارتی مفاد کو محفوظ کرانے کی خاطر انھیں رشوت دی جا رہی ہے؟"(29)

بیورلے نکولس کی جناح صاحب کے بارے میں رائے

1943ء میں بیورلے نکولس نے جناح صاحب کا انٹرویو کیا اور انھیں ایشیا کا اہم ترین شخص قرار دیا۔ وہ اپنی کتاب "Verdict of India" کے تیسرے باب "ایک عظیم شخصیت سے بات چیت" میں لکھتے ہیں کہ:

"ایشیا کے اہم ترین شخص کی عمر 67 سال ہے۔ وہ دراز قد، دبلے پتلے اور خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ ایک آنکھ کی عینک، جس میں گہرے رنگ کی ریشمی ڈوری پڑی ہوتی ہے اور کلف

لگے ہوئے سفید کالر کے ساتھ جو وہ گرم ترین موسم میں بھی پہنتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر سپین کے کسی عالی نسب انسان، پرانے سکول کے کسی مدبر کا گمان ہوتا ہے ان جیسے لوگ ہمیں سینٹ جمیز کلب میں لاٹیمپس پڑھتے، اورContrexeville سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آتے تھے جس کا جام میلباٹوسٹ سے بھرے ہوئے کوئین اپنی ٹوسٹ ریک پر رکھا ہوتا تھا۔

میں نے مسٹر جناح کو" ایشیا کا اہم ترین شخص" اس لیے قرار دیا تھا، کہ آپ انھیں نمایاں طور پر یاد رکھ سکیں۔ اگر چہ حد سے بڑھی ہوئی تعریف کی طرح اس بات کو بھی معرض بحث بنایا جاسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری تعریف سچ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہندوستان آئندہ چند برس تک دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بنا رہے گا اور اس میں مسٹر جناح کو سٹرٹیجک اہمیت حاصل ہے، وہ اس جنگ کو ادھر یا اُدھر، جس طرف لے جانا چاہیں، لے جاسکتے ہیں۔ ان کے دس کروڑ مسلمان، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف جاسکتے ہیں۔ لیکن صرف ان کے کہنے پر اور کسی کے نہیں۔ یہ ہے اصل نکتہ۔ ہندوؤں کی صفوں میں یہ بات نہیں وہاں اگر گاندھی چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کو نہرو، یا راجگوپال اچاریہ، پٹیل اور دوسرے درجنوں لوگ موجود ہیں۔ لیکن اگر جناح چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کے لیے کون ہے؟

یہ سب کچھ کہنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جناح کے چلے جانے سے مسلم لیگ ختم ہو جائے گی۔۔۔۔ وہ بہت طاقتور اور ہم خیال لوگوں کی تنظیم ہے۔۔۔۔ لیکن جناح کے جانے کے بعد کیا کرے گی، اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل پٹڑی سے اتر جائے اور ہندوستان میں خون خرابہ شروع کر دے، ایک نئی جنگ کا آغاز کر دے۔ لیکن جب تک جناح موجود ہیں، اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔

اب آپ کو اس امر کا علم ہو گیا ہو گا کہ اس یک چشمی عینک کی ریشمی ڈوری کے ساتھ بہت کچھ بندھا ہوا ہے۔"(30)

تلک کا مقدمہ اور بمبئی بار کاؤنز

شیش راؤ چاون کی کتاب MOHAMMAD ALI JINNAH THE GREAT ENIGMA میں ایل ایچ ہیر انندانی بال گنگا دھر تلک کے مقدمے بارے لکھتے ہیں کہ ایک بہت بڑے قوم پرست تلک کو جب برٹش حکو کی طر اہوئی تو کو کیل مقرر کیا۔ جج

جسٹس داور ایک انڈین جج تھا۔ جب بمبئی بار نے اس جج کے اعزاز میں ایک ڈنر کا اہتمام کیا اور جناح صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تو جناح صاحب کا جواب تھا:

"Bar should feel ashamed to want to give a dinner to a judge who had obtained knighthood by doing what the Government wanted, and by sending a great patriot to jail with a savage sentence"

جب جج نے جناح صاحب کے سخت ردِ عمل کی وجہ پوچھی تو اس پر جناح صاحب کا کہنا تھا:

"that what he had written was truth and that he could not suppress the strong feeling about the manner in which the Judge had handled Tilak's case. "

جسونت سنگھ کی کتاب سے اقتباس

جسونت سنگھ نے اپنی کتاب "جناح، اتحاد سے تقسیم تک" میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ لکھا جب ہندوستان کی تمام لیڈر شپ گاندھی کے سامنے سجدہ ریز ہو چکی تھی اس وقت واحد جناح صاحب ہی تھے جنھوں نے گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا:

"1921ء میں گانگرس کا احمد آباد اجلاس گاندھی کی مکمل قیادت میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ اس اجلاس میں نمائندوں کے لیے کرسیوں یا میزوں کا نظم نہیں تھا اور یہ کہا گیا تھا کہ سبھی نمائندے زمین پر بیٹھیں گے۔ لوگوں نے اجتماعی طور پر پہلی بار کھدر پہنا تھا اور سبھی نمائندوں کو کھدر کے خیموں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ سب کو اس دوران چرخے پر سوت کاتنا تھا۔ جناح بھی احمد آباد میں تھے مگر آخری بار گانگرس کے اجلاس میں شرکت کر رہے تھے۔ وہ وہاں کالر، ٹائی کے ساتھ غیر ملکی کپڑوں میں ملبوس واحد ممبر تھے، انھوں نے چرخے پر سوت کاتنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔"(31)

جسونت سنگھ اپنی کتاب میں جناح گاندھی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گاندھی کے برعکس جناح صاحب کو کامیابی اپنی کوششوں سے ملی وہ لکھتے ہیں کہ:

"گاندھی اور جناح کا موازنہ کرنا ایک انتہائی مشکل لیکن اہم کوشش ہے کیونکہ وہ دونوں تحریک آزادی کے دو مرکزی نشان تھے یا یوں کہہ لیں مرکزی نشان بن گئے تھے تو غلط نہ ہو گا۔ بلاشبہ گاندھی ایک الگ سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے لیکن جناح کی طرح ہی انھوں بھی اثر حاصل کیا تھا وراثت میں حاصل نہیں ہوا تھا۔ کاٹھیاواڑ کے

گاندھی بھی جناح کی طرح ہی سیاسی شخصیت کے حصول سے پہلے کامیابی سے لندن کے بیرسٹر رہے۔ یہاں ایک بہت واضح اور خاص فرق سامنے آتا ہے کہ گاندھی کی پیدائش ایک معروف خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والد ایک ہندوستانی ریاست کے دیوان (وزیر اعظم) تھے اور اس وجہ سے انھیں بہت مدد بھی ملی۔ جناح کو پیدائش سے ایسا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا، انھوں نے کامیابی اپنی ہی کوششوں سے حاصل کی تھی۔"(32)

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ سے اقتباسات

"ٹھنڈے اور تیز دماغ کا ایک اور آدمی تھا۔

ایک ضدی وکیل جو چوتھائی صدی سے گاندھی کا اہم ترین مسلمان حریف بنا ہوا تھا۔ اس کا نام تھا محمد علی جناح۔

اس نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ اس تباہی کے نظارے کو ایک اوزار کی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ وہ اوزار جس سے ملک کے ٹکڑے ہو سکتے تھے۔

جناح کے حامیوں کے علاوہ جن لوگوں نے اس دور کی تاریخ لکھی ہے وہ شاید جناح کو وہ مقام نہ دیں، جس کا وہ مستحق ہے۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے جو اس نے حاصل کی ہیں۔

مؤرخوں کے اس تعصب کے باوجود کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان دنوں ہندوستان کے مستقبل کی کنجی نہ گاندھی کے ہاتھ میں تھی نہ کسی اور کے۔ بلکہ وہ جناح کے ہاتھ میں تھی۔

جناح مسلمانوں کا سچا لیڈر تھا۔ ضدی اور سخت، اپنے حامیوں کو وہ بالآخر اس منزل مقصود تک لے گیا جسے وہ اپنی سرزمین کہہ کر خوش ہو سکتے تھے۔"

> "ہندوستان کے اہم لیڈروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جناح پر ختم ہونے والا تھا۔ جناح کے لہجے میں جو روکھائی تھی وہ پچیس سال بعد بھی ماؤنٹ بیٹن کو یاد تھی اور ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا۔۔ "ہندوستان میں مجھے کتنا مشکل کام سونپا گیا تھا اس کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوا جب تک محمد علی جناح سے پہلی ملاقات نہ ہوئی۔"
>
> مسلمانوں کے قائدِ اعظم سے ملاقات کے بعد جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنی مطالعہ گاہ سے باہر قدم رکھا تو ایک لمبی گہری سانس لی اور اپنے پریس اتاشی کی طرف دیکھ کر بولے۔
>
> "باخدا! میری ساری طاقت تو اس پتھر سے لڑنے میں لگ گئی۔"

"گاندھی کے برعکس جناح جب ہندوستان واپس آئے تو ہندوستان کے طور طریقوں سے کوسوں دور تھے۔ وہ

پکے انگریز بن چکے تھے۔ وہ ایک آنکھ پر چشمہ لگاتے تھے۔ان کے لینن کے سوٹ بہت اچھے سلے ہوئے ہوتے تھے۔ ہر وقت تروتازہ دکھائی دینے کے لیے وہ دن میں تین چار بار سوٹ بدلتے تھے۔وہ اچھے کھانے کے شوقین تھے۔وہ بے حد ایماندار تھے۔مالی معاملات میں ان پر پورا بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ قانون اور اس کی حفاظت کے لیے وہ جان لڑا سکتے تھے۔

وہ سیاست میں داخل ہوئے۔دس سال تک انھوں نے کانگرس کے ہندو مسلم لیڈروں کے درمیان اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کے لیے کام کیا تاکہ انگریزوں کے خلاف مل کر سب جدوجہد کر سکیں۔

جناح کی سیاسی زندگی کا اہم موڑ اس وقت آیا جب 1937ء میں کانگرس پارٹی نے صوبوں میں جناح اور ان کے مسلم لیگ کا تعاون لینے سے انکار کر دیا جہاں مسلم اقلیت میں تھے۔جناح خود پسند اور خوددار تھے۔ کانگرس کا یہ قدم انھیں ایک ذاتی سانحہ سا معلوم ہوا۔ انھیں اسی دن سے ہمیشہ کے لیے یقین ہو گیا کہ کانگرس کی قیادت میں ہندوستان میں ان کے اور ان کی مسلم لیگ کے ساتھ کبھی انصاف نہ ہو سکے گا۔ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرنے کے بجائے وہ ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئے کہ ان کی ضد نے پاکستان بنوا کر ہی دم لیا۔ قانون اور وقت کی پابندی کیے بغیر جناح زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔"

> "مسلمانوں میں بھی جناح کا دوست کوئی نہیں تھا۔ساتھی ضرور تھے۔جناح کا شاگرد کوئی نہیں بن سکا، ساتھ کام کرنے والے ضرور تھے۔بہن کے علاوہ جناح کے خاندان میں کوئی اور فرد نہیں تھا۔ دراصل جناح کے خاندان میں دو افراد تھے ایک بہن اور دوسرا پاکستان کا خواب۔
>
> جناح ہر وقت اتنے چوکس اور مستعد نظر آتے تھے جیسے وہ گوشت ہڈی کے بجائے فولاد کے بنے ہوئے ہوں۔ لیکن یہ فولادی وجود محض دکھاوا اور دھوکا تھا۔اندر سے جناح کمزور، نازک اور بیمار آدمی تھے۔ان کے ڈاکٹر نے ایک بار کہا تھا کہ "زندگی کے آخری برس انھوں نے قوتِ ارادی اور سگریٹوں پر گزارے۔"(33)

کے ایل گابا اور جنرل عمر کے انٹرویوز سے اقتباسات

منیر احمد منیر نے اپنی کتاب "دی گریٹ لیڈر" میں مختلف لوگوں کے انٹرویوز کیے ان میں ایک انٹرویو کے ایل گابا کا اور ایک جنرل عمر کا ہے۔ کے ایل گابا "کنہیا لال گابا سے "خالد لطیف گابا" بنے۔وہ تقسیم کے مخالف تھے، تقسیم کے بعد بمبئی میں رہے۔ ستر کی دہائی میں وہ قائل ہو گئے کہ جناح صاحب کا فیصلہ درست تھا پھر انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں بارے کے اپنی مشہور کتاب "Passive Voice" لکھی جس کا اردو ترجمہ

"مجبوریں آوازیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جناح صاحب کے متعلق اِن دونوں شخصیات کی رائے ملاحظہ کریں:

کے ایل گابا: ایک دفعہ میں کیس میں انھیں اپنا سینئر بنانا چاہتا تھا۔ میرا موکل ڈھائی ہزار روپے سے زیادہ کی استطاعت نہیں رکھتا تھا، جبکہ ان کی فیس اس سے زیادہ بنتی تھی۔ میں نے بات کی تو انھوں نے کہا "مسٹر گابا! تم جانتے ہو کہ میں رولز رائس ہوں۔ جو رولز رائس خریدنے کا خواہش مند ہو اسے رولز رائس کی قیمت ادا کرنی چاہیئے۔"

انھوں نے کیس نہیں لیا۔ مجھے بتایا: "مسٹر گابا! میں نے اپنی زندگی میں صرف ایک بار فیس کم کی ہے، بال گنگا دھر تلک کے کیس میں، ورنہ میں نے نہ کبھی فیس میں کمی کی ہے اور نہ کسی کا کیس مفت میں لڑا۔"

وہ اتنے بااصول تھے کہ انھوں نے محض سستی شہرت کی خاطر اپنے پیشے کا تقدس اور وقار کبھی مجروح نہیں کیا۔

اوجین، راجھستان کا انھیں ایک کیس پیش کیا گیا۔ Temple (مندر) کیس۔ ایک مندر کے بارے میں ہندوؤں دو کے فرقوں میں جھگڑا چل رہا تھا۔ ایک پارٹی نے انھیں دو لاکھ روپے فیس ادا کرنے کی پیشکش کی کہ وہ ان کی طرف سے اپیل میں آرگو کریں۔ انھوں نے اس بنا پر وہ کیس لینے سے انکار کر دیا کہ اُس روز انھوں نے اسمبلی میں کسی موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ پتا ہے انھوں نے اسمبلی میں وہ تقریر کتنی دیر کی؟ صرف دس منٹ وہ اسمبلی میں بولے۔ اور بہت خوش تھے۔ یہ 36-1935ء کی بات ہے۔ اصول کے اتنے پابند تھے کہ دس منٹ کی تقریر کی خاطر دو لاکھ کی خطیر رقم ٹھکرا دی۔"

جنرل عمر ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

"ہمارے کیبن کا دروازہ بند تھا۔ کسی نے اسے کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ جب اس نے زیادہ ہی کھٹکھٹایا تو میں نے کھڑکی کا شٹر شیشہ اٹھایا۔ وہ صاحب بالکل کھڑکی کے سامنے آ گئے۔ وہ صاحب شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس ایک معزز آدمی تھے۔ انھوں نے ڈبے کے اندر آکر قائداعظم سے بات کرنے کی خواہش کی۔ میں نے انکار کیا۔ وہ مصر ہوئے: "بھئی میں ایم ایل اے ہوں۔" میں نے کہا "صاحب جو کچھ بھی ہو قائداعظم تھکے ماندے آرام فرما رہے ہیں، انھیں ڈسٹرب نہ کریں تو بہتر ہے۔" وہ صاحب کہنے لگے "میں امرتسر ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کا پریزیڈینٹ ہوں۔ میرا نام شیخ صادق حسین ہے۔" چونکہ نعروں کا شور تھا اس

لیے شیخ صاحب چیخ چیخ کر بات کر رہے تھے۔ان کا اصرار دیکھ کر قائد اعظم اٹھ کر بیٹھ گئے اور کہا "انھیں اندر آنے دیں۔" شیخ صاحب اندر تشریف لائے۔ قائد اعظم نے انھیں بیٹھنے کو کہا پھر کہا "(Yes)" فرمایئے۔ شیخ صاحب نے جواب میں قائد اعظم کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا۔ "میں آپ کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔"

قائد اعظم کو یہ بات پسند نہ آئی فرمایا" آپ اتنے ذِمہ دار آدمی ہیں۔ اسمبلی کے ممبر ہیں۔ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے پریزیڈنٹ ہیں۔ میں سمجھا آپ کام کی بات کے لیے بیتاب ہیں۔ آپ نے خوامخواہ میرا وقت ضائع کیا اور اپنا بھی۔ مہربانی فرما کر آپ تشریف لے جائیں۔"(34)

جی الانا کی کتاب سے اقتباس

کانگرس کے ناگ پور اجلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے جی الانا لکھتے ہیں:

"جب بھی وہ گاندھی کا ذکر کرتے تو جان بوجھ کر انھیں مہاتما کے بجائے مسٹر گاندھی کہا کرتے۔لوگ چیختے چلاتے کہ مہاتما گاندھی کو "مہاتما گاندھی" کہو۔ لیکن وہ ان باتوں کا کوئی اثر قبول نہ کرتے اور لوگوں کے شوروغل سے بے نیاز ان کو بدستور مسٹر گاندھی کہتے رہے۔اپنی تقریر کے دوران میں ایک بار انھوں نے مولانا محمد علی کو "مسٹر محمد علی" کہاتو لوگ پھر مشتعل ہو گئے اور آوازیں آنے لگیں "نہیں نہیں مولانا محمد علی کہو۔" چند منٹ اسی طرح ہنگامہ ہوتا رہا اور جب سکون ہوا تو جناح نے مجمع پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے بڑی گھمبیر آواز میں کہا "میں آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ مجھے یہ حق ہے کہ میں کسی شخص کو جس لقب سے چاہوں، مخاطب کروں بشرطیکہ وہ ناشائستہ نہ ہو۔ میں مسٹر محمد علی کو مولانا تسلیم نہیں کرتا۔"

کہا جاتا ہے کہ مولانا شوکت علی اس پر بڑے ناراض ہوئے اور اپنے بھائی کی توہین کو ذاتی توہین سمجھ کر لاٹھی لے کر مسٹر جناح کی طرف بڑھے لیکن عدم تشدد آڑے آگیا۔

(میٹ مسٹر جناح اے۔اے رؤف۔ مطبوعہ 1955ء صفحہ نمبر 235)(37)

سابق وزیرِ اعظم پاکستان چوہدری محمد علی کے تاثرات

سابق وزیر اعظم پاکستان اپنی کتاب "ظہور پاکستان "میں جناح صاحب کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جناح اکثر و بیشتر امور میں گاندھی سے بالکل برعکس تھے۔ طرز معاشرت اور لباس کے اسلوب میں وہ ایک عوامی لیڈر کی وضع قطع سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے کبھی مذہبی آدمی ہونے کا ڈھونگ نہ رچایا، پھر وہ شخصی نمائش اور مذہبی دکھاوے سے کام نکالنے کے ہر ڈھب سے از حد متنفر تھے۔ ان کی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ عہدہ و منصب کے وہ کبھی حریص نہ بنے، نہ خوشامد اور چاپلوسی سے رام ہو سکتے تھے اور نہ دھمکیوں یا مظاہرہ قوت سے انھیں مرعوب کیا جاسکتا تھا۔ ان کی زبان اینچ پینچ سے پاک اور مختصر و جامع ہوتی تھی۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ان کی گفتار میں کوئی دوسرے معنی نہیں ملیں گے۔ وہ جو کچھ زبان پر لاتے تھے وہی ان کے دل میں ہوتا تھا۔ مخالفوں سے کبھی کبھار ان کا درشت لہجہ ان کی نخوت ور عونت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ ریاکاری کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سیاسی جنگ کے فن میں ہر و کامل تھے، لیکن کسی مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے وہ "روحانی قوت" کے استعمال کے روادار نہ تھے، اور نہ ہی مشکلات سے بچ نکلنے کی کوشش میں اپنی "باطنی آواز" کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔"(38)

جناح صاحب کے سیکرٹری کے ایچ خورشید کی رائے

کے ایچ خورشید اپنی کتاب "قائد اعظم کی یادیں" میں کچھ ان الفاظ میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔

"مثلاً جب انھوں نے ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کو کانگرس کا شو بوائے قرار دیا تو خود مسلمانوں میں سے بعض کو ان کے یہ الفاظ ناگوار گزرے۔ لیکن جتنا عرصہ میں نے ان کے ساتھ گزارا اس کے دوران کبھی انھوں نے اپنی حقیقی رائے کو ایسے انداز میں پیش نہ کیا جس پہ تصنع یا معذرت خواہی کا شائبہ گزرے۔ ان کی بیباک طبع کو سیاست میں بھی چکنی چپڑی باتیں گوارا نہیں تھیں۔ 1947ء میں ڈاکٹر سید حسن نے، جو اس وقت دہلی میں تھے، انھیں ٹیلی فون کر کے ملاقات کے لیے وقت مانگا، اس کا جو مختصر سا جواب انھوں نے دیا وہ ان کی صاف گوئی کا بہت اچھا نمونہ ہے "آپ غدار ہیں۔ میں آپ سے نہیں مل سکتا۔"۔(39)

یہ جناح صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کے واقعات ہیں جس میں اُن کے وکالت کے ساتھیوں سے لیکر اُن کے سیاسی حلیفوں اور حریفوں کی رائے شامل ہیں۔ ان تمام واقعات کو یہاں درج کرنے کا مقصد اتنا ہے کہ آپ جناح صاحب کی شخصیت کے بارے میں جان سکیں یہ میں اب قارئین پر چھوڑتا ہوں کہ یہ سب پڑھ کر

کیاواقعی انھیں لگتا ہے کہ جناح صاحب کی شخصیت اتنی کمزور تھی جسے آگے بڑھنے کے لیے بیساکھیوں کی ضرورت پڑتی؟ آگے چل کر ولی خان کے مخصوص الزامات پر بھی بات کرتے ہیں۔

"ایجنٹ"لقب کی داستان کی ابتدا

ایجنٹ کہلوانے کی یہ بات اور الزام بہت پرانے ہیں۔ ولی خان نے ان الزامات کی قے کی، جو اس کے آقاؤں نے اس کے منہ میں ڈالے تھے۔ ولی خان کے الزامات پڑھ کر نہ جانے کیوں مجھے ژاں پال سارتر کی یہ تحریر یاد آتی ہے جو اس نے فرانز فینن کی کتاب "The Wretched of the Earth" کے دیباچے میں مغرب سے مرعوب "دیسیوں" کے بارے میں لکھے تھے:

> "ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس سرزمین پر دو ارب لوگ بستے تھے، آدھے ارب انسان اور ڈیڑھ ارب دیسی، حق اوّل الذکر کے پاس تھا اور فریضہ دوسروں کے پاس... ان دونوں کے درمیان چھوٹے موٹے بادشاہ، جاگیر دار اور سرمایہ دار تھے۔ سر سے پاؤں تک مصنوعی اور بناوٹی جن کا کام دلالی تھا۔ نو آبادیوں میں تو حقیقت ننگی تھی مگر "مادر وطن" کے فرزند اسے ملبوس دیکھنا پسند کرتے تھے۔ دیسی باشندوں کو ان سے محبت کرنی پڑتی تھی۔ کچھ اس طرح جیسے ماں سے کی جاتی ہے۔ یورپی دانشوروں نے دیسی دانشوروں کا ایک خاص طبقہ ڈھالنے کا تہیہ کر لیا۔ انھوں نے ہونہار نوجوانوں کا انتخاب کیا۔ انھیں مغربی تہذیب کے اصولوں سے داغا، اسی طرح جیسے گرم لوہے سے داغتے ہیں۔ ان کے منہ میں بلند آہنگ فقرے ٹھونسے، شاندار چپچپے الفاظ بھرے جو دانتوں سے چپک کر رہ گئے۔ کچھ دن مادر وطن میں گزار کر انھیں گھر واپس بھیج دیا جاتا۔ اب ان پر سفیدی پھیر دی جاتی تھی۔ یہ وہ چلتے پھرتے دروغ گو تھے جن کے پاس اپنے بھائیوں کے لیے کوئی پیغام نہ ہو، وہ محض بازگشت تھے"

چلتے پھرتے دروغ گو ولی خان کے الزامات محض بازگشت ہیں۔ اس کی ابتدا کہیں اور سے ہوئی۔ اس کا آغاز اس وقت سے ہو چکا تھا جب جناح صاحب نے گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔ ہوم رول لیگ کے جناح کے ساتھی اور متحدہ ہندوستان کے حامی کانجی دوار کاداس کے مطابق گاندھی جب سے ہندوستانی سیاست میں متحرک ہوئے تو ان کا فلسفہ تھا کہ "مجھ سے اتفاق کرو ورنہ سیاست میں تمھاری کوئی جگہ نہیں"۔ کانجی جناح گاندھی اختلافات کی شروعات بارے لکھتے ہیں کہ:

"ہم لوگوں کو کلکتہ سے بمبئی لوٹے پندرہ روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ گاندھی جی نے جناح پر گویا بم کا گولا مارا۔ بات یہ ہوئی کہ گاندھی جی نے علی برادران سے مل کر تحریکِ خلافت کی جو حمایت کی تھی وہ جناح کو بالکل ناپسند تھی اور یہ بات گاندھی جی کو سخت ناگوار گزری۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے مسلم لیڈروں سے جن میں علما اور مذہبی پیشوا بھی تھے، ایک سمجھوتہ کیا جس کی شرط یہ تھی کہ اگر مسلمان لیڈر انڈین ہوم رول لیگ میں اپنے تعاون کا اعلان کر دیں اور گائے کا ذبیحہ بند کرنے کا وعدہ کر لیں تو گاندھی جی ہندوؤں کو تحریک خلافت کی حمایت پر آمادہ کر لیں گے۔ اس وقت جناح اور عمر سوبانی دونوں نے گاندھی جی کو اس سودے بازی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے گاندھی جی کو متنبہ کیا کہ ملکی سیاست میں مذہبی رعایت مناسب نہیں ہے مگر ان دنوں علی برادران اور گاندھی جی دونوں کا نعرہ تھا "جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارا مخالف ہے۔ جو گاندھی جی کے ساتھ نہیں، وہ غدار اور ٹوڈی ہے۔ برطانوی ایجنٹ ہے، ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔" اس قسم کی نعرہ بازی اور پروپیگنڈے کے جو لوگ شکار ہوئے ان میں جناح کی شخصیت سب سے نمایاں اور اہم تھی۔"(40)

کانجی نے اپنی کتاب میں مزید حوالے بھی دیے کہ کانگرسی ہائی کمان یعنی ولی خان کے مالکوں کی طرف سے اس وقت سے ہی جناح صاحب کی شخصیت پر گھٹیا اور رقیق حملے کیے جاتے رہے:

"جناح ایک سچے اور عظیم نیشنلسٹ تھے انھوں نے مختلف الخیال مسلم لیڈروں کو ہموار کر کے ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کی نہایت مخلصانہ اور جان توڑ کوشش کی۔ ان کی کوششوں کی خاطر نہ سہی، ہندوستان کی بہبودگی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ کامیاب ہوتے۔ ٹائمز آف انڈیا میں ایک ہفتہ وار فیچر مضمون (مسلمانوں کی نظر سے) کے عنوان سے نکلا کرتا تھا اس فیچر میں جناح کی کوششوں کے بارے میں بعض نہایت غیر معروف اور گھٹیا قسم کے اردو اخباروں کے مضامین کے حوالے چھاپے جاتے تھے۔ اگرچہ ان اردو اخباروں کی عوام میں کوئی وقعت نہ تھی لیکن ان کے مضامین گورنمنٹ کے اورینٹیل ٹرانسلیٹر کے محکمے سے ترجمہ کرا کے ٹائمز آف انڈیا کو بھیجے جاتے۔ ذاتی علم کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس سے گورنمنٹ کا مقصد مذہبی عناد پیدا کرنا اور فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

> دوسری طرف کانگرسی اخبار "بمبئی کرانیکل" نے جناح کے خلاف یہ لکھ کر الگ محاذ قائم کیا کہ وہ پکے فرقہ پرست ہیں۔ میں نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جناح ہرگز فرقہ پرست نہیں تھے۔ کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبد اللہ بریلوی بڑے نرم طبیعت اور مرنجاں مرنج انسان تھے لیکن کانگرس ہائی کمان کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے جناح پر رکیک جملے کسے اور ایسے ذلیل الزامات لگائے جن سے جناح کی شخصیت صرف مشتبہ ہی نہیں بلکہ مکروہ نظر آنے لگی۔ میں جانتا ہوں کہ ان جھوٹے الزامات سے جناح کو کتنا سخت صدمہ پہنچا اور ان کا رنجیدہ ہونا بالکل درست بھی تھا۔"(41)

یہ کوئی ریاستی سچ نہیں، مطالعہ پاکستان کا کوئی باب نہیں یہ متحدہ ہندوستان کے حامی ایک ہندو کی تحریر ہے وہ لکھ رہے ہیں کہ جو گاندھی کے ساتھ نہیں وہ غدار ہے، وہ ٹوڈی ہے وہ ایجنٹ ہے مزید یہ کہ اپنے پروپیگنڈے کے توپ خانے سے کانگرسی ہائی کمان جناح صاحب پر یہ گولہ باری اس وقت سے کرتے آرہے ہیں جب سے جناح صاحب نے گاندھی کے آمرانہ انداز سے اختلاف کیا اس لیے ولی خان کے الزامات کوئی نئی بات نہیں ہیں۔

ان الزامات کے بیک گراؤنڈ، جناح کی شخصیت اور ان الزامات کی بنیاد کیسے پڑی، کو جاننے کے بعد ولی خان کی کتاب کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ موصوف کس قسم کے الزامات لگاتے ہیں اور ان الزامات کی حقیقت کیا ہے۔

سرحد میں ریفرنڈم کے بارے میں ولی خان کی غلط بیانیاں

موصوف اپنی کتاب "حقائق حقائق ہیں" کے صفحہ نمبر 236 پر ریفرنڈم کے اعداد و شمار سے کھیلتے نظر آئے۔ لکھتے ہیں کہ:

> "یہ ریفرنڈم صرف چھ اضلاع میں ہوا تھا۔ صوبہ سرحد سے ملحق چھ ایجنسیاں بھی اس سے باہر تھیں۔ قبائلی علاقہ شامل نہ تھا، اور تو اور چھوڑیں سوات، دیر، ترال اور امب کی ریاستیں بھی شامل نہ تھی۔ تو یہ سب آبادی ملا کر تقریباً ستر اسی لاکھ افراد بنتے ہیں۔ جن میں سے صرف لاکھ بلکہ اس سے بھی کم لوگوں نے ووٹ دیا ہے۔"(42)

زاہد چوہدری اپنی کتاب میں ان الزامات کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

> "عبدالولی خان نے اپنے بیان میں صوبہ سرحد کے باقاعدہ اضلاع، قبائلی علاقوں اور سرحدی ریاستوں کی کل آبادی کا ذکر کرتے ہوئے جو مؤقف اختیار کیا کہ ڈیورنڈ لائن سے

اوپر بسنے والے پٹھانوں کی ستر لاکھ آبادی میں سے صرف تین لاکھ نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیے تھے، اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہو گی۔ اس کے اس مؤقف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص پاکستان کے بارے میں کس قدر منافقانہ اور معاندانہ روّیے کا حامل ہے۔ معلوم نہیں کہ اس قسم کے عناصر محض اپنی سیاسی کج روی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اس قدر گمراہ کن بیان بازی کیوں کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت محدود طریقہ انتخاب صرف صوبہ سرحد میں ہی رائج نہیں تھا بلکہ پورے برصغیر میں یہی طریقہ رائج تھا۔ 46-1945ء کے عام انتخابات بھی، جن میں صوبہ سرحد کی کانگرس پارٹی کو کامیابی ہوئی تھی، اسی طریقہ انتخاب کے تحت ہوئے تھے۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ اسی محدود طریقہ انتخاب کی بنیاد پر قائم شدہ اسمبلیوں نے کیا تھا اور سلہٹ میں ریفرنڈم بھی اسی طریقہ انتخاب کے تحت ہوا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کی بنیاد اسی طریقہ انتخاب پر تھی۔

کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم نے جب ریفرنڈم پر اعتراض کیا تھا اس کی وجہ یہ نہیں بتائی تھی کہ طریقہ انتخاب محدود ہے بلکہ یہ کہ اس میں "آزاد پختونستان" کے بارے میں تیسرا سوال شامل نہیں ہے۔ سارے برصغیر میں 1947ء کے دوران کبھی کسی نے محدود طریقہ انتخاب کا سوال اٹھایا ہی نہیں تھا کیونکہ طریقہ انتخاب کو وسیع کیا جاتا تو اقتدار کی منتقلی میں تاخیر ہوتی اور یہ بات کانگرس کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔

جہاں تک سرحدی ریاستوں کی آبادی کا تعلق تھا اس کے ریفرنڈم میں حصہ لینے کا اس لیے سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ تقسیم کے منصوبہ کے تحت برصغیر کے کسی بھی ریاست کے عوام کو یہ حق نہیں دیا گیا تھا اور 1947ء میں کسی بھی ہندوستانی ریاست کے عوام نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے اپنا یہ بنیادی حق استعمال نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ یہ اصول غیر جمہوری تھا لیکن انگریز، کانگرس اور مسلم لیگ تینوں ہی اس آئینی اصول پر اتفاق کر چکے تھے اور پھر سرحد کی کانگرس یا خدائی خدمت گار تنظیم نے 1947ء میں سرحدی ریاستوں کے عوام کے لیے اس حق کا کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے ریفرنڈم کا بائیکاٹ اس لیے کیا تھا کہ سرحدی ریاستوں کے عوام کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔

قبائلی علاقوں کی آبادی کے بارے میں عبدالولی خان کا بیان غلط اور گمراہ کن ہے۔ اس نے یہ غلط بیانی اس لیے نہیں کی تھی کہ اسے حقائق کا علم نہیں بلکہ اس لیے کی ہے کہ یہ سچ

بولنا ہی نہیں چاہتا۔ ولی خان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ برصغیر کے کسی بھی قبائلی علاقے میں محدود یا وسیع طریقہ انتخاب رائج نہیں تھا۔ ان علاقوں میں نہ صرف رائے دہندگان کی فہرست کبھی تیار نہیں ہوئی بلکہ کبھی مردم شماری بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے یہاں "ریفرنڈم کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"(43)

اسی ریفرنڈم بارے کانجی نے ایک امریکی صحافی کو درج ذیل خط لکھا جس میں باچاخان کے الزامات کو غلط قرار دیا:

بمبئی

26جولائی1947ء

مائی ڈیئر ڈیوڈ

"ایک متوازن اور باخبر امریکی صحافی نے، جو ابھی ابھی دہلی اور صوبہ سرحد سے لوٹا ہے، مجھے بتایا ہے کہ استصواب رائے منصفانہ طور پر کرایا گیا ہے اور خان عبد الغفار کی شکایتیں غلط ہیں۔ اسکے مطابق ڈاکٹر خان صاحب پراگندہ ذہن ہیں اور دونوں خان برادران کانگرس کی بے اعتنائی پر خفا نظر آتے ہیں۔ سرحد کے لیگی رہنما نہیں چاہتے کہ افغانستان کوئی مداخلت کرے۔ مسلم لیگ کے ایک جلسے میں یہ نعرے لگائے جا رہے تھے "امان اللہ کو صوبہ سرحد میں واپس لایا جائے تاکہ افغانستان کی سرگرمیوں کو قابو میں لایا جاسکے۔"

آپ یہ خط ہمارے دوستوں کو بھی دکھا سکتے ہیں۔

آپ کا ہمیشہ

کے ڈی

جناح ولنگڈن ناچاقی کے بارے میں ولی خان کی یک طرفہ رائے

اپنی کتاب کے صفحہ نمبر25 میں لکھتے ہیں کہ:

"جب سے اروِن کی جگہ لارڈ ولنگڈن وائسرائے بنا تو جناح صاحب ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے انگلستان چلے گئے۔ ایسا سننے میں آیا تھا۔ ان دنوں جناح صاحب اور ولنگڈن کے مابین کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی تھی۔

سننے میں آیا ہے ولنگڈن صاحب بمبئی کا گورنر تھا۔ اس نے اپنے گھر میں دعوت کی تھی۔ جس میں جناح صاحب کو اس کی اہلیہ (جو پارسی تھی) کے ساتھ مدعو کیا تھا۔ گورنر ولنگڈن

کی بیوی بہت جابر عورت تھی۔ اس نے جب مہمانوں کو دیکھا تو جناح صاحب کی اہلیہ نے لباس ایسا پہنا تھا۔ جو لیڈی ولنگڈن کے اندازے کے مطابق بہت کم تھا اور اس موجودہ محفل کے مناسب نہ تھا۔ تو لیڈی ولنگڈن نے اپنے .A.D.C کو کہا کہ مسز جناح کو سردی لگ رہی ہے۔ اگر ایک شال لادو کہ اپنے گرد لپیٹ دے یہ بات سب نے سن لی۔ جناح صاحب نے محسوس کیا کہ میری بیوی کی توہین ہوئی ہے وہ مع اپنی اہلیہ کے اس محفل سے چل پڑا۔ اس طرح سے اس کے اور گورنر ولنگڈن کے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ جب تو ولنگڈن گورنر تھا۔ لیکن اب کہ وہ ہندوستان کا بااختیار وائسرائے کی حیثیت سے دہلی آیا۔ جناح نے خیریت اس میں دیکھی کہ ملک چھوڑ دے۔"(44)

کتنے مزے کی بات ہے کہ کتاب کا نام "حقائق حقائق ہیں" اور یہ "حقائق" ایسے بیان کیے جارہے کہ "سننے میں آیا"۔ خیر ولی خان کی یہ سنی سنائی اس حد تک درست ہے کہ یہ واقعہ ہوا ضرور ہے لیکن موصوف کی یہ بات کہ جناح کی بیوی پارسی تھی، بالکل غلط ہے۔ جب شادی ہوئی تو رتی مسلمان ہو گئی تھی ہاں بعد میں علیحدگی ہو گئی۔

کانجی، جو جناح صاحب اور رتی دونوں کا دوست تھا، نے رتی پر ایک کتاب بھی لکھی، میں میں لکھتے ہیں کہ:

"جس روز رتی کی عمر 18 سال ہوئی، اسی دن اس نے اپنے والدین کے گھر کو خیر آباد کہا، اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد جناح سے اس کا نکاح ہو گیا"(45)

چونکہ موصوف نے ٹھان لی ہے کہ جناح کو برطانویوں کا ایجنٹ اور برا ثابت کر کے رہنا ہے اس لیے وہ ہر واقعے کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں جس سے جناح صاحب کی تحقیر ہوتی ہو۔ جیسے آخری فقرہ پڑھ لیں "جناح نے خیریت اس میں دیکھی کہ ملک چھوڑ دے۔" یعنی موصوف تاثر یہ دینا چاہ رہے ہیں کہ جناح صاحب بھاگ گئے۔

یہی واقعہ، ہیکٹر بولتھو نے اپنی کتاب میں بھی بیان کیا لیکن مختلف انداز میں "ایک رات جناح اور ان کی بیگم گورنمنٹ ہاؤس میں کھانے پر مدعو تھے۔ مسز جناح نے جو بلاؤز اس موقع پر پہن رکھا تھا، اس کا گلا اتنا کھلا تھا کہ لیڈی ولنگڈن اسے دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو گئیں۔ جب مہمان کھانے کی میز پر بیٹھے تو لیڈی صاحبہ نے ایک اے ڈی سی سے کہا کہ وہ مسز جناح کے لیے کوئی شال لے آئیں، شاید انھیں سردی محسوس ہو۔ یہ سنتے ہی جناح اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "جب مسز جناح کو سردی لگے گی تو وہ خود ہی شال مانگ لیں گی"۔ پھر وہ اپنی بیوی کو ڈائننگ ہال سے باہر لے گئے اور اس کے بعد کبھی گورنمنٹ ہاؤس میں قدم نہ رکھا۔"(46)

موصوف کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے میں کچھ اور واقعات بھی درج کرونگا کہ جناح کوئی ایسی کمزور ہستی نہیں تھے کہ وائسرائے سے تعلق خراب ہونے پر بھاگ جاتے۔اسی ولنگڈن کے بارے کانجی اپنی کتاب میں کچھ مزید واقعات پیش کرتے ہیں۔

"وار کانفرنس کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "سن 1918ء میں دلی میں "وار کانفرنس"منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں لوکمانیہ تلک کو شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔اس کے بعد ایسی ہی ایک کانفرنس بمبئ میں بھی کی گئی جس میں ہوم رول لیگ کو مدعو کیا گیا تھا۔ جناح، لوکمانیہ تلک، کیلکر، ہارنی مین وغیرہ اس میں شریک ہوئے۔جلسہ شروع ہوا تو تلک ایک تجویز پیش کرنے کھڑے ہوئے۔ابھی ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلنے پایا تھا کہ لارڈ ولنگڈن نے انھیں "آوٹ آف آرڈر" کہہ کر بولنے سے روک دیا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا۔پھر کیا تھا ہوم رول لیگ کے جتنے لیڈر وہاں جمع تھے سب کے سب جلسہ گاہ سے احتجاجاً اُٹھ کر چلے گئے لیکن جناح بیٹھے رہے۔پھر انھوں نے اپنی تقریر میں تلک کی اہانت پر ولنگڈن کے روّیے کی سخت مذمت کی۔جناح کی انتہائی شرربار تقریر حاضرین دم بخود ہو کر سنتے رہے۔تقریر ختم کر کے جناح بھی جلسہ گاہ سے باہر نکل آئے۔"(47)

اسی طرح اپنی کتاب میں کانجی ایک اور دلچسپ اور اہم واقعہ بیان کرتے ہیں جب موصوف کے ممدوح گاندھی جی بھاگ گئے اور جناح اسی گورنر کے سامنے کھڑے رہے اور آج تک بمبئ میں اس بہادری پر جناح کے نام پر ایک ہال موجود ہے۔

" اوائل نومبر میں لارڈ اور لیڈی ولنگڈن کے بعض وفادار دوستوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گورنری کے عہدے سے سبکدوش ہونے پر بمبئ کے شہریوں کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے۔ہوم رول لیگ کے ارکان اور جناح نے اس کی مخالفت کی۔ہم سب کا کہنا تھا کہ جن لوگون کو سپاس نامہ دینا ہو وہ بڑے شوق سے لارڈ کے دوستوں اور مداحوں کی حیثیت سے دیں لیکن بمبئ کے شہریوں کے نام پر یہ تقریب منعقد نہ کی جائے۔

ان دنوں گاندھی جی تقریباً ہر ہفتے بمبئ آیا کرتے تھے۔ایک دن ہم لوگ ان کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ وہ بھی ہماری تحریک کی تائید کریں لیکن جس طرح مسز بیسنٹ کے شہر بدر کیے جانے کے معاملے میں انھوں نے مایوس کیا تھا اس موقع پر بھی انھوں نے وہی کیا۔عذر پیش کیا کہ وہ تو احمد آباد کے شہری

ہیں، ہماری تحریک کی تائید کیسے کر سکتے ہیں، ہم نے ان کو ہزار سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ اصولی بات ہے، اس کا تعلق شہریت سے نہیں، لیکن وہ برابر انکار کرتے رہے۔

شیرف آف بمبئی کا طلب کیا ہوا جلسہ ٹاؤن ہال میں 10 دسمبر 1918ء کو ہونے والا تھا اور اس میں لارڈ ولنگڈن کو ایڈریس پیش کیا جانے والا تھا۔ ہم تین سو آدمی جناح کی رہنمائی میں ایک دن پہلے رات کے دس بجے ٹاؤن ہال پہنچ گئے تاکہ صبح دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے ہال میں گھس جائیں۔ اگلے دن واقعی ہم سب آٹھ بجے صبح ہال میں داخل ہو گئے اور چھ بجے شام تک وہاں جمے رہے۔ جناح کی شاندار کامیابی سے لوگ اتنے خوش ہوئے کہ عمر سوبانی نے "جناح میموریل ہال" کی شکل میں ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور لوگوں سے ایک ایک روپیہ چندہ دینے کی اپیل کی۔ ایک ہی مہینے کے اندر 65 ہزار روپے جمع ہو گئے جس سے گانگرس ہاؤس کے احاطے میں ہال بنوایا گیا۔ یہ ہال گانگرس ہاؤس کے کمپاؤنڈ میں موجود ہے اور اس پر کتبہ لگا ہے جس کے الفاظ ہیں:

> "This Hall Has Been Raised by The Citizens of Bombay to Commemorate Their Historic Triumph of the 10th December 1918 Under The Brave and Brilliant Leadership of Muhammad Ali Jnnha. " (48)

جناح صاحب نے اس وقت ایک تقریر بھی کی:

> "دوستو، بمبئی کے شہری تم ہو (وہ نہیں جو ولنگڈن کو الوداع کہنے ٹاؤن ہال میں جمع ہوئے تھے)۔ آج تمہاری کوشش سے جمہوریت نے ایک بڑی فتح حاصل کی ہے۔ تمہاری اس کامیابی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک مطلق العنان حکمران اور اس کی حکومت کے کارندے سب مل کر بھی تمہیں نہ ڈرا سکے۔ 18 دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں بڑا سعید و مبارک دن ہے۔ دوستو، جاؤ اور جمہوریت کی اس کامیابی پر خوشیاں مناؤ۔" (49)

جسونت سنگھ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 71 میں جناح کے بارے میں ولنگڈن کی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

> "1918ء کے اوائل تک بمبئی کے اس وقت کے گورنر ولنگڈن نے انھیں پنڈت مدن موہن مالویہ، بال گنگا دھر تلک اور اینی بیسنٹ کے ساتھ ایسے لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا جو بقول ان کے "ایسے انتہا پسند تھے جنھیں بحرانی دور سے گزر رہے سامراج کے تئیں اپنے فرائض کا ذرا بھی احساس نہیں تھا" جیمس فورڈ بھی کونسل میں جناح کی سخت تنقیدوں کی وجہ سے ان سے اتنے ہی ناراض تھے۔ ولنگڈن کے جانشین سر جارج لائڈ نے

بعد میں مونٹیگو کو انتباہ کر دیا تھا کہ "جناح اور مسز نائیڈو دونوں ہی بات کے صاف مگر دل میں ہماری سخت مخالفت کرنے والوں میں سے ہیں جنھیں کبھی مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔"

رولٹ ایکٹ کے منظور کیے جانے کے خلاف اپریل 1919ء میں جناح نے وائسرائے کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ اس وقت تک وہ بمبئی کے ہوم رول لیگ کے صدر منتخب ہو چکے تھے، کیونکہ 1917ء میں اینی بیسنٹ نظر بند کر دی گئی تھیں۔ وائسرائے کو بھیجا گیا ان کا استعفیٰ نامہ انتہائی جذباتی تھا:

"بل کو منظور کر کے یور ایکسیلینسی کی حکومت نے انھی اصولوں کو بیدردی سے کچل دیا جن کے لیے گریٹ بریٹن نے جنگ لڑی تھی۔ انصاف کے بنیادی اصولوں کو تباہ کر دیا گیا اور لوگوں کے آئینی حقوق کو پامال کیا گیا ہے۔ وہ بھی ایسی صورت حال میں جب ریاست کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی حد سے زیادہ گھبرائی ہوئی اور نااہل نوکر شاہی کے ذریعہ اٹھایا گیا قدم ہے جو نہ تو لوگوں کے تئیں جواب دہ ہے اور نہ ہی حقیقی عوامی رائے سے اس کا کوئی تعلق ہے۔"(50)

جناح صاحب کے ہندوستان چھوڑنے بارے جسونت سنگھ اپنی کتاب میں تفصیلی نظر ڈالتے ہوئے لکھتے کہ:

"سوال اٹھتا ہے کہ: کیا یہ ایک طرح کی جلاوطنی تھی؟ ہندوستانی سیاسی زندگی سے دست برداری کی پہل تھی یا کچھ اور؟ جناح نے اس وقت کے ایک جدید علاقہ ہیمپسٹیڈ میں ایک بڑا اور کشادہ مکان خریدا اور اپنی اکلوتی بیٹی دینا کو پاس کے ایک پرائیویٹ سکول میں داخل کرایا۔ یہ اپنی مرضی کی جلاوطنی تھی یا نہیں، اس کے بارے میں آج بھی کافی قیاس آرائیاں جاری ہیں اور ان دنوں بھی ہوئیں۔ حقیقت میں ایسے کئی ذاتی اور اجتماعی اسباب تھے جن سے جناح کو لندن میں رکنا پڑا شاید اس طرح انھوں نے فرصت اور آرام کا کچھ عرصہ حاصل کیا ہو، کیونکہ سچ مچ ان دنوں جناح ایک طرح کے سیاسی "نومینز لینڈ" (ویلز) میں تھے۔ ساتھ میں ولنگڈن سے ان کی شدید نااتفاقی بھی تھی۔ اصل میں جناح نے بعد میں سینئر صحافی درگاداس کو بتایا تھا کہ "میں لندن اس لیے آیا ہوں کہ میں اس واہیات وائسرائے سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔" لیکن لگتا ہے کہ یہ محض ایک بنائی ہوئی بات تھی کیونکہ وائسرائے سے بدمزگی تو کافی عرصے سے چلی آرہی تھی۔"

جناح کے تئیں جواہر لعل نہرو کی تلخ ناپسندیدگی اور گاندھی سے ان کی مسلسل خط و کتابت، جو مسلم مفادات کے خلاف رہی، ان سبھی باتوں نے جناح کو گانگرس اور برٹش سول سروس، دونوں سے سخت بیزار کر

دیاتھا۔برٹش سول سروس سے ان کی ناراضگی اس لیے کہ جناح، جان گئے تھے کہ انگریز حکام ہندوستانی وزراء کے ماتحت کام کرنے سے کتراتے ہیں۔دوسری طرف نہرو نے ان کے خلاف جارحانہ رخ اختیار کر رکھا تھا۔ جناح نے جب 05 ستمبر 1931ء کی کانفرنس میں یہ بات رکھی کہ:

"نئے آئین میں مسلمانوں کے لیے مناسب ضمانت ہونی چاہیے اور اگر یہ مہیا نہیں کرائی جاتی تو نیا آئین یقیناناکام رہے گا۔"

تو اس پر جواہر لعل نہرو کا ردِ عمل بہت تیکھا تھا۔ جواہر لعل نے اسے حیران کن بکواس اور تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کا مغلوباتک قرار دیا تھا، انھوں نے جناح کے 14 نکات کو مضحکہ خیز کہااور اس کی مزید مذمت کی، جناح لگاتار مطالبہ کرتے رہے کہ ان کے 14 نکات کو پوری طرح منظور کیا جائے جس پر ستمبر کے آخر تک جواہر لعل نے تیکھا طنز کیا"اگر مجھے اپنے عزیز دوست محمد علی جناح کی 14 نکاتوں والی بکواس کو تھوڑی دیر کے لیے بھی سننے کو کہا جاتا تو میں ساؤتھ سی آئی لینڈز کی تنہائی میں چلے جانے کو سوچتا، جہاں اس کی تھوڑی بھی توقع ہو کہ کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جن کو کم از کم اتنا تو فہم ہو گا، یا اتنے نافہم نہیں ہونگے کہ 14 نکات پر بات کرنے سے باز رہیں۔"

اس ماحول میں جناح کی قیادت والی لیگ اور نہرو کی قیادت والی گانگرس کیسے ساتھ مل کر کام کر سکتی تھی۔اس کا انجام آخر کار علیحدگی اور جدائی ہی ہونا تھا۔

اس کے علاوہ جناح کا ایک گھریلو اور نجی پہلو بھی تھا۔نوجوان رتی سے ان کی شادی کی چمک دمک، ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سیاسی تقاضوں کی شدید گرم بازاری میں ماند سی پڑنے لگی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کو وقت اور توجہ کی ضرورت تھی مگر ہندوستان کی آزادی بھی ان سے یہی مطالبہ کرتی تھی، اور اس کا نتیجہ ان کی زندگی کو ہی بھگتنا پڑا۔رتی اور جناح، دونوں ایک بہت ہی گہرے صدمے سے گزرے، اور پھر تھک کر دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔اس کے باوجود جناح نے رتی سے قریبی تعلقات قائم رکھے۔آخر طویل علالت کے بعد 1929ء میں رتی چل بسیں جس کے بعد جناح کی صحت بھی کافی خراب ہونے لگی۔وہ بھی تو اب ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔وہ شدید سیاسی تناؤ کے تحت لگاتار سگریٹ اور سگار پھونکتے رہتے تھے۔ان سب کے علاوہ ان پر ایک بچی کی ذمہ داری بھی آ گئی تھی۔انھیں کچھ دنوں کے لیے تو آرام، ایک تبدیلی، ایک الگ ماحول کی ضرورت تو تھی ہی۔"(51)

درج بالا اقتباسات سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ولی خان جناح کو ایک کمزور شخص اور ایجنٹ ثابت کرنے کے لیے کس قدر جلدی میں تھے۔کسی بھی معاملے کے گہرائی میں جائے بغیر موصوف اپنی مرضی کا

کوئی واقعہ اٹھا کر اس کی من مانی تشریح کر کے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرتے نظر آئے اور یہ صرف ایک نہیں پوری کتاب میں یہی روّیہ نظر آتا ہے۔

ولی خان کے دیگر الزامات اور ان کا جواب

صفحہ نمبر 108 میں لکھتے ہیں کہ:

"وائسرائے کہتا ہے کہ جناح ہمیں برا بھلا اس لیے کہتا ہے کہ قوم کو یہ تاثر دے کہ وہ ایک قوم پرست لیڈر ہے اور اس طرح وہ عوام کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ انگریز یہاں حکمران کی حیثیت سے موجود ہو۔ وہ انگریز کے ساتھ قطع تعلق نہیں چاہتا۔ قطع تعلق تو دور، وہ اپنے تعلقات کو کمزور بھی نہیں کرنا چاہتا۔"(52)

صفحہ نمبر 195 پر سکندر مرزا کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ جناح نے سکندر مرزا کو کہا کہ:

"اس نے مزید کہا کہ اسے ڈر ہے کہ وہ پاکستان سے محروم رہے گا، اگر کچھ سنجیدہ مسئلہ پیدا نہ کیا گیا اور ایسا کرنے کے لیے موزوں ترین جگہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ جہاں قبائل آباد ہیں۔ اس کی نظر میں یہ اہم تھا کہ مسلم غصے کا اظہار ہوں، قبل اس کے برطانیہ ملک کو کانگرس کے حوالے کر دے۔ اگر پاکستان، مذاکرات کے ذریعے نہیں ملتا تو ہمیں لڑنا ہو گا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوکری سے استعفٰی دے دوں اور قبائلی علاقہ میں جا کر جہاد شروع کر دوں۔"(53)

لگتا ہے موصوف کو خود نہیں پتا کہ پچھلے صفحوں میں کیا لکھتے رہے ایک طرف وہ کہتے ہیں کہ جناح صاحب کے مطابق مسلمانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ انگریز یہاں حکمران رہیں آگے جا کر اگلے صفحوں میں اپنی لکھی ہوئی باتوں کی تردید کرتے نظر آئے کہ جناح صاحب پاکستان کے حصول کے لیے اتنے آگے گئے کہ لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اب موصوف کی کونسی بات پر اعتبار کیا جائے؟

ایک اور واقعہ پڑھ لیں۔ جب جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کو انکار کر کے خود گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا تو موصوف جناح صاحب کو عہدوں کا حریص بتاتے ہوئے صفحہ نمبر 241 پر لکھتے ہیں کہ:

"جناح صاحب نے کہا میری نظر میں میری حیثیت کے مطابق بس ایک مناسب منصب ہے گورنر جنرلی جسے میں 15 اگست کو قبول کرلوں گا ماونٹ بیٹن نے اس کے جواب میں کہا کہ گورنر جنرل کا منصب تو صرف ایک آئینی سربراہ کا ہوتا ہے۔ تمام اختیارات وزیر اعظم کے

پاس ہوں گے۔ اگر جناح صاحب کی دلچسپی اختیارات میں ہے تو پھر چاہیے کہ وہ وزیر اعظم
کا عہدہ قبول کرلے۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ وہاں میرا اختیار ہوگا میں
ہی حکم دونگا۔ اور باقی مانیں گے۔" (54)

صفحہ نمبر 242 پر ہڈسن کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جناح نے کہا" ان کا (جناح) جواب اہم تھا۔ انھوں نے کہا "میری پوزیشن میں مشورہ دینے والا میں ہونگا اور دوسرے اس پر عمل کریں" (ص 331 ہڈسن) (55)

اب ذرا پچھلے صفحے دوبارہ دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا کہہ رہے صفحہ 94-93 میں وہ لکھ چکے کہ:

"گاندھی اور کانگرس کے سب رہنما ان دنوں جیل میں تھے گاندھی جی نے برت رکھا تھا ان دنوں گاندھی جی کی رہائی کے لیے ایک تحریک چلی۔ گاندھی جی نے ایک خط میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ کانگرس کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ اگر حکومتِ برطانیہ اختیارات جناح صاحب کے حوالے کردے تو وہ ایک قومی حکومت بنالے گا۔

اس سے زیادہ کانگرس کیا کرتی۔ افہام و تفہیم کی خاطر وہ کہاں تک پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ انتخابات ہم نے جیتے ہیں۔ حکومت کرنے کا حق ہمارا ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں تم اختیارات جناح صاحب کے حوالے کر دو۔ لیکن اقتدار ہندوستان کو دے دو۔ مگر عجیب تماشا تو یہ تھا کہ اس پیش کش پر انگریز خاموش رہا لیکن قومی حکومت بنانے کی مخالفت جناح صاحب اور لیاقت علی خان نے کی، ڈھٹائی کی بھی حد ہوتی ہے۔ انگریز نے اپنی تمام تر بے ایمانی، بدنیتی، بددیانتی، دھوکا، فریب، ظلم، زیادتی سب کچھ کو نہایت صفائی اور چالبازی سے مسلم لیگ اور جناح صاحب کے گلے میں ڈال دیا اور مسلم لیگ اور اس کے اس وقت کے لیڈر کتنی دیدہ دلیری سے انگریز کی اس پالیسی کو کس خوشدلی اور فخر سے آگے لے جارہے تھے۔ میں کہتا ہوں، اسلام کا مقام تو بہت بلند ہے۔ یہاں تو انسانیت اور شرافت کے تقاضے بھی پورے نہ ہوسکے۔" (56)

ساتھ ساتھ صفحہ نمبر 204 پڑھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ لکھتے ہیں کہ:

"جیسے ہی ماؤنٹ بیٹن دلی پہنچا، اس نے سیاسی لیڈروں سے بات چیت شروع کردی۔ پہلی ملاقات گاندھی جی سے کی۔ گاندھی جی نے کہا کہ کانگرس کے متعلق جناح صاحب کو ایک بدگمانی ہے۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے میری ایک تجویز ہے۔ وہ یہ کہ اس موجودہ عبوری حکومت کو توڑدیں اور نئی حکومت بنانے کا اختیار جناح صاحب کو دے دیں۔ وہ جسے

> مناسب سمجھیں اپنی وزارت میں لے لیں۔ ہم دنیا کو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے آپس میں فیصلہ کر لیا ہے اور اپنے تعاون اور اتحاد کی خاطر مشترک زندگی گزارنے پر تیار ہیں۔ اور گاندھی نے کہا جناح صاحب کی حکومت بنانے کے بعد برطانیہ کی ذمہ داری ہو گی کہ اکثریتی فرقہ کا تحفظ کرے یا اقلیتی فرقے کے حقوق کے تحفظ کی جگہ اکثریتی فرقے کے حقوق کا تحفظ کرے۔"(57)

اب موصوف کے مطابق صفحہ نمبر 241 پر اقتدار کا حریص جناح صفحہ نمبر 94-93 اور 204 پر گاندھی کی اس پیشکش کو مسترد کرتے ہیں جس میں کٹے پھٹے کے پاکستان سے کہیں بڑے متحدہ ہندوستان میں انھیں حکومت بنانے کی آفر دی گئی۔

موصوف نے صفحہ نمبر 45-244 میں ایک اور سنی سنائی "حقیقت" پیش کی جو کہ حسبِ روایت غلط ہے اور اس پر اپنی دلیل کی دیوار کھڑی کر کے جناح صاحب کو اقتدار کا حریص ثابت کیا۔ ایک واقعہ جو لیری کولنز نے فریڈم ایٹ مڈ نائٹ میں بیان کیا کہ جناح ٹی بی کے مریض تھے اور یہ بات جناح صاحب اور ان کے ڈاکٹر کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم تھی۔ چونکہ جناح صاحب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو تین سال سے زیادہ نہیں جی سکیں گے اس لیے اس نے ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل بننے نہیں دیا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

> "اس سلسلے میں ایک دوسرا دلچسپ رخ اس مسئلے کا تھا۔ (فریڈم ایٹ مڈ نائٹ) کے مصنفین نے بیان کیا ہے انھوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ جناح صاحب مدت سے (ٹی۔بی) کے مریض تھے۔ اور یہ بات اُن کے ڈاکٹروں نے اُن سے چھپا رکھی تھی انھوں نے وہ دستاویزات پیدا کر کے اس بات کی تصدیق کر لی ہے)۔ مدت تک چھپانے کے بعد آخر ڈاکٹروں اور ماہرین نے اس بیماری کا اُن کو بتا دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم زیادہ سے زیادہ دو یا تین سال زندہ رہو گے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس لیے اس عبوری دور کی محدود گورنر جنرلی بھی وہ ماؤنٹ بیٹن کو دینے پر تیار نہ تھے۔ اور انھیں یہ ڈر تھا کہ یہ عبوری دور ختم ہونے تک شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکیں۔ جناح صاحب طبعاً ایسے واقع ہوئے تھے اُن کی تسلی اونچی سے اونچی سیڑھی کے بغیر نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ یہ کب برداشت کر سکتے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن سے کمتر مقام پر بیٹھیں۔"(58)

سنی سنائی حقیقتیں بیان کرنے والے ولی خان کو شاید خبر نہیں تھی کہ جس واقعے کا تذکرہ لیری کولنز نے کیا وہ درست نہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی "قائداعظم کیا تھے کیا نہیں تھے" میں لکھتے ہیں کہ:

"ویسے تو تاریخ میں یہ ہوتا آیا ہے کہ ہر عظیم آدمی کے بارے میں ایسی روایات تشکیل دے دی جاتی ہیں کہ جو اسے دوسروں سے افضل اور برتر بنا دیں۔ جناح صاحب بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ ان کے عقیدت مندوں نے، اور بعض نے اپنے سیاسی و ذاتی مفادات کی غرض سے ان کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ان کی بیماری کے بارے میں ہے جسے دو فرانسیسی مصنفوں، لیری کولنس اور ڈومینیک لاپیر اپنی کتاب "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" میں ڈرامائی انداز میں لکھا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق " اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو، اور مہاتما گاندھی اپریل 1947ء میں اس اہم راز سے واقف ہو جاتے تو ہندوستان کی تقسیم کا عمل رک سکتا تھا۔ یہ راز بھورے رنگ کی ایک فلم کی سطح پر تھا، یہ وہ فلم تھی کہ جو ہندوستانی سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں، اتار چڑھاؤ اور ایشیا کی تاریخ کے عمل کو یقینی طور پر تبدیل کر سکتی تھی۔ لیکن یہ راز اس قدر قیمتی تھا، اور اس کی اس قدر حفاظت کی گئی کہ برطانوی سی آئی ڈی جو کہ دنیا کی بہترین تحقیقاتی ایجنسی تھی، وہ بھی اس کے وجود سے بے خبر رہی۔"

یہ حوالہ جناح صاحب کے ان ایکسرے رپورٹس کے بارے میں ہے کہ جن میں ٹی بی کے مرض کی تشخیص کی گئی تھی۔ اس پورے بیان کو ڈرامائی انداز میں بیان کرنے کے بعد، مصنفوں نے مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"مرض اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مریض دو یا تین سال تک زندہ رہ سکتا تھا۔ ان ایکسریز کو ایک لفافہ میں بغیر کسی کا نام لکھے ڈاکٹر جے اے ایل پٹیل جو کہ بمبئی کا مشہور ڈاکٹر تھا اس کی تجوری میں مقفل کر دیا گیا۔"

1997ء میں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر برطانوی مؤرخ پیٹرک فرنچ نے ایک کتاب "آزادی یا موت" شائع کی۔ اس کتاب کے لکھنے میں اس نے اس دستاویزات سے مدد لی کہ جو حال ہی میں حکومت برطانیہ نے اسکالرز کے لیے مہیا کیں۔ مزید تحقیق کے لیے اس نے ہندوستان و پاکستان کا سفر کیا، لوگوں سے انٹرویوز کیے، اس تحقیق کے نتیجے میں اس نے فرانسیسی مصنفوں کی بیان کردہ کہانی کو غلط ثابت کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جہاں تک جناح صاحب کی بیماری کا واقعہ ہے یہ کوئی راز نہیں تھا:

"1940ء کی دہائی میں پریس میں ان کے جو فوٹو چھپے ہیں، ان میں وہ بیمار نظر آرہے ہیں۔ اس نے مزید مصنفوں کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ مئی یا جون 1946ء میں بمبئی گئے ہی نہیں بلکہ اس وقت دہلی اور شملہ میں کرپس سے بات چیت میں

معروف تھے۔ اس کی تفتیش کے مطابق جے اے ایل پٹیل نامی کسی ڈاکٹر کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ممکن ہے کہ 1946ء میں جناح صاحب تپِ دق کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہوں، لیکن دستاویزات میں ایسی کوئی شہادت نہیں کہ جو اس تھیوری کو صحیح ثابت کرے۔"(59)

اور دوسری بات یہ کہ جناح صاحب کی بیماری والی یہ کہانی بالفرض درست ہوتی تب بھی "اقتدار کے حریص جناح" کو گاندھی کی پیشکش قبول کرنی چاہیئے تھی نہ کہ پاکستان بننے کا انتظار کرنا چاہیے تھا تاکہ پورے ہندوستان کے سربراہ بن کر اپنی انا کی تسکین کا سامان کرتے۔

کیبنٹ مشن کے بارے میں یہ لکھنا ولی خان کا ہی حوصلہ ہے کہ اسے مسلم لیگ نے مسترد کر دیا۔ اسے شاید پوری صدی کا سب سے بڑا جھوٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس کیبنٹ مشن پر تفصیلی بحث دوسرے حصے میں ہو چکی کہ کیسے گاندھی اور کانگرس نے گروپ سکیم کو سبوتاژ کیا۔

گورنر جنرل کے انتخاب پر ولی خان کے الزامات کا جواب

اب آتے ہیں گورنر جنرل کے انتخاب پر۔ یہاں بھی موصوف بالکل سطحی اور سرسری انداز میں معاملات پر نظر ڈال کر اپنی من مانی "منزل" تک پہنچتے نظر آتے ہیں۔ موصوف کو ایک اور مسئلہ بھی درپیش ہے کہ ایک طرف جناح صاحب کو برطانویوں کا اس حد تک پٹھو ثابت کریں کہ جیسے وہ سانس بھی گوروں کی مرضی سے لیتے تھے اور وہ مسلسل یہی کچھ اپنی کتاب میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے بھی آئے۔ لیکن جب جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کو انکار کیا کہ وہ خود گورنر جنرل بنیں گے تو مسئلہ یہ درپیش آیا کہ کہیں اس واقعے کو بنیاد بنا کر لوگ جناح کو ایک آزاد لیڈر نہ تسلیم کر لیں۔ ایسے میں موصوف نے نظریہ ضرورت کے تحت جناح صاحب میں کچھ اور خامیاں تلاش کر لیں۔ کہ وہ ضدی، ذاتی جاہ و جلال کے شوقین اور محدود بصیرت کے مالک تھے کیونکہ "اصلی حریت پسندوں" یعنی کانگرس نے تو ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل قبول کر لیا اس لیے کانگرس کی زلف تک پہنچ کر یہ قلابازی اس طرح حسن کہلائی کہ کانگرسی لیڈروں کے اس فیصلے سے موصوف نے بصیرت و پختگی اور معاملہ فہمی نکال کر دکھادی۔

مثلاً وہ بڑے دوراندیش تھے، انھیں قومی مفاد عزیز تھا، پوری دنیا نے گانگرس کے فیصلے کی تحسین کی دوسری طرف جناح صاحب کو صرف اپنی ذات سے غرض تھی۔ آیئے پوری کہانی ولی خان کی زبانی پڑھتے ہیں۔

"گورنر جنرل کے انتخاب" والے باب میں (صفحہ نمبر 239 تا 245) میں موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اس سے بھی زیادہ حیرت انگریزوں کو اس بات سے ہوئی کہ کانگرس کے رہنماؤں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس عبوری دور کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی ہندوستان کے نئے آئین کے تحت ہندوستان کا گورنر جنرل رہے گا۔ انگریز کیا پوری دنیا حیران تھی کہ ایسے مشکل حالت میں اور ہندوستان کی نئی مملکت کے مستقبل کے فیصلوں اور پالیسیوں کے اس نازک وقت میں قوم کے مانے ہوئے لیڈر اور موجو درہنما اختیار ایک انگریز کو سونپ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مدبر اور دور اندیش سیاسی جماعت کا کارنامہ تھا کہ یہ رہنما ذاتی دشمنی نہیں رکھتے۔ اور انھوں یہ بھی ثابت کر دیا، کہ یہ سب کچھ اپنے ذاتی جاہ و جلال اور شخصی منصوبوں کے لیے نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے سامنے سب سے پہلے ملکی اور قومی مفاد تھا۔ اور یہی اطلاع اس نے حکومت برطانیہ کو بھی دی تھی۔ پھر جب فیصلے کا وقت آیا اور ماؤنٹ بیٹن نے جناح صاحب کو ان کے فیصلے کے متعلق بتایا تو جناح صاحب بات کو اس بہانے طول دیتے رہے کہ ساتھیوں سے مشورہ کرنا ہے کیمبل جانسن لکھتے ہیں کہ جناح صاحب کے سب ساتھیوں نے یہ تجویز پیش کی۔ گو پاکستان کو بہت مسائل کا سامنا ہے۔ صوبوں کی تقسیم کا مسئلہ ہندوستان کے ساتھ فوج، سازوسامان اثاثے اور اس کے ساتھ ہی نقدر قوم وغیرہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ پاکستان کا مفاد اس میں ہے کہ اس عبوری وقت کے لیے یہی ثالث ماؤنٹ بیٹن گورنر رہ جاتے۔ کیمبل کہتا ہے کہ جناح صاحب ہفتوں اس فیصلے کو لیے بیٹھا رہا۔ اور آخر کار اُس نے فیصلہ سنا دیا اور جناح صاحب کا فیصلہ جناح کے حق میں تھا۔ کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل رہیں گے۔ وہ بالآخر صاف بچ نکلا ہے اور جناح کا فیصلہ جناح کے حق میں جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ مجھے جب جناح صاحب کے فیصلے کا علم ہوا تو میں نے اسے سمجھایا کہ تمہارے اس فیصلے میں کس قدر مشکلات اور نقصانات ہیں۔ تمہاری نئی مملکت کے لیے، لیکن جناح نے یہ سب کچھ سننے کے بعد ایسا جواب دیا جس سے بیٹن خاموش ہو گیا۔ جناح صاحب نے کہا کہ مشترکہ گورنر جنرل نہ بنانے میں جتنی مشکلات پیچیدگیاں اور نقصانات ہیں ان کا مجھے علم ہے لیکن تم یہ بتاؤ کہ جب پاکستان قائم ہو تو اس مملکت میں میرے مناسب کونسا منصب یا مقام ہو گا کہ میں اسے قبول کر لوں میری نظر میں میری حیثیت کے مطابق یہی ایک مناسب منصب ہے گورنر جنرلی جسے میں 15 اگست کو قبول کر لوں گا ماونٹ بیٹن نے اس کے جواب میں کہا کہ گورنر جنرل کا منصب تو صرف

ایک آئینی سربراہ کا ہوتا ہے۔ تمام اختیارات تو وزیر اعظم کے پاس ہوں گے۔ تو اگر جناح صاحب کی دلچسپی اختیارات میں ہے تو انھیں چاہیے کہ وہ وزیر اعظم کا عہدہ قبول کر لیں۔ اس کے جواب میں جناح صاحب نے کہا کہ وہاں میرا اختیار ہو گا میں ہی حکم دونگا۔ اور باقی مانیں گے۔

جناح نے مجھے سنجیدگی سے یقین دلا دیا کہ مشترکہ گورنر نہ ہونے کے تمام نقصانات کا اسے اندازہ ہے مگر وہ 15 اگست کو پاکستان کے گورنر جنرل کے علاوہ کسی حیثیت کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کی کتنی قیمت دینی پڑیگی۔ انھوں نے افسردگی سے جواب دیا۔ شاید مجھے اس کے باعث کئی کروڑ روپوں کے اثاثوں سے محروم ہونا پڑے۔ جس پر میں نے کہا اسکے باعث تمہیں اپنے تمام اثاثوں اور پاکستان کا مستقبل ادا کرنا پڑے گا۔ (ص 133 ہڈسن)

ان کا (جناح) جواب اہم تھا۔ انھوں نے کہا "میری پوزیشن میں مشورہ دینے والا میں ہونگا اور دوسرے اس پر عمل کریں" (ص 331 ہڈسن)

کچھ عجیب مکالمہ تھا انگریز نے جناح صاحب سے پوچھا کہ اگر مشترکہ گورنر جنرل نہ ہو تو کچھ نقصان کا اندازہ لگایا ہے۔ جناح صاحب کہتا ہے کہ چند کروڑ روپے ہی ہوں گے۔ ماونٹ بیٹن کہتا ہے میں نے کہا کہ تمہارا تمام اثاثہ چلا جائے گا۔ اور پاکستان کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ماونٹ بیٹن کو پاکستان کے مستقبل کی فکر ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو جناح صاحب کا یہ فیصلہ ان حالات میں ہر ایک کو اور انگریز کو تو بہت ہی انوکھا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ حقیقت میں یہ ضرورت پاکستان کو تھی کہ وہ اپنے اثاثوں دولت اور ہر ایک چیز کا یہ مسئلہ کسی ثالث کے حوالے کر دے بلکہ ایک ذمہ دار انگریز کے حوالے کر دے اور لازمی بات ہے کہ جناح صاحب کے اس فیصلے کے بعد انگریز اپنی اس مایوسی اور غصے کو نہ چھپا سکا۔ بلکہ بہت تلخ اور سخت لہجے میں جناح صاحب پر تنقید شروع کی اور خصوصیت سے ماؤنٹ بیٹن تو دونوں طرف سے گھر چکا تھا۔ اس نے تو برطانوی حکومت کو بھی یہ تسلی دے رکھی تھی کہ جناح صاحب کا فیصلہ مشترکہ گورنر جنرل کا ہے اور خود بھی یہ تاثر لیا تھا گویا کہ یہ اسے ایک طرح سے اپنی ذاتی بے عزتی نظر آ رہی تھی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے جب جناح صاحب کو مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز پیش کی تو پوری دنیا کی طرح اسے بھی یہ مکمل یقین تھا کہ ہندوستانی کانگرسی رہنما کبھی بھی

اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ آزاد ہندوستان کا پہلا سربراہ ان کا مدتوں کا دشمن انگریز ہو، تو جناح صاحب کی اپنی سوچ یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن اور حکومت برطانیہ پر یہ احسان بھی رہ جائیگا۔ اور جب ہندوستان مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز منظور کرے گا تو میں الزام ہندوستان کو دوں گا اور اسی طرح میرے لیے بھی راستہ کھل جائے گا۔ چونکہ ہندوستان یہ تجویز نہیں مانتا تو میں بھی مجبور ہوں کہ اپنی تجویز واپس لے لوں۔

انگریز کیا پوری دنیا جب گانگرس اور مسلم لیگ کا موازنہ کرتے تو اس بات سے حیرت ہوتی۔ اور ایک طرف گانگرس کی یہ تنظیم ہے۔ جو سالہاسال تک انگریز سامراج کے ملک کی آزادی کے لیے کھل کر جنگ لڑتی رہی ہے۔ انگریزوں کی جیلوں میں رہے۔ ملک بدر ہوئے ہزاروں وطن پرست قربان ہوئے، اس کے نتیجے میں بات فوری طور پر نفرت اور حقارت تک پہنچ چکی ہوگی۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود گانگرس کے رہنماؤں میں اتنا حوصلہ ذہنی توازن اور فراخدلی تھی کہ جب بات ملکی اور قومی سودوزیاں کی آئی تو ہندوستان کی خاطر اور ملک کے مستقبل کی خاطر انھوں نے اپنے دشمن انگریز کے ساتھ اپنی تمام زندگی کی دشمنی کو پس پشت ڈالا اور ایک بہت ہی اونچے مقام اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کیا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں بین الاقوامی طور پر انھیں ایک بلند مقام ملا۔ خصوصیت سے برطانیہ پر بہت ہی اچھا اثر ڈالا اور اسی طرح ہندوستان کو اپنے مستقبل کے مفاد کے تحفظ کے لیے بہت ہی سازگار فضا ملی۔

اس کے مقابلے میں مسلم لیگ کا کردار یہ تھا کہ وہ نہ تو وطن کی آزادی کے لیے لڑتے تھے، نہ انگریز کا مقابلہ کیا نہ ہی اس کے خلاف تحریک چلائی۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اگر انگریز نہ ہوتا تو نہ پاکستان ہوتا نہ ہی یہ بادشاہت اور حکمرانی ملتی انگریز کو تو یہاں دلی اور وہاں لندن میں مسلم لیگ اور جناح صاحب کی حیثیت کا بخوبی اندازہ تھا۔ یہ تو انگریز ہی تھا کہ مسلمانوں کے اتحاد کے لیے ان سب کو مسلم لیگ میں جمع کر دیا۔ اور اسی طرح جناح صاحب کی بغلوں کے نیچے بھی انھوں نے اپنی بیساکھیاں دے رکھی تھیں تا کہ گانگرس کی ہم سری کر سکے سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر پاکستان کے سودزیاں کو بھی نہ دیکھتے تو کم از کم اپنے اس محسن انگریز کے ساتھ تو اتنی مروت برتتے۔ تا کہ زندگی بھر کے ساتھی اور تعاون کی قدر کرتے ہوئے اپنی طرف سے دوستی کا حق ادا کر دیتے۔ لیکن اس فیصلے سے تو مسلم لیگ اور جناح صاحب دونوں نے پاکستان کو نقصان پہونچایا۔ دنیا اس بات پر مجبور تھی کہ ایک

طرف کانگرس کے رہنماؤں کے باوقار اور سنگین پالیسی اور دوسری طرف مسلم لیگ کے راہنماؤں کے اس ذاتی جاہ و جلال کے شوق کو ترازو میں ڈال دے اور میرے خیال میں اسی فیصلے کے بعد شاید انگریز اپنی اس پر کی ہوئی نیکی پر پشیمان ہوا ہو۔ جناح صاحب یا مسلم لیگ کے لیے نہیں بلکہ اس سے اس کی سامراجی نو، آبادیاتی مفادات وابستہ تھے۔ لیکن پھر بھی جناح صاحب کے اس فیصلے کے بعد انگریز کا مسلم لیگ کے ساتھ تعلق کا وہ مزانہ رہا۔"(60)

یعنی ولی خان کی نظر میں جناح ایک بے بصیرت لیڈر تھے۔

اس حقیقت کے باوجود جناح صاحب ان کے "ایجنٹ" بھی تھے اور انھیں ضرورت بھی تھی کہ انگریزوں سے بنا کر رکھیں، جناح صاحب نے بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں آنکھیں دکھائیں۔ جناح ذاتی جاہ و جلال کے شوقین تھے۔

ایک بات موصوف نے یہ بھی لکھی کہ گورنر جنرل محض ایک آئینی سربراہ ہوگا سارے اختیار آپ کے یعنی جناح کے پاس ہونگے یہ بالکل جھوٹ ہے ایسا ہرگز نہیں تھے آگے چل کر ہم اس پر نظر ڈالیں گے۔

موصوف لکھتے ہیں ماؤنٹ بیٹن ثالث کے طور پر بروئے کار آسکتے تھے اگر ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل تسلیم کیا جاتا اس سے پاکستان کا فائدہ ہوتا۔ ایک بار پھر موصوف ڈنڈی مار گئے۔ یہ مشورہ جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کو دیا تھا کہ وہ مشترکہ گورنر جنرل کے بجائے ایک سپر گورنر جنرل بن جائیں اور ہمارے درمیان ثالث بن جائیں۔ اس پر بھی آگے چل کر وضاحت آئے گی۔

اس سے پہلے کہ گورنر جنرل کے انتخاب کے بارے میں موصوف نے جو کہانیاں پیش کیں ان کی وضاحت کردوں مزے کی ایک اور بات مؤصوف کی کتاب کے آخری باب "حکومت پاکستان کی ساخت" صفحہ نمبر 294-95 سے کچھ اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں کہ:

"علاوہ ازیں کم از کم پاکستان کے متعلق تو انگریز کی یہ تسلی تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی انگریز سے قطع تعلق کا سوچے گا بھی نہیں۔ البتہ ہندوستان اور گانگرس کے متعلق انگریز بخوبی جانتا تھا کہ انھوں نے انگریز سے ٹکر لی۔ آزادی کی جنگ میں عظیم قربانیاں دیں اور آج بھی گانگرس ہندوستان کی منتخب حاکم ہے، تو ان سے دوستی اور تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

علاوہ ازیں ہندوستان کے موجودہ حکمران سالہاسال سے قومی تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کی نظر میں ایک وسعت تھی۔ وہ علاقائی اور منظوری سیاست سے بڑے بین الاقوامی معاملات پر بھی عبور رکھتے تھے اور برطانوی سامراج کی ہمہ پالیسوں اور سازشوں سے بخوبی واقف تھے تو اس لیے انگریز کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو اپنی سامراجی سیاست کے لیے استعمال کر سکے گا۔ مگر پاکستان کے متعلق وہ جانتا تھا کہ پاکستان میں آج حکومت ایک ایسی تنظیم یعنی مسلم لیگ کے ہاتھ میں ہے کہ جس نے ملک کی آزادی یا انگریز کی غلامی سے نجات کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ "(61)

اب گورنر جنرل کے انتخاب والے باب اور حکومتِ پاکستان کی ساخت والے باب کے اقتباسات پڑھ کر خود اندازہ لگائیں کہ موصوف آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟

جب جناح نے برطانویوں کو گورنر جنرل نہیں بننے دیا تو موصوف کی نظر میں وہ کوتاہ اندیش، ذاتی جاہ و جلال کے شوقین تھے اس لیے اس نے بے مروتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کو انکار کر دیا لیکن آگے چل کر پھر آخری باب میں وہی مرغی کی ایک ٹانگ کہ جناح تو ایجنٹ تھے اس لیے موصوف کو لکھنا پڑا کہ " انگریز یہ جانتا تھا کہ سامراج انگریز کا دشمن مسلم لیگ کا بھی دشمن ہے تو مسلم لیگ کی حکومت بعینہ وہی کچھ کرے گی جو انگریز چاہتے ہیں۔ یعنی وہ اپنے دشمنوں کو سزادیں گے مگر مسلم لیگ کے ذریعے۔ علاوہ ازیں انگریز کو یہ بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ پاکستان ایک بالکل نئی مملکت ہے۔ اور اس لیے اس کو استحکام حاصل کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ اسی لیے مستقبل میں یہ مملکت انگریز کی امداد کی طلب گار رہے گی۔"

فضائل اعمال کے مصنف کے بارے میں پڑھا تھا کہ اسے جن دنوں ڈاکٹرز نے کسی بھی قسم کی ذہنی مشقت سے پرہیز کا مشورہ دیا تو انھی دنوں اس نے فضائل اعمال لکھی مجھے لگتا ہے ولی خان نے بھی یہ "عظیم شاہکار" کسی ایسے بیڈ ریسٹ کے دوران تخلیق کی ہو گی۔

اب ذرا وضاحت سے مشترکہ گورنر جنرل پر بات کرتے ہیں۔ ایچ ایم سیروائی نے تقسیم بارے ایک کتاب "Partition of India, legend and reality" لکھی۔ وہ ایک ماہر آئین و قانون تھے اور مہاراشٹر کے ایڈوکیٹ جنرل بھی رہے ہیں۔ مشترکہ گورنر جنرل پر بات کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"تیسرا اہم سوال یہ تھا کہ کیا عبوری دور کے لیے دونوں ممالک کا ایک ہی گورنر جنرل ہو اور کیا ماؤنٹ بیٹن کی تقرری دوبارہ کی جائے۔ یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اس قسم کا سوال اُٹھایا

گیااور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ پہلو ہے کہ اس مسئلے پر طویل بحث اور غور و فکر ہوا حتیٰ کہ ماؤنٹ بیٹن اور جناح کے درمیان مقابلے کی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں جناح کو فتح نصیب ہوئی۔ تازہ دستاویزات اور ریکارڈ کی اشاعت سے ثابت ہو گیا ہے کہ مینن نے اپنی کتاب (ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا) میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف غیر تسلی بخش ہے بلکہ غلط بھی ہے۔ البتہ موزلے نے اپنی کتاب (لاسٹ ڈیز آف برٹش راج) میں اس بارے میں خاصی حد تک درست، خوشگوار اور ڈرامائی داستان بیان کی۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

"یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 8 جون کو لارڈ اسے نے ایک یادداشت تیار کی جس میں ہندوستان اور پاکستان کے لیے مشترکہ گورنر جنرل کے فوائد گنوائے۔(ٹرانسفر آف پاور جلد گیارہ صفحہ 231) سر ایرک میوائل نے 20 جون کو لیاقت علی خان سے ملاقات کی جس میں لیاقت نے مشترکہ گورنر جنرل کے بارے میں کوئی جواب نہ دیا۔ یہی حشر ماؤنٹ بیٹن کی جناح سے 23 جون کی ملاقات کا ہوا۔(ٹرانسفر آف پاور جلد گیارہ صفحہ 582) البتہ جب 2 جولائی کو ماؤنٹ بیٹن اور جناح کی ملاقات ہوئی تو جناح نے بتایا کہ انھوں نے پاکستان کا گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس فیصلے کے خلاف دلائل دیے اور تصفیے کے طور پر تجویز کیا کہ جب وہ (ماؤنٹ بیٹن) دلی میں ہو تو آپ (جناح) پاکستان کے قائم مقام گورنر جنرل ہوں گے۔ جناح نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے لکھا۔ "میں نے اس (جناح) سے پوچھا کہ کیا آپ کو اندازہ ہے کہ اس کی آپ کو کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی؟ میں (ماؤنٹ بیٹن) نے ترشی سے کہا" اس کی قیمت تمام اثاثے اور پاکستان کا مستقبل بھی ہو سکتی ہے۔" چنانچہ اس پر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔"

سیروائی مزید لکھتے ہیں کہ:

"درحقیقت یہ سارا واقعہ ہی افسوسناک ہے اسے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تھا کیونکہ یہ ناقابل یقین بات ہے کہ دو ممالک کا آئینی گورنر جنرل ایک ہو۔ گورنر جنرل کو اپنی وزارت یعنی حکومت کے مشورے کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے اور دونوں ممالک کو اپنی علیحدہ علیحدہ پالیسیوں پر عمل کرنا ہوتا ہے دونوں ممالک کی پالیساں آپس میں متصادم بھی ہو سکتی ہیں جس سے گورنر جنرل کے لیے ناممکن سی پوزیشن پیدا ہونے کا امکان ہے کیونکہ دونوں ملکوں کی حکومتیں یا وزارتیں ایسے مشورے دیں گی جو ایک دوسرے سے متصادم ہونگے۔"

بہر حال اس واقعے نے اپنے پیچھے ناخوش گوار اور بد قسمت وراثت اور یادیں چھوڑیں۔ جناح کے اس انکار نے ماؤنٹ بیٹن پر اتنے کاری زخم لگائے جو کبھی مندمل نہ ہو سکے اور جن کے نتیجے کے طور پر وہ کھلے عام جناح کے بارے میں سخت اور ناخوش گوار باتیں کرتا رہا۔ "(مثال کے طور پر لیری کولنز اور لیپری کی کتاب "ماؤنٹ بیٹن اور پارٹیشن آف انڈیا" ملاحظہ فرمائیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا "جناح شیطانی ذہانت کا مالک تھا (صفحہ 65) وہ نفسیاتی کیس تھا (صفحہ 131) وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا تھا (صفحہ 253) اس نے گالی تک دی (صفحہ 69)(62)

جب سیر وائی یہ لکھتے ہیں کہ یہ تصور ہی ناقابل عمل ہے کہ دو آزاد اور خود مختار ممالک کا ایک ہی گورنر جنرل ہو تو ایسے میں ولی خان کی طرف سے بیان کی گئی کہانی کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ لیکن ابھی مزید وضاحت سے موصوف کے الزامات پر شواہد کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

زاہد چوہدری نے اپنی کتاب "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں ٹرانسفر آف پاور کے مستند حوالوں کے ساتھ اس معاملے پر بات کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کہانی کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے:

"ماؤنٹ بیٹن 18 مئی کو تقسیم کے منصوبے کی منظوری لینے کے لیے لندن گیا تو اپنے سیکرٹری ایرک میول کو دہلی ہی میں چھوڑ گیا۔ لندن سے اس نے ایرک میول کو ہدایت کی کہ مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کے بارے میں جناح کا جواب لے کر بھیجو۔ لیکن جناح نے ایرک میول کو بھی ٹال دیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن 31 مئی کو تقسیم ہند کے جس منصوبے کی منظوری لیکر واپس آیا اس میں مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ تاہم اس سلسلے میں وہ ناامید نہیں تھا۔ وہ چند دن کانگرس اور مسلم لیگ سے منصوبے کو منظور کرانے اور اس کا اعلان کرنے میں مصروف رہا۔"

آگے لکھتے ہیں کہ:

"جب اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے فوراً ہی اپنی اس تجویز کے بارے میں جناح کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ اس نے پہلے تو یہ سوچا کہ ریاست حیدر آباد کے آئینی مشیر سر والٹر مانکٹن کو بیچ میں ڈالا جائے کیونکہ اس کے جناح سے اچھے تعلقات تھے۔ خیال تھا کہ وہ جناح کو سمجھا بجھا کر راضی کر لے گا۔ لیکن جب اس نے اپنے اس خیال کا اظہار اپنے عملے کے سینئر ارکان سے کیا تو لارڈ اسمے اور سر ایرک میول نے کہا

کہ اس کی کیا ضرورت ہے ہم خود جناح سے ملیں گے اور انھیں راضی کرلیں گے۔ وہ کئی دن تک جناح سے ملنے کی کوشش کرتے رہے لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انھوں نے لیاقت علی خان سے مل کر اس سلسلے میں مفصل بات چیت کی اور یہ وعدہ لیا کہ وہ دو ایک دن کے اندر جناح کا جواب انھیں بھیج دے گا۔ مگر کئی دن تک جناح کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ 23 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے جناح سے ملاقات کی تو پھر اپنی تجویز کا ذکر کیا اور کہا کہ آزادی کے بل کا مسودہ مجھے موصول ہو گیا ہے اس میں صرف ایک اندراج کی تکمیل باقی ہے۔ جناح نے اس مرتبہ بھی اسے ٹال دیا اور کہا کہ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد دو تین روز میں جواب دونگا اور پھر 02 جولائی کو جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ کئی وجوہ کی بنا پر میں نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور اس نے نواب بھوپال کو بلا کر اس سے سفارش کرائی مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔" (ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 86-885)

بالآخر 04 جولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو لکھا کہ آپ تحریری طور پر مجھے اپنے مؤقف سے آگاہ کریں۔ چنانچہ اسی روز مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری اور مسلم لیگی وزرا کے سربراہ لیاقت علی خان کی جانب سے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط ملا جس میں شاہ برطانیہ سے سفارش کی گئی تھی کہ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل محمد علی جناح کو نامزد کیا جائے:

"ماؤنٹ بیٹن کو جناح کے اس فیصلے سے کس قدر صدمہ ہوا اور اس کی "شاہی انا" کس قدر مجروح ہوئی اس کا اندازہ اس گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اس نے 02 جولائی کو جناح سے کی تھی۔ اس گفتگو کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے 04 جولائی کو جو رپورٹ لندن ارسال کی اس کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے فیصلے کو "بم کا گولہ" قرار دیا تھا۔ اس نے وزیر ہند کے نام اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "میں نے جناح سے دریافت کیا۔۔۔۔۔ کہ کیا تمھیں معلوم ہے تمھیں یہ فیصلہ کتنا مہنگا پڑے گا۔ اس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا ہاں املاک کی تقسیم میں غالباً کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا کہ کروڑوں کا نہیں بلکہ تم ساری املاک کھو بیٹھو گے اور پاکستان کا مستقبل بھی۔ یہ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔"(63)

اس "ایجنٹ" کی بھی سمجھ نہیں آتی کہ کہ بجائے "مالکوں" کی مرضی پر چلنے کے انھیں آنکھیں دکھا رہے

ہیں۔ چوہدری محمد علی سابق وزیرِاعظم پاکستان جو کچھ واقعات کے چشم دید گواہ بھی ہیں "ظہورِ پاکستان" میں اسی حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

"ایک دن وائسرائے ہاؤس کے ایک کمرے میں قائداعظم قانون آزادی ہند کی چھان بین کر رہے تھے۔ میں اور لیاقت علی خان بھی ان کے ساتھ تھے۔ یکایک ماؤنٹ بیٹن کمرے میں گھس آیا اور اس نے قائداعظم پر دلیلوں، اپیلوں، اور خودستائیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز اعلیٰ ترین مقاصد کے تحت کی گئی تھی اور یہ پاکستان کے بہترین مفاد میں تھی۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے مشترکہ گورنر جنرل نہ بنایا گیا تو پاکستان کو بہت نقصان پہنچے گا۔ میں بڑی ہی مشکل سے پاکستان کے واجبات حاصل کر رہا ہوں اور اگر یہ پتہ نہ چلا کہ میں تقسیم کے بعد بھی اسی پوزیشن پر برقرار رہونگا تو میری پاکستان کی امداد کرنے کی صلاحیت میں بڑی تیزی سے کمی آجائے گی اور اس طرح پاکستان کو جو بے پناہ نقصان پہنچے گا اس کی ذمہ داری جناح پر عائد ہو گی۔ اس نے دھمکی دی کہ یہ سب کچھ منظر عام پر لے آؤں گا اور دنیا سے کہونگا کہ فیصلہ کر لو۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں اور جناح کے خلاف ہو گا۔ اس نے بار بار کہا کہ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی ہے کہ میرے مشترکہ گورنر جنرل بننے پر پاکستان کی طرف سے اعتراض کیا گیا۔ کانگرس کی جانب سے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ جناح نے اس حملے کو بڑے وقار اور تحمل سے برداشت کیا اور جواب دیا کہ میں نے یہ فیصلہ ذاتی خواہش کی بنا پر نہیں بلکہ عوام کے مفادات کی بنیاد پر کیا ہے۔ جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو اس کے خلوص اور اس کی غیر جانبداری پر مکمل اعتماد کا یقین دلایا اور اپنی اس تجویز کا اعادہ کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کو "سپر گورنر جنرل بننا چاہیے۔ لیکن اس یقین دہانی سے ماؤنٹ بیٹن کی زخم خوردہ انا کی تسکین نہ ہوئی۔" (64)

آئن سٹیفنز کا حوالہ دیتے ہوئے چوہدری محمد علی مزید مزید لکھتے ہیں کہ:

"یوں معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن خود اس فیصلے سے مشتعل ہو گیا تھا، جن لوگوں کو اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس بات سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ اس کی کمزوری، غالباً واحد کمزوری، ایک عجیب قسم کی حساس خود پسندی تھی۔ مرفی کی سوانح عمری سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس جیسے عظیم الشان خوبیوں کے مالک شخص میں ایسی کمزوری عجیب بات ہے لیکن صریحاً تھی یہی بات۔ مسٹر جناح کے فیصلے کے اعلان سے قبل

سہ پہر کو ایڈیٹروں کی جو کانفرنس بلائی گئی تھی، اس میں بھی یہ بات بالکل واضح تھی۔ ہم میں سے اکثر نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کے لیے یہ فیصلہ سیاسی اعتبار سے ہی پریشانی کا باعث نہیں بنا بلکہ اس سے اسے ذاتی صدمہ بھی ہوا ہے۔ شاید وہ مشترکہ گورنر جنرل بننے پر دل لگا بیٹھا تھا اور اس میں ناکامی کی چوٹ اس کے کمزور ترین پہلو "تکبر" پر پڑی۔" (65)

چوہدری محمد علی کے مطابق "اس فیصلے کے بعد تقسیم کے مسائل اور پاکستان کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کے روّیے میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ قبل ازیں ماؤنٹ بیٹن جناح کو محض برداشت کیا کرتا تھا لیکن اس فیصلے کے بعد اس کا روّیہ کھلم کھلا معاندانہ ہو گیا۔"

ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل بنانے کے برطانوی منصوبے کی جناح نے اس قدر سخت مخالفت اس وجہ سے کی تھی کہ آزادی ہند کے مجوزہ بل میں مشترکہ گورنر جنرل کو مطلق العنان حاکم کے اختیارات دے دیے گئے تھے۔ عام طور پر ڈومینیئن کا گورنر جنرل محض آئینی سربراہ ہوتا تھا اور اپنی حکومت کے مشورے کے تحت اپنے فرائض انجام دیتا تھا جیسا کہ اس وقت دوسری ڈومینیئنوں یعنی آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں تھا لیکن مجوزہ بل میں گورنر جنرل کو کلی طور پر خود مختار بنا دیا گیا تھا۔ اسے تمام انتظامی امور میں براہ راست احکامات جاری کرنے کے تمام اختیارات حاصل تھے اور یہ کہیں نہیں کہا گیا تھا کہ وہ یہ احکامات اپنی حکومت سے مشورہ کے بعد صادر کرے گا یا یہ کہ وہ اس مشورے کا پابند ہو گا۔

مشاورت کی شق شامل نہ کرنے کا جواز یہ بنایا گیا تھا کہ دونوں حکومتوں کی جانب سے مختلف قسم کے مشورے بھی دیے جاسکتے ہیں اس قسم کی اختلافی صورت میں گورنر جنرل کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ وہ کس حکومت کے مشورے کی پابندی کرے۔ ان امور میں دونوں ڈومینیئنوں کے مابین ذمہ داریوں اور فرائض کی تقسیم کے اہم امور بھی شامل تھے جن پر اختلاف ناگزیر تھا۔ چنانچہ یہ گورنر جنرل کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جس حکومت کے مشورے پر چاہے، عمل کرتے ہوئے انتظامی احکامات صادر کر دے۔ اگر کوئی ایک فریق متفق نہ ہو تو وہ گورنر جنرل کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا پابند ہو۔ (ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 369، 767)

گویا اسے ویٹو پاور حاصل تھی۔ یہ بات جناح کو منظور نہیں تھی کیونکہ ماؤنٹ بیٹن نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد ہمیشہ سے اپنے ہر فیصلے کا وزن کانگرس کے پلڑے میں ڈالا تھا اور جناح کو اس سے پاکستان کے لیے کسی خیر کی توقع نہیں تھی۔ یہ خدشہ اس لیے بھی بے بنیاد نہیں تھا کہ کانگرس نے ماؤنٹ بیٹن کی مشترکہ گورنر جنرل کی مطلق العنان حیثیت سے تقرری کو بلا توقف منظور کر لیا تھا۔ 7 جولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے لسٹوول کو ایک

مراسلے میں لکھا کہ "جناح کو شروع ہی میں بتادیا گیا تھا کہ کانگرس کو مشترکہ گورنر جنرل ہی قابل قبول ہوگا جو اپنے برطانوی سٹاف کی مدد سے اثاثوں کی منصفانہ تقسیم کرا سکے گا۔"(ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 966)

اس کے برعکس جناح نے ماؤنٹ بیٹن کو سپر گورنر جنرل بنانے کی تجویز دی تھی جسے دونوں ڈومینینوں کے مابین ثالث کی حیثیت تو حاصل تھی مگر اسے انتظامی احکام صادر کرنے کا اختیار نہیں تھا۔

> "ماؤنٹ بیٹن نے جناح کا فارمولا رد کر دیا اور جناح نے ماؤنٹ بیٹن کا مجوزہ منصوبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح ایک بحران پیدا ہو گیا جس کی ماؤنٹ بیٹن اور برطانوی حکومت کو بالکل توقع نہیں تھی۔"(66)

اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ کیا ماؤنٹ بیٹن کو فقط ہندوستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس فیصلے کے نتیجے میں اس کے حق اور مخالفت میں دلائل برطانیہ لکھ بھیجے بالآخر:

> "7جولائی کو وزیر اعظم ایٹلی کی زیر صدارت برطانوی کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کے اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن اور اس کے سٹاف کی جانب سے اسے فقط ہندوستان کا گورنر جنرل بنانے کے حق میں دیے گئے دلائل کو قبول کر لیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے مشترکہ گورنر جنرل بنائے جانے کے منصوبے کو جناح کی جانب سے رد کیے جانے پر ایٹلی اور بعض دوسرے ارکان کابینہ کمیٹی نے برہمی کا اظہار کیا ایٹلی نے کہا کہ جناح کی طرف سے خود اپنی نامزدگی اس کی انا پرستی کے اظہار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم نے ماونٹ بیٹن کو واپس بلا لیا تو کانگرس کے رہنما بجا طور پر اعتراض کریں گے کہ ہم نے جناح کے سامنے گھٹنے ٹیک کر ان کی تذلیل کی ہے۔"(67)

"پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں زاہد چوہدری ٹرانسفر آف پاور کا حوالہ دیتے ہوئے برطانوی حکومت اور ماؤنٹ بیٹن کی برہمی کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گورنر جنرل کے معاملے میں جناح صاحب کی اس مزاحمت کی وجہ سے ان کا ایک منصوبہ ناکام ہوا۔ ان کے مطابق یہ منصوبہ کوئی خفیہ نہیں تھا۔ وزارتی مشن، لارڈ ویول، سر کلاڈ آکن لیک، لارڈ اسمے اور ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے اس منصوبے کا وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی طرح ذکر ہوتا رہا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ پہلے برصغیر کی یک جہتی اور سالمیت کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور اگر بدقسمتی سے یہ ممکن نہ ہو تو تقسیم کچھ اس طرح کی جائے کہ برصغیر کے دوبارہ سیاسی اتحاد کے دروازے کھلے رہیں۔ اس مقصد کے لیے ہندوستانی افواج کے اتحاد کو برقرار رکھا جائے

اور دونوں ڈومینیوں کے ساتھ ایک ایسا فوجی معاہدہ کیا جائے کہ جس کے تحت ہندوستانی افواج بدستور برطانوی سامراج کے عالمی مفادات کے تحفظ فروغ کا کام سرانجام دیتی رہیں۔ماؤنٹ بیٹن کی تجویز یہ تھی کہ دونوں آزاد ڈومینینوں کی سینٹرل کونسل کے ماتحت ایک متحدہ فوج ہو اور وہ خود مشترکہ گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کونسل کا صدر رہو۔وہ کہتا تھا کہ چونکہ ہندوستان میں مقیم برطانوی فوج میری کمان میں ہوگی اس لیے میں ذاتی طور پر ڈیفنس کونسل کے کام میں مدد معاون ہوسکونگا۔اگر ڈومینینیں از خود مجھے بطور چیئر مین ڈیفنس کونسل میں کاسٹنگ ووٹ کا حق دے دیں گی تو ان کی خود مختاری پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔(ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 74-371)

ٹرانسفر آف پاور ہی کا حوالہ دیتے ہوئے زاہد چوہدری ماؤنٹ بیٹن کی جناح صاحب سے نفرت پر مبنی ایک خط کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

> "مجھے تعجب ہے کہ کسی شخص کے دماغ میں بڑے عہدے کا خبط ایک دیرینہ مرض کی طرح اس قدر شدید بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی مستقبل کی ڈومینین کو ملنے والے مادی فوائد کو بھی داؤ پر لگادے۔ محض اس لیے کہ اسے "ہز ایکسی لینسی" کے طور پر 8 ماہ پہلے ہی پکارا جانے لگے کہ بعد میں تو یہ خطاب ہر حال میں اسے مل ہی جائے گا"۔ اس نے مزید لکھا کہ "جواہر لال نہرو میرے اس خیال سے متفق ہے لیکن ولبھ بھائی پٹیل اس معاملے کو جناح کے زیادہ مذموم عزائم کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جناح اپنی فاشسٹ ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے لامحالہ عزائم ڈومینین آف انڈیا کے خلاف ہونگے"۔
> (ٹرانسفر آف پاور، والیوم 11 صفحہ نمبر 34)

یہ پڑھ کر سب کچھ واضح ہوجاتا ہے کہ جناح کو اقتدار کا حریص، جاہ و حشم کا عادی، بڑے عہدوں کے خواہشمند کے الزام کی ابتدا کہاں سے ہوتے ہوئے ولی خان تک پہنچی۔

ماؤنٹ بیٹن کے اس الزام کی تو ان دنوں ہی تردید ہوگئی کہ جناح بڑے عہدوں کے خواہشمند ہیں جب جناح نے "نائٹ گرینڈ کمانڈر آف سینٹ مائیکل اینڈ سینٹ جارج" کا خطاب حقارت سے رد کردیا۔

یہ خطاب یا کوئی اور بڑا شاہی خطاب ملک معظم کی جانب سے اپنی ڈومینین کی گورنر جنرلوں کو تقرری سے پہلے دیا جاتا تھا۔ماؤنٹ بیٹن اور حکومت برطانیہ کی طرف سے جناح پر یہ خطاب منظور کرنے کے لیے بہت زور دیا گیا۔لیکن جناح نے کہا کہ "میرے عوام کو یہ سب کچھ پسند نہیں ہے۔" اور یہ پیشکش رد کردی (68)

صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جناح نے کارپر ڈومینیَن گورنر جنرل کا جھنڈا لہرانے اور پاکستان کے جھنڈے

میں یونین جیک کا علامتی نشان شامل کرنے کی برطانوی تجویز بھی رد کرنے کے علاوہ گورنر جنرل کے حلف کے عبارت میں بھی تبدیلی کرائی۔

15 اگست کی صبح قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر حلف اٹھایا۔ یہ عبارت اس سے بھی سادہ اور مختلف تھی جو برطانوی حکومت نے تجویز کی تھی۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کے گورنر جنرلوں کے لیے حلف نامے کی یکساں عبارت تجویز کی تھی جس کا متن یہ تھا۔

اطاعت کا حلف:

> میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حلف اٹھاتا ہوں کہ شہنشاہ معظم شاہ جارج، اس کے وارثوں اور جانشینوں کا قانون کے مطابق وفادار اور سچا اطاعت گزار رہونگا۔ پس اے خدا میری مدد فرما۔

عہدے کا حلف:

> میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حلف اٹھاتا ہوں کہ میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے عہدے پر احسن طریقے سے اور سچے دل سے شہنشاہ معظم شاہ جارج کی خدمت کرونگا۔ پس اے خدا میری مدد فرما۔

پٹیل اور نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کے لیے یہ عبارت من و عن منظور کرلی لیکن جناح نے اس سے اتفاق نہ کیا اور اپنے لیے علیحدہ عبارت تجویز کی جس کی برطانوی حکومت نے توثیق کر دی اور 15 اگست کو انھوں نے اسی عبارت پر حلف اٹھایا۔ اس میں متذکرہ دونوں حلف ایک ہی عبارت میں اکٹھے کر دیے گئے تھے۔ متن یہ ہے "میں محمد علی جناح باضابطہ اقرار کرتا ہوں کہ میں پاکستان کے آئین کا جو کہ قانوناً نافذ ہے سچا وفادار اور اطاعت گزار رہونگا اور یہ کہ میں شہنشاہ معظم شاہ جارج ششم، اس کے وارثوں اور جانشینوں کا بطور گورنر جنرل پاکستان وفادار رہونگا۔"

اس میں جناح نے پاکستان کے آئین سے وفاداری کو شامل کیا اور اسے اوّلیت دی۔ اس کے بعد شہنشاہ معظم کی وفاداری فقط "بطور گورنر جنزل" شامل کی مگر بطور محمد علی جناح صرف آئین کی وفاداری اور اطاعت گزاری کا عہد کیا۔"

بقول پروفیسر مہدی حسن، ماؤنٹ بیٹن جناح صاحب کا نام نہیں لیتے تھے جب بھی پٹیل اور نہرو کی کمپنی میں ہوتے تو جناح صاحب کا نام لینے کے بجائے Mad Man کہا کرتے تھے اور جب جب ان دونوں سے کوئی بات منوانی ہوتی تو "میڈ مین" کا ڈراوادے کر اپنی بات منوا لیتے تھے۔ بقول پروفیسر مہدی حسن اگر ان تینوں

لیڈروں کی سوانح عمریاں پڑھی جائیں تو بہت واضح نظر آتا ہے کہ یہ تینوں جناح صاحب کے مقابلے میں کس قدر شدید احساس کمتری کا شکار تھے۔

جناح صاحب پر ولی خان کی جانب سے بزدلی کا الزام

ولی خان کا ان تمام الزامات سے جی نہیں بھرا تو لگے ہاتھوں جناح صاحب کو بزدل بھی ثابت کر دیا۔ اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 90-289 میں لکھتے ہیں کہ:

> "مرتبے کی اونچ نیچ کا یہ مسئلہ جب ختم ہوا تو دوسرا مسئلہ پیدا ہوا۔ یہ افواہ گرم تھی کہ پنجاب کے سکھ بے انتہا غصے میں ہیں اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب جناح صاحب اسمبلی کے اجلاس میں جائیں گے تو ان پر بم پھینکا جائے گا۔ جونہی ماؤنٹ بیٹن جہاز سے اترا اس سے سوال کیا گیا کہ ان اطلاعات کی روشنی میں کیا فیصلہ ہوا ہے کہ سرکاری جلوس نکلے گا یا نہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ یہ تم لوگوں کا اپنا فیصلہ ہے انتظام تمھارا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ جناح صاحب نے یہ فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کہتا ہے کہ اگر کسی نے یہ فیصلہ کیا بھی ہو کہ جناح صاحب کو بم سے اُڑائیں تو جب میں اس کے ساتھ سواری میں بیٹھ جاؤں گا تو غالب امکان یہ ہے کہ یہ حملہ نہ ہو گا کیونکہ ایسا کرنے سے پاکستان کے گورنر جنرل کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا گورنر جنرل بھی قتل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ مجھے جلوس نکالنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد جلوس کا انتظام ہوا۔ جب دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کے بعد جناح صاحب اور ماؤنٹ بیٹن واپس گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن کی طرف منہ کر کے کہا کہ "خدا کا شکر ہے میں تمھیں زندہ واپس لے آیا۔"
>
> "ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب دیا" خدا کا شکر ہے کہ میں تمھیں زندہ واپس لے آیا۔"(69)

یقین نہیں آتا کہ کوئی انسان اس قدر ڈھٹائی و بے شرمی سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ سی آئی ڈی رپورٹس شیئر کی گئیں کہ جناح صاحب پر حملہ ہو گا۔ ماؤنٹ بیٹن کو کہا گیا کہ حملے سے بچنے کا ایک حل ہے کہ کسی طرح جناح صاحب کو قائل کریں کہ وہ کھلی گاڑی پر سفر نہ کریں۔ جناح صاحب نے صاف انکار کیا اور کہا کہ کھلی گاڑی ہی میں جاؤں گا اور گاڑی آہستہ ہی چلے گی۔ پوری کہانی "فریڈم ایٹ مڈ نائٹ" کے صفحہ نمبر 56-155 میں کچھ اس طرح موجود ہے:

"جناح کی کھلی گاڑی پر بم پھینکنے کی آر۔ ایس۔ ایس کی سازش کی جو خبر سی آئی ڈی نے ماؤنٹ بیٹن کو دی تھی اس کے متعلق کراچی کے افسران کو بھی خبردار کر دیا گیا تھا۔ جب وائسرائے کراچی پہنچے تو سی آئی ڈی کے افسروں نے صاف کہہ دیا کہ ہمیں آر ایس ایس کے خفیہ آدمیوں کو پہچاننے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اگر جناح کے ساتھ وائسرائے بھی کھلی گاڑی میں رہے تو دونوں کی زندگی کی حفاظت کی کوئی تدبیر کسی کے پاس نہیں۔

ہاں ایک تدبیر ہو سکتی ہے سی آئی ڈی افسر نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا۔ "آپ مسٹر جناح سے اصرار کریں کہ وہ کھلی گاڑی میں اس سرکاری جلوس میں نکلنے کا خیال ترک کر دیں"

کراچی کی سڑکوں پر کھلی کار میں جلوس میں شرکت کے پروگرام کو رد کرنے کے لیے وائسرائے نے جناح سے کافی اصرار کیا مگر وہ کسی شرط پر تیار نہ ہوئے۔ اگر اسے منسوخ کر دیا گیا یا بند کار میں تقریب میں شرکت کی گئی تو یہ بزدلی کا ثبوت دینے کے برابر ہو گا۔

جس ملک کو بنانے کے لیے انھوں نے ساری زندگی جدوجہد کی، اس کے یومِ تاسیس کے موقع پر قائداعظم منہ چھپا کر نکل جائیں؟ یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا پہلے سرکاری جلوس میں وہ کھلی چھت والی کار میں شرکت کریں گے۔ اس کار کو عوام کے درمیان تیزی سے بھگایا نہیں جائے گا۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھے گی تاکہ لوگ اپنے قائداعظم کا خیر مقدم کر سکیں۔

ماؤنٹ بیٹن یہ سن کر سوچنے لگے کہ کھلی چھت والی کار اگر دھیرے دھیرے آگے بڑھے گی تو بم پھینکنے والے کو نشانہ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ (70)

جناح صاحب پر حملہ کیوں نہیں ہوا اس کی کہانی بھی اسی کتاب کی صفحہ نمبر 158 پر موجود ہے:

"کراچی میں جناح کی کار پر کیوں بم نہیں پھینکا گیا، اس راز کو جاننے کے لیے مصنفوں نے بڑی کوشش کی۔ جالندھر میں سائیکل کی مرمت کرنے والے پریتم سنگھ نے دبی زبان سے اقرار کیا کہ آر۔ ایس۔ ایس کے آدمی کراچی پہنچے تھے لیکن ان کو بم پھینکنے کے لیے اشارہ نہ مل سکا کیونکہ جس آدمی نے اشارہ کرنا تھا کہ بم پھینکا جائے عین اس وقت جب کار سامنے سے گزری تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔ پریتم سنگھ کو سی آئی ڈی نے "پاکستان سپیشل ٹرینوں" کو اڑانے کی سازش کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا۔" (71)

2000ء میں ولی خان نے سہیل وڑائچ کو ایک انٹرویو دیا اس میں بھی کچھ مزید الزامات لگائے۔ ذرا ان کی حقیقت بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

"آپ تو ہمیں اس بات کا کریڈٹ نہیں دیتے کہ ہم آپ کے خلاف حقائق کا علم ہونے کے باوجود انکشافات نہیں کرتے لیکن اصل بات یہ ہے کہ 3 جون 1946ء کا منصوبہ مسلم لیگ یا قائداعظم نے نہیں بلکہ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگ کی طرف سے منظور کیا اب تک آپ جس کتاب کو معتبر قرار دے رہے ہیں یعنی اسٹینلے والپرٹ کی جناح آف پاکستان، اس میں بھی لکھا ہے کہ جب 3 جون کا منصوبہ آیا تو نہرو نے اسی رات ماؤنٹ بیٹن کو غیر رسمی طور پر بتادیا تھا کہ کانگرس اس کو مان لے گی لیکن ساتھ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے وعدہ لیا کہ وہ یہ بات قائداعظم کو نہیں بتائیں گے، قائداعظم ماؤنٹ بیٹن کے پاس آئے اور پوچھا کہ کانگرس کی اس منصوبے کے بارے میں کیا رائے ہے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ آپ اسے چھوڑیں میں آپ کے اور مسلم لیگ کے مفاد میں آپ کی طرف سے اس سکیم کو منظور کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان کا پلان ماؤنٹ بیٹن نے بنایا اسی نے منظوری دی"

"حقائق حقائق" نامی بے بنیاد الزامات کی پوٹلی لکھ کر بھی یہ کہنا کہ ہم انکشافات نہیں کرتے، ولی خان کا ہی صلہ ہے ساتھ ڈھٹائی سے کریڈٹ بھی مانگ رہے ہیں۔ موصوف اپنی کتاب میں کہانی گھڑتے رہے کہ جناح صاحب دائیں بائیں دیکھتے بھی برطانویوں کی مرضی سے تھے یہاں بھی اسی بات کی تکرار کرتے نظر آئے۔ حقیقت یہ ہے 3 جون کا پلان "ایجنٹ" جناح کو مکمل اندھیرے میں رکھتے ہوئے "حریت پسند" نہرو کی منشا کے مطابق تیار کیا گیا جس کا تذکرہ پہلے کچھ اس طرح آچکا ہے۔

منصور احمد صفحہ نمبر 170 اور 171 پر رضا خان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وائسرائے کی دراصل بڑی خواہش تھی کہ پنڈت نہرو کی تائید ان کے پلان کو پہلے ہی حاصل ہو جائے سچ تو یہ ہے کہ وائسرائے اپنی اس خواہش کو چھپا نہیں سکے کہ وہ کانگرس کو مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتے تھے ان کا ماننا تھا کہ اگر لیگ کوئی والے اعتراض کھڑا کریں گے تو انھیں اس بات کا خوف دلایا جائے گا کہ اختیارات کانگرس کے ہاتھوں ایک واحد مرکزی حکومت کی شکل میں سونپ دیے جائیں گے۔

دس مئی کو وائسرائے اچانک کسی اضطراری کیفیت یا جانے بوجھے منصوبے کے تحت چپ چاپ اپنی تجوری کے پاس گئے اور اس میں سے پلان نکال کر پنڈت نہرو کو پڑھنے کے لیے دیا اور خود آدھے گھنٹے تک دم سادھے انتظار کرتے رہے کہ پنڈت نہرو کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ تب انھوں نے دیکھا کہ پنڈت جی کا چہرہ پہلے لال ہو گیا اور اس کے بعد کرب سے ہرا۔ وائسرائے سمجھ گئے کہ کہ سارا کام بگڑ گیا۔ پنڈت نہرو نے کہا "یہ ایک

دم نہیں چلے گا(It won't do)" میں اس طرح کے پلان کو کبھی بھی تسلیم نہیں کرونگا نہ ہی کانگرس اس کی منظور کرے گی،وائسرائے بڑی حیرانی اور سراسیمگی میں پڑے۔"

اسمے اور جارج ایبل منظوری کے لیے ڈکی برڈ پلان کو اس سے پہلے لیکر جا چکے تھے۔ منصور احمد آگے لکھتے ہیں کہ "اس اثنا میں وہ پلان جسے لارڈ اسمے لندن لے گئے تھے معمولی ترمیم کے بعد منظور کر لیا گیا تھا اور اسے کیبل کر کے ہندوستان واپس بھیج دیا گیا۔ تاہم مانا یہ گیا تھا کہ 17 مئی تک اسے کسی کو دکھایا نہیں جائے لیکن یہی پلان تھا جسے ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کو 10 مئی کو دکھایا تھا اور جس دن دکھایا گیا اس کے دوسرے دن نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ اس پلان سے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے(Balkanisation) ہو جائیں گے۔ اس پر فوراً وی پی مینن کو بلا کر وائسرائے نے ہدایت کی کہ پلان پر نظر ثانی کر کے اس میں ترمیم کریں۔ 17 مئی والی دہلی کی مجوزہ میٹنگ ملتوی کر دی گئی اور ایک ڈرامائی انداز میں ماؤنٹ بیٹن نے پرائم منسٹر ایٹلی کو ایک تار بھیجا: "جس پلان کو آپ نے منظور کر کے بھیجا ہے وہ(اس تار کے ذریعے) مسترد کیا جاتا ہے، آپ دوسرے پلان کا انتظار کریں۔

"The draft plan that you have approved is hereby cancelled. Please stand by for revised plan."

لارڈ اسمے نے جن کو اس ساری پیشرفت کا علم نہیں تھا، سراسیمگی کے عالم میں ریمارک کیا "یہ کیا حماقتیں ہو رہی ہیں(What the hell is going on) "

ادھر شملہ میں وی پی مینن چھ بجے شام کو اپنے ہوٹل میں پلان پر نظر ثانی کرنے کے لیے بیٹھے اور چار گھنٹے مسلسل کام کر کے پلان کے آخری جملے کو پورا کر لیا اور فوراً سے بھی پیشتر سر ایرک میویل کی معرفت ماؤنٹ بیٹن کے پاس بھیجا۔ وی پی مینن نے اس میں نہرو کی تجاویز کو شامل کر لیا تھا۔ 18 مئی کو لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن وی پی مینن کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہوئے تاکہ مسٹر ایٹلی سے براہ راست بات کریں، ایبل اور اسمے نے وائسرائے کے ساتھ سخت جدوجہد کی کہ پہلے والے پلان کو رہنے دیا جائے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔

دوسرے دن کیبنٹ اور پرائم منسٹر ایٹلی نے ایک کیبنٹ میٹنگ میں جو مشکل سے پانچ منٹ کی تھی اس ترمیم شدہ پلان کو منظوری دے دی۔ رضا خان لکھتے ہیں کہ "تاہم مینن کچھ زیادہ ہی کانگرس نواز تھے، اور غیر ارادی طور پر بھی جناح اور مسلم لیگ کی ہزیمت کے متمنی تھے۔" ان کے اپنے ہی لفظوں میں "میں بلبھ بھائی پٹیل کو شملہ کی ساری پیش رفت کی اطلاع دیتا رہتا تھا اور وہ ان پیشرفتوں سے بڑے مسرور تھے۔"

دوسری بات یہ کہ یہ تاثر دینا جیسے ماؤنٹ بیٹن ہی مسلم لیگ اور جناح صاحب کی طرف سے مختار کل تھے، گھٹیا الزام تراشی کے سوا کچھ بھی نہیں حقیقت یہ ہے جناح صاحب سے اس پلان کی تحریری منظوری کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن جناح صاحب سے اپنی بات نہیں منوا سکے اور اس بات کے مکمل ثبوت موجود ہیں۔

ٹرانسفر آف پاور کی تقسیم سے متصل دنوں کے ڈاکیومنٹس کا محمد فاروق قریشی صاحب نے ترجمہ کیا۔ اس میں ڈاکیومنٹ نمبر 513، جس میں ماؤنٹ بیٹن اور چرچل کی ملاقات کا احوال ہے جو 22 مئی 1947ء کو ہوئی اس میں ماؤنٹ بیٹن چرچل کو یہ بتاتے نظر آتے ہیں کہ کانگرس لیڈر شپ کی طرف سے مجھے کوئی مسئلہ نہیں البتہ جناح صاحب سے میں ابھی تک پلان کی منظوری کے لیے تحریری ضمانت لینے میں کامیاب نہیں ہوا۔

وہ لکھتے ہیں:

> "تب انھوں نے (چرچل) نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے کسی دشواری کا سامنا ہے خاص طور پر مسٹر گاندھی کے حوالے سے۔ میں نے ان کو جواب دیا مسٹر گاندھی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اغلباً وہ ایسی مشکلات پیدا نہیں کر سکیں گے جسے مسٹر پٹیل اور نہرو حل نہ کر سکیں۔
>
> انھوں نے استفسار کیا آیا مجھے نہرو کا خط موصول ہو گیا ہے کا اگر اس برس اقتدار منتقل کر دیا جائے تو انھیں ڈومینین سٹیٹس منظور ہے۔ میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور مزید کہا کہ میں نے اس کی نقل وزیر اعظم کو دے دی ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں مسٹر جناح سے اس قسم کی تحریری ضمانت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مسٹر چرچل نے اس پر بڑے تعجب کا اظہار کیا اور بولے "خدا کی قسم" وہ واحد شخص ہے جو برطانوی مدد کے بغیر چل سکتا ہے۔"

مزید تصدیق کیمبل جانس کی "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" سے بھی ہوتی ہے کہ وہ یعنی ماؤنٹ بیٹن جناح صاحب سے تحریری ضمانت لینے میں کامیاب نہیں ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "Jinnah had apparently been very calm, and had said simply that he could not stop such a step in any event. In respects this may well turn out to be the most delicate and decisive moments for Mountbatten's and Jinnah's diplomacy. Mountbatten felt that Jinnah's reaction was both abnormal and disturbing. It was certainly

shrewd. The balloom d'essai has gone up and come down again, providing only the evidence that Jinnah has a very steady nerve. Mountbatten feels that Jinnah is well aware of his potency as a martyr butchered by the British on the Congress altar."

"جناح بظاہر پر سکون رہے، اور انھوں نے صرف یہ بات کہی کہ وہ کسی صورت ایسے اقدام کو روک نہیں سکتے۔ عجب نہیں کہ بعض پہلوؤں سے ماؤنٹ بیٹن اور جناح دونوں کی حکمت عملی کا یہ بہت ہی نازک اور فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہو۔ ماؤنٹ بیٹن محسوس کرتا تھا کہ جناح کا ردِّ عمل غیر معمولی بھی ہے اور تشویش انگیز بھی۔ ان کا ردِّ عمل یقیناً فراست و تدبر کا آئینہ دار تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا آزمائشی بیلون چڑھا بھی، اور نیچے بھی اتر آیا اور اس سے صرف یہی ثبوت ملا کہ جناح بہت مضبوط و مستحکم اعصاب کے مالک ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن کا خیال ہے کہ جناح کو بطور شہید اپنی طاقت کا پورا علم ہے جسے کانگرس کی قربان گاہ پر انگریزوں نے بھینٹ چڑھادیا ہو۔"

اب آخر میں سٹینلے والپرٹ کی گواہی بھی شامل کرتے ہیں جس کا حوالہ موصوف دے رہے ہیں۔ جناح آف پاکستان کے صفحہ نمبر 327 پر والپرٹ لکھتے ہیں کہ:

"Mountbatten met to confer with his staff the next morning and reported his futile efforts to get Jinnah to accept the plan in writing, but no amount of pressure woud make him agree prior to his councils' meeting."

ولی خان اس انٹرویو میں ایک اور الزام دہراتے ہیں جس کی جگالی اکثر نام نہاد قوم پرست اور کچھ سوڈو انٹلیکچول یعنی جعلی دانشور کرتے رہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:

"مشرقی پاکستان کو چین اور مغربی پاکستان کو روس کو روکنے کے لیے بنایا گیا تھا چین اور روس کی لڑائی ختم ہو گئی تو مشرقی پاکستان کی افادیت ختم ہو گئی کولڈ وار کے خاتمے کے بعد پاکستان سے بھی دلچسپی ختم ہو گئی تھی لیکن ایٹم بم نے دلچسپی بڑھادی"

یہاں کچھ سوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً کیبنٹ مشن پلان جس میں مسلمانوں کے خدشات کو ایڈریس کرنے کے لیے صوبوں کی گروپنگ کی گئی تھی، جس کو جناح صاحب نے تسلیم کیا تھا اور گاندھی نہرو اور ہندو لیڈرشپ نے جسے ناکام بنایا اس بات کا اعتراف خود آزاد نے بھی اپنے دوسرے ایڈیشن میں کیا یعنی ان 30 صفحات میں

جو "قومی مفاد" کے تحت 1959ء میں چھپائے گئے اور جنھیں 1988ء میں شائع کیا گیا۔ ایسے میں اس الزام کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ پاکستان برطانویوں کی سازش تھی جو انھوں نے "ایجنٹ" جناح کے ساتھ مل کر بنائی تاکہ روس کا راستہ روکا جائے؟

دوسری بات جناح صاحب بنگال کو علیحدہ ملک ماننے پر تیار ہو گئے تھے جسے ہندو لیڈر شپ نے ناکام بنایا۔

تیسری بات برطانوی اگر روس کا راستہ روکنا چاہتے تھے تو کیا روس کا راستہ روکنے کے لیے ایک ایسا پاکستان سودمند ثابت ہو سکتا جسے جناح صاحب کٹا پھٹا پاکستان کہتے اور ماؤنٹ بیٹن خود اتنا ناقابلِ عمل خیال کرتے تھے کہ اسے "پاگل پاکستان" کہا کرتے تھے یا ایک متحدہ ہندوستان؟

ایسا نہیں یہ کوئی ہوائی بات ہے جس نے اس معاملے میں ذرا سی بھی تحقیق کی وہ بخوبی جانتا ہے برطانوی آخری دم تک ایک متحدہ ہندوستان چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ آزادی سے چار مہینے پہلے 10 اپریل کو جناح صاحب اور ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات پڑھ کر دیکھ لیں کہ ماؤنٹ بیٹن کس قسم کی کوششیں کرتے نظر آئے۔

(ڈاکومنٹ نمبر 119، وائسرائے کی سٹاف میٹنگ، گفتگو کا غیر جاری شدہ ریکارڈ نمبر 6، ماؤنٹ بیٹن پیپرز)

> "میں نے مسٹر جناح کو ہندوستان کو متحد رکھنے کے کئی فوائد گنوائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہندوستان ایک انتہائی مضبوط ملک بن سکتا ہے اور عالمی طاقتوں کی صف اول میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے مسٹر جناح سے کہا کہ وہ آخر ایسے بڑے فوائد کو کس طرح نظر انداز سکتے ہیں۔ مسٹر جناح ان کی موجودگی میں پاکستان کے حق میں اس وقت ایک بھی معقول دلیل پیش نہیں کر سکے۔ درحقیقت انھوں نے کوئی جوابی دلیل پیش نہیں کی۔ انھوں نے یہ تاثر دیا جیسے وہ میری بات سن ہی نہیں رہے ہوں۔ ان پر کوئی دلیل اثر نہیں کرتی۔ انھوں نے بار بار ہر طرح سے بات چیت کی جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ انھوں نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ وہ ہندوستان کے پہلے سربراہ مملکت ہونگے اور وہ ہندوستان کے عوام کے بہترین مفاد میں جو کچھ ہو گا خود کریں گے۔ مسٹر جناح نفسیاتی کیس تھے۔ ان پر پاکستان کی دھن سوار تھی۔"
>
> (از محمد فاروق قریشی، تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار)

ہندوستان میں برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف کے مطابق فرقہ وارانہ طور پر ہندوستانی افواج کی تقسیم کے لیے پانچ سے دس سال درکار ہونگے ان کے خیال میں ماؤنٹ بیٹن اس تقسیم سے بچنے کے لیے جناح صاحب کے سامنے پاکستان کے ناقابل عمل ہونے کے بارے میں یہ بھی دلیل دی سکتے ہیں۔ ساتھ ماؤنٹ بیٹن پنجاب اور

بنگال کی تقسیم کی صورت بھی جناح صاحب پر دباؤ رکھنا چاہتے تھے۔ ایرک میول کا خیال تھا کہ کلکتہ کے پاکستان ناقابل عمل ثابت ہوگا۔ یہ تمام آرگیومنٹس، پریشر ٹیکسٹکس اس لیے اپنائے جارہے تھے تاکہ جناح صاحب کو مطالبہ پاکستان سے دستبردار کیا جاسکے۔

برطانوی سمجھتے تھے پاکستان اس قابل نہیں ہوگا کہ زیادہ عرصہ چل سکے کُجا کہ یہ روس کے لیے رکاوٹ بن سکے۔ ہندو لیڈرشپ کی رائے اس سے پہلے بیان ہو چکی کہ وہ پاکستان کو کس قدر قابل عمل سمجھتے تھے آیئے برطانوی لیڈرشپ کی رائے بھی دیکھتے ہیں۔

"زاہد چوہدری پاکستان کیسے بنا" میں برطانوی لیڈرشپ کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"برطانوی سامراج کا خیال تھا کہ یہ تقسیم عارضی ہے، بہت جلد پورا برصغیر ہندوستان کے زیر نگیں ہوگا۔ اس خیال کا اظہار ان تقاریر سے بھی ہوا جو 10 جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں قانون آزادی ہند پر بحث کے دوران ہوئیں۔

وزیر اعظم ایٹلی نے اس موقع پر کہا تھا کہ "مجھے قوی امید ہے کہ برصغیر کی یہ تقسیم عارضی ہوگی۔ دونوں ڈومینینیں پھر یکجا ہو کر برطانوی کامن ویلتھ کے اندر ایک عظیم ریاست کی تشکیل کریں گی۔"

کنزرویٹو پارٹی کے ایک لیڈر ہیرلڈ میکملن نے کہا تھا کہ "ہم وزیر اعظم کی اس امید میں متعلق ہیں کہ اس تقسیم میں کچھ ایسے بیج بھی موجود ہیں جو مستقبل میں کسی نہ کسی نوعیت کے اتحاد کا باعث بنیں گے۔"

اور پھر 16 جولائی کو وزیر ہند لسٹوول نے ہاؤس آف لارڈز میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ:

"جب تجربے کی روشنی میں تقسیم کے نقصانات نمایاں ہو جائیں گے تو دونوں ڈومینینیں ایک انڈین دومینین کی صورت میں پھر متحد ہو جانے کا برضا و رغبت فیصلہ کریں گی اور یہ واحد انڈین ڈومینیئن اقوام عالم میں وہ مقام حاصل کرے گی جس کی وہ اپنے علاقے اور وسائل کے لحاظ سے مستحق ہے۔"

(ایس ایم برکی۔۔ مین سپرنگز آف انڈین اینڈ پاکستانی فارن پالیسیز۔۔ صفحہ نمبر 73 از زاہد چوہدری)

زاہد چوہدری "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" کے صفحہ نمبر 119، 120 میں ٹرانسفر آف پاور کے ڈاکیومنٹس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"4 ستمبر کو چیف آف سٹاف نے کابینہ کی دفاعی کمیٹی کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں ہندوستان کی جنگی اہمیت کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا اس کے مطابق سٹریٹجی کی بڑی ضروریات جو ہندوستان سے پوری کرنا مقصود تھیں، یہ تھیں۔

اسے ایک بڑے مددگار علاقے کی حیثیت سے ترقی دینا۔

بیرونی جارحیت اور اندرونی گڑبڑ سے تحفظ۔

- فضائی مواصلات، نقل و حرکت اور انتظامی لحاظ سے اڈے کی سہولت کا حصول۔
- صرف برطانوی یونٹوں کے انخلا سے ہماری سٹریٹجی کی بڑی ضروریات خطرے سے دوچار نہیں ہونگی البتہ داخلی سلامتی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا جس پر کہ ہماری تمام تر ضروریات کا دارومدار ہے۔

تبصرہ کرتے ہوئے زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ:

گویا انگریزوں کو اپنے انخلا کے نتیجے میں اصل خطرہ ہندوستان کی داخلی سلامتی کو لاحق ہوتا نظر آتا تھا۔ اس کا ایک سبب فرقہ وارانہ کشیدگی اور دوسرا سبب کیمونسٹوں کی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں تھیں۔

کتوبر کو نائب وزیر ہند ڈی ٹی موشیتھ نے وزیر ہند پیتھک لارنس کے لیے ایک تفصیلی نوٹ میں لکھا:

"ہمارے ساتھ جنگ چھڑنے کی صورت میں روس آسانی سے ہندوستان پر چڑھ دوڑے گا اور قبضہ کرلے گا۔ روسیوں کے پاس ایسا کرنے کی معقول وجوہات ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ مشرق وسطیٰ میں ہماری پوزیشن کے عقب تک پہنچ کر ہمیں بے بس کر دے گا جہاں کے تیل کی سپلائی ہمارے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔

دوئم یہ کہ (ٹرانکور) جنوبی ہند میں تھوریم کے قیمتی ذخائر موجود ہیں جو آج کل ایٹم بم کی تیاری کا اہم ترین جزو ہیں۔ اگر اس طرح ہندوستان پر قبضہ ہو جائے تو پھر سیلون بھی ہاتھ سے چلا جائے گا۔ چنانچہ ملایا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ تک فضائی مواصلات صرف لمبی اڑان کرنے والے طیاروں کی مدد سے ممکن ہو سکے گی اور بحری مواصلات اس قدر مشکل ہو جائے گی کہ مشرق بعید میں اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے ہمیں بحر الکاہل کا راستہ بحر ہند کی نسبت زیادہ موزوں رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو جنگی اعانت کی خاطر امریکہ پر انحصار کرنا پڑے گا کیونکہ بحر الکاہل کے ذریعے ہماری وہاں تک رسائی اسی صورت ممکن ہوگی کہ امریکہ ہمارے ساتھ دوستانہ تعلق رکھتا ہو۔"

مونٹیتھ مزید لکھتے ہیں کہ:

"ہمارے نقطہ نظر کے مطابق پہلی اہم بات تو یہ کہ ہندوستان بذات خود اپنے دفاع کے قابل ہو جائے اور کسی دشمن طاقت کی جانب سے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کے خلاف مزاحمت کرنے کا پابند ہو۔ اس مقصد کے لیے بے حد ضروری ہو گا کہ ہندوستانی فوج متحد، جدید ہو، اور اس قدر بڑی ہو کہ صورت حال کا ہماری تھوڑی بہت فوجی مدد کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔"

چیفس آف سٹاف کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے مونٹیتھ نے اسی نوٹ کے آخر میں لکھا کہ:

"کوئی دفاعی بندوبست بھی قابل قدر نہیں ہو گا جب تک کہ ہندوستان اندرونی طور پر مستحکم نہ ہو۔ نتیجتاً فوجی نقطہ نظر سے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہندوستان داخلی انتشار سے دوچار ہو جائے گا۔ اور اگر اس حالت میں ہم اسے چھوڑ کر چلے گئے تو کوئی ایک یا دوسرا فریق ناگزیر طور پر باہر سے امداد کو دعوت دے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی نئی طاقت یہاں داخلی تقسیم سے فائدہ اٹھا کر یہاں غلبہ حاصل کر لے گا۔ یا پھر یہ ہو گا کہ اندرونی جنگ و جدل سے ہندوستان بتدریج کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ حالت جنگ میں اگر کسی متحارب گروہ نے اس علاقے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو یہ اس کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکے گا۔"

(ٹرانسفر آف پاور والیوم 8 صفحہ نمبر 640 تا 642 پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ 118 تا 120)

ان تمام آرگیومنٹس اور حقائق کی روشنی میں کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ برطانوی یہاں سے جانے سے پہلے ایک متحدہ ہندوستان چاہتے تھے یا کٹے پھٹے اور "پاگل پاکستان" سے روس سے تحفظ کا کام لینا چاہتے تھے؟

قرارداد پاکستان کے بارے میں ولی خان کی غلط بیانی

آخر میں ولی خان کے سب سے بڑے الزام پر بات کرتے ہیں۔ ولی خان کے بقول قراردادِ پاکستان جو 1940ء میں پیش کیا گیا وہ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے لکھ کر دیا۔ ولی خان کے مطابق برصغیر کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ وائسرائے کے کہنے پر اس کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ظفر اللہ خان نے تیار کیا تھا۔ اس کے مسودے کی نقل جناح کو اور وزیر ہند کو برطانیہ بھی بھیجی گئی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس الزام کی حقیقت پر بات کریں پہلے میں کانجی دوار کاداس کی کتاب سے ایک واقعہ درج کرتا ہوں جس میں جناح اور لارڈ لنلتھگو کا سامنا ہوتا یہ 1940ء کا ہی واقعہ ہے۔

کانجی لکھتے ہیں کہ:

"دوسرا واقعہ 17 اگست 1940ء کو بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس میں پیش آیا۔ 8 اگست کی تجاویز کے بعد جناح کو وائسرائے سے بمبئی میں ملنے کی دعوت دی گئی۔ اس سے ٹھیک ایک ہفتہ پہلے لارڈ لنلتھگو (وائسرائے) ایک وار ایڈوائزری کونسل تشکیل دے کر اس کا اعلان کر چکے تھے۔ اس کونسل میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات خان کا نام بھی شامل تھا۔ مسلم لیگ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنا طے کیا تھا۔ اس کے باوجود سر سکندر حیات خاں (جو مسلم لیگ کے اہم رکن تھے) کونسل میں شریک ہو گئے۔ جناح کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے اخباروں میں یہ بیان دیا کہ لارڈ لنلتھگو کی یہ حرکت نہایت نا معقول ہے۔ اب ہوا یوں کہ وائسرائے سے ملاقات کا وقت گیارہ بجے دن کو مقرر تھا لیکن اس وقت تک جناح وہاں نہیں پہنچے تھے۔ ہر شخص جناح کی طبیعت سے واقف تھا کہ وہ وقت کے کتنے پابند تھے۔ ٹیلی فون پر ٹیلی فون ہوتے رہے۔

آخر سوا گیارہ بجے جناح گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ وائسرائے کو انتظار کی زحمت دینا خود جناح کے اخلاق سے بعید تھا لیکن اس موقع پر جناح نے کوئی معذرت نہیں کی۔ ہاتھ ملانے کے بعد جب دونوں بیٹھے تو وائسرائے نے ان کے اخباری بیان کا ذکر کیا اور کہا کہ شاید جناح کو ان کے طریقہ کار سے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے جسے وہ دور کرنا چاہتے تھے۔ یہ سنتے ہی جناح اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "جو کچھ ہوا اس کے لیے مجھے وائسرائے سے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔"

اتنا کہا اور وائسرائے کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ جو لوگ لنلتھگو کے دبدبے سے واقف ہیں وہی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے وائسرائے کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ ہمیں اس واقعے پر فخر ہوتا ہے کیونکہ جب دوسرے ہندوستانی لیڈر (جن میں کانگرسی ہائی کمان کے لوگ بھی شامل تھے) اس برطانوی وائسرائے کے لیے "شریف ترین انگریز" اور "شریف ترین کرسچین" کی توصیفی صفتیں استعمال کر رہے تھے، کم از کم ایک ہندوستانی تو ایسا تھا جو حق گوئی و بے باکی سے کام لیکر اس کے منہ پر کھری کھری سنا دینے کی جرات رکھتا تھا۔"(72)

کیا کوئی ہوشمند بندہ تسلیم کر سکتا ہے یہ وہ "ایجنٹ جناح" ہیں جسے مارچ 1940ء میں اسی وائسرائے نے قرارداد پاکستان لکھ کر دی اور اگست 1940ء میں اس وائسرائے کو سب کے سامنے "ایجنٹ "عزت افزائی کر رہے

ہیں؟

ایک اور دلچسپ بات بھی کانجی نے اپنی کتاب میں لکھی۔ یہ 1943ء کا واقعہ ہے جب کانجی نے اس "ایجنٹ جناح" کو کہا کہ جناح صاحب صرف مسلمان ہی کیوں ہندوؤں کو بھی لیڈ کریں کیونکہ کانگرس کا روّیہ منفی ہو چکا جس کی وجہ سے آزادی ملنا ممکن نہیں:

> "جناح جب دلی سے لوٹے (1943ء) تو میں ان سے ملنے گیا۔ اس موقع پر میں نے کہا کہ میرے خیال میں گانگرس کا روّیہ قطعی طور پر منفی ہو چکا ہے، جس سے ملک کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس طرح سوراج نہ ملے گا۔ کیوں نہیں وہ صرف مسلمانوں کے بجائے کل ہند پیانے پر سب فرقوں کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں؟ میں نے انھیں یاد دلایا کہ ہوم رول لیگ کے زمانے میں اور اس سے قبل بھی فی الواقع وہ کل ہند سطح کے لیڈر رہ چکے ہیں اور آج بھی ہندو مسلمان اور دوسرے فرقوں کی غیر گانگرسی جماعتوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہاں تک کہہ دیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے وہ جناح کو قیادت حاصل کرنے لیے ان کی طرف آس لگائے بیٹھے ہیں"(73)

اب ولی خان کے سب سے اہم الزام پر بات کرتے ہیں۔ ولی خان اپنی الزام کی بنیاد ایک خط کو بناتے ہیں جو قرارداد لاہور کی منظوری سے 12 روز پیشتر 11 مارچ 1940ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Linlithgow) نے وزیر ہند لارڈ زیٹ لینڈ (Zetland) کو لکھا تھا۔ ولی خان نے اپنی کتاب میں اس کا متن یوں نقل کیا ہے:

> "Upon my instruction, Zafarullah wrote a memorandum on the subject. Two Dominion States. I have already sent it to your attention. I have also asked him for further clarification, which, he says, is forthcoming. He is anxious, however, that no one should find out that he has prepared this plan. He has, however, given me the right to do with it what I like, including sending a copy to you. Copies have been passed on to Jinnah, and, I think, to Sir Akbar Hydari. While he, Zafarullah, cannot admit its authorship, his document has been prepared for adoption by the Muslim League with a view to giving it the fullest publicity."

ترجمہ:" میری ہدایت پر ظفر اللہ نے دو ڈومینین ریاستوں کے عنوان سے ایک یاد داشت تحریر کی ہے۔ میں اسے آپ کے ملاحظہ کرنے کے لیے پہلے ہی ارسال کر چکا ہوں۔ میں نے

اس سے مزید وضاحتیں طلب کی ہیں جو وہ کہتا ہے کہ مہیا کر دی جائیں گی۔ تاہم وہ اس بارے میں متردد ہے کہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ منصوبہ اُس نے تیار کیا ہے۔ البتہ اُس نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں اس مسودے کو جس طرح چاہوں استعمال میں لے آوں اور یہ کہ اس کی نقل آپ کو بھیج دوں۔ اس کی نقلیں جناح اور میرا خیال ہے اکبر حیدری کو بھی بھیجی گئی ہیں۔ اب جبکہ ظفر اللہ اپنی دستاویز کی تصنیف کا اعتراف نہیں کر سکتا، یہ دستاویز اس لیے تیار کی گئی ہے کہ مسلم لیگ اس نقطہ نگاہ کے ساتھ اختیار کر لے گی کہ اس کی خوب تشہیر کی جائے"۔

زاہد چودھری اور حسن جعفر زیدی کی مرتب کردہ کتاب "مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء میں اس معاملے کو" قرارداد لاہور کے محرکات کے متعلق ولی خاں کی غلط بیانی۔۔۔۔ایک عملی بددیانتی" کے عنوان سے بہت وضاحت سے کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"اب حقیقت حال یہ ہے کہ 12 مارچ 1940ء کو وائسرائے لنلتھگو کی جانب سے وزیر ہند زیٹ لینڈ کے نام لکھا گیا (اصل خط جو انڈیا آفس لائبریری کے ریکارڈ میں موجود ہے) اس کا متن ولی خان کے نقل کردہ متن سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ اصل خط کی عبارت یوں ہے:

"I sent by the last bag a copy of Zafarullah's note on dominion Status which I remarked purported to be statement of the position from extremer point of view. I introduced that qualification because I have not at that time had an opportunity of discussing its precise nature with him and certain of the propositions contained in it, were likely to appear formally under the name of a Member of my council, might, I think, have justified a description in those terms, I asked him yesterday to put me a little more in the picture, and he told me first that this is a first draft only;

secondly that, provided he is protected on that point and the paper is not used publicly, I may do what I like with it, including sending a copy to you;

thirdly that copies have been passed to Jinnah and *I think to Hydari* and fourthly that while he, Zafarullah cannot of course admit its

authorship, his document has been prepared for adoption by the Muslim League with a view to its being given the fullest publicity. I cannot claim even yet to have had time to absorb it fully, and I would prefer to suspend my comments on it until later. But it is a substantial and trenchant piece of work and I shall be greatly interested in your own reaction to it."

ترجمہ: "میں نے پچھلی مرتبہ بیگ میں ڈومینین کے درجہ کے بارے میں ظفر اللہ کے نوٹ کی نقل بھیجی تھی اور اس کے بارے میں لکھا تھا کہ اس دستاویز سے نسبتاً انتہا پسندانہ نقطۂ نظر مترشح ہوتا ہے۔ یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اُس وقت تک مجھے اس کی صحیح نوعیت کے بارے میں اُس کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس میں شامل بعض تجاویز، اگر میری کونسل کے ایک رُکن کے نام سے رسمی طور پر پیش ہوتیں میرے خیال میں ان الفاظ میں وضاحت کا جواز مہیا کرتی تھیں۔ میں نے کل اُس سے کہا کہ مجھے اس کے بارے میں ذرا کچھ تفصیل سے آگاہ کرو اُس نے مجھے بتایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ابھی ابتدائی مسودہ ہے، دوسرے یہ کہ اگر اس معاملے میں اُسے تحفظ دیا جائے اور اس دستاویز کا استعمال مشتہر کر کے نہ کیا جائے تو پھر میں جیسے چاہوں اس کو استعمال میں لا سکتا ہوں اور اس کی نقل آپ کو بھی بھیج سکتا ہوں، تیسرے یہ کہ اس دستاویز کی نقول جناح اور غالباً حیدری کو بھی دی گئی ہیں اور چوتھے یہ کہ اب جبکہ وہ یعنی ظفر اللہ بلاشبہ اس دستاویز کے مصنف ہونے کا اعتراف نہیں کر سکتا، یہ دستاویز اس لیے تیار کی گئی ہے کہ مسلم لیگ اس کی خوب تشہیر کرنے کے نقطۂ نگاہ سے اسے اختیار کرے۔ میں اب بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے پوری طرح سمجھ گیا ہوں اور میں بہتر سمجھوں گا کہ اس پر اپنی رائے موخر کر دوں۔ تا ہم یہ خاصا قابلِ قدر کام ہے اور میں اس کے بارے میں آپ کے ردِّ عمل میں دلچسپی رکھتا ہوں"۔

ولی خان اور اصل متن کی عبارتوں کا موازنہ کرنے سے ولی خان کی بد دیانتی خود بخود کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ولی خان کی پہلی بد دیانتی یہ ہے کہ اس نے تحقیق کے مروجہ قواعد کے مطابق اپنی کتاب میں نقل کردہ متن کا حوالہ ہی نہیں دیا جبکہ انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز کی تمام فائلوں اور ان میں شامل دستاویزات کے باقاعدہ نمبر لگے ہوئے ہیں اور ان کا حوالہ دینا بہت آسان ہے۔

دوسری بد دیانتی یہ ہے کہ اس نے اصل عبارت سے پوری کی پوری سطریں حذف کر کے اپنی طرف سے سطریں لکھ دیں اور پھر ان ہی سطروں کو بنیاد بنا کر ایک خیالی سازش کا محل کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ "Dominion Status" یعنی "ڈومینئن کا درجہ" کے الفاظ کو "Two Dominion States" یعنی "ڈومینئین ریاستوں" کے الفاظ سے تبدیل کر دیا ہے اور پھر اپنے پاس سے یہ اضافہ بھی کر دیا ہے کہ Upon my instructions Zaffarullah wrote a Memorandum حالانکہ اصل متن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ وائسرائے کی ہدایت پر ظفر اللہ نے یہ دستاویز تیار کی۔ بلکہ اس کے برعکس وائسرائے اس دستاویز کے مندرجات کا پوری طرح احاطہ ہی نہیں کر سکا تھا۔ گویا خود ہی ترمیم و اضافہ کر کے یہ لکھا کہ "وائسرائے کے کہنے پر "دو ڈومینئین ریاستوں کے قیام کا منصوبہ تیار کیا" اور پھر اس کو بنیاد بنا کر یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ قراردادِ لاہور کے پس پشت انگریزوں اور قادیانیوں کی سازش کارفرما تھی۔

ولی خان کی تیسری اور سب سے بڑی بد دیانتی یہ ہے کہ اس نے ظفر اللہ کی دستاویز کا کوئی حوالہ دے کر یہ نہیں بتایا کہ اس نے اس دستاویز میں کیا لکھا تھا۔ اس نے اس دستاویز سے ایک لفظ بھی نقل نہیں کیا جس پر اس نے اتنا طومار باندھا ہے۔"

آگے اس کتاب میں سر ظفر اللہ کی سکیم پر بحث کرتے ہوئے مصنف یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

"12 مارچ کو وائسرائے کی جانب سے وزیرِ ہند کو لکھے گئے خط کی اصل عبارت اور ظفر اللہ کی تیار کردہ دستاویز کے مکمل متن کے مطالعہ سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے:

1. اس دستاویز کو وائسرائے کی ہدایت پر نہیں، بلکہ از خود ظفر اللہ نے تیار کیا تھا اور جناح کو اس کی نقل بھیجی تھی۔
2. اس دستاویز کا عنوان "Two Dominion States" نہیں بلکہ "Dominion Status" تھا۔
3. اس دستاویز میں کوئی نئی یا خفیہ تجویز پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ جو سکیمیں کھلے عام مسلم رائے عامہ کے حلقوں مین زیرِ بحث تھیں ان کا جائزہ اور موازنہ پیش کیا گیا تھا۔
4. اس دستاویز میں پاکستان سکیم کو بالکل ناقابل عمل قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کے لیے پریشانی، مصیبت اور ہولناک نتائج کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے رد کر دیا گیا۔
5. اس دستاویز میں اگرچہ شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں میں علیحدہ علیحدہ وفاق تشکیل دینے اور

بقیہ ہندوستان کے لیے الگ ایک یا زیادہ وفاق وضع کرنے کی تجویز کو مسلمانوں کے لیے سب سے عمدہ حل سمجھا گیا ہے لیکن اس خدشے کی پیش نظر کہ اس کو نہ تو دوسرے فرقے اور نہ ہی برطانیہ حکومت منظور کرے گی، اس سکیم کو بھی خارج از امکان قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ دفاع اور بعض دیگر امور میں ہندوستان کے اتحاد کو کسی حد بر قرار رکھنے کی بات بھی سکیم میں کی گئی تھی۔

6. اس دستاویز میں حتمی طور پر ڈومینیئن کی حیثیت کی حامل ایک آل انڈیا فیڈریشن میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری اور مسلمانوں کے لیے مختلف تحفظات پر مبنی حل کو اختیار کرنے کی تائید کی گئی ہے اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔

7. اس دستاویز اور قرار دادِ لاہور کا موازنہ کیا جائے تو دونوں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں۔

8. قرار داد لاہور میں بر صغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ مسلم اکثریت کی آزاد اور خود مختار ریاستوں کے قیام کا مطالبہ نہ تو وائسرائے اور ظفر اللہ کی ساز باز کا نتیجہ تھا اور نہ ہی اسے کسی مسلم لیگی رہنما کے تخیل پرواز نے جنم دیا بلکہ یہ مطالبہ پہلے ہی مسلم عوام الناس کی امنگوں کا حصہ بن چکا تھا۔ مسلم لیگی رہنماؤں نے 23 مارچ 1940ء کو اسے فقط قرارداد کے الفاظ کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ قرارداد ان تاریخی عوامل کا نتیجہ تھی جن کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔

9. ولی خان جیسے بر خود غلط لوگ تاریخی عمل کو محض چند افراد کی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن تاریخ کا سائنسی نقطہ نگاہ سے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک عوام الناس تاریخی عمل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ مقبول عوامی رہنما بھی دراصل عوام کی رہنمائی نہیں بلکہ عوام کی امنگوں کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں"(74)

سید عاصم محمود کی قرارداد پاکستان پر تحقیق اتوار 16 اپریل 2017ء کو ایکسپریس میں شائع ہوئی ہے اس میں بھی اس حوالے سے اچھا خاصا مواد موجود ہے اسے پڑھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ولی خان نے اپنی کتاب میں کس قدر بد دیانتی کا مظاہرہ کیا۔ اور کتنی دیدہ دلیری سے جھوٹ لکھتا رہا۔

پچھلے ماہ ہم وطنوں نے "یوم پاکستان" روایتی جوش و جذبے سے منایا۔ اس دن ستر سال قبل ہمارے بزرگ ایک قرارداد سامنے لائے تھے جس میں انگریز حکومت اور ہندو لیڈروں کو باور کرایا گیا کہ ہندوستان میں آباد مسلمان ایک "قوم" ہیں، اقلیت نہیں! چنانچہ مسلم اکثریتی علاقوں میں خود مختار ریاستیں تشکیل دی جائیں تاکہ

وہ اپنے مذہبی اعتقادات اور رسوم ورواج پر آزادانہ عمل پیرا ہو سکیں۔ مسلمانان ہند نے اسی قرارداد کی روشنی میں تحریک آزادی پاکستان کا آغاز کیا اور سات برس بعد منزل مراد حاصل کرنے میں کامیاب رہے:

"یوم پاکستان کی مناسبت سے مختلف ٹی وی چینلوں نے پروگرام دکھائے جن میں دانشور، مورخ اور مدبر شریک ہوئے۔ ایک پروگرام میں مشہور مورخ، ڈاکٹر مبارک علی بھی تشریف لائے۔ دوران گفتگو انھوں نے فرمایا کہ قرارداد پاکستان کے مصنف چودھری محمد ظفر اللہ خان تھے جنھوں نے انگریز وائسرائے ہند، لارڈ لنلتھگو کے کہنے پر اس کو قلمبند کیا۔ بعد ازاں انھوں نے یکم اپریل کو معاصر اخبار میں ایک خط شائع کرایا جس کا لب لباب یہ ہے: "قرارداد لاہور (پاکستان) ایک غیر اہم دستاویز تھی جسے قیام پاکستان کے بعد دلکش داستان کی صورت پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ قرارداد انگریز وائسرائے کی تخلیق ہے جو اس نے اپنے ایک وزیر (ظفر اللہ خان) سے تحریر کرائی۔ انٹرنیٹ پر یہ ساری معلومات موجود ہیں۔ ریاستی مورخین نے حقائق کو مسخ کر دیا ہے۔"

اتفاق کی بات کہ میرا بیٹا بھی میرے ساتھ بیٹھا وہ ٹی وی پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اگلے دن اس کا میٹرک امتحان میں "مطالعہ پاکستان" کا پیپر تھا۔ جب ڈاکٹر مبارک علی کا دعویٰ سنا، تو مجھ سے پوچھنے لگا "پاپا! قرارداد پاکستان ظفر اللہ خان نے لکھی ہے؟ یہ کون ہیں؟ ہماری کتاب میں تو کچھ اور لکھا ہے۔" بیٹے کو بتایا کہ سر محمد ظفر اللہ خان (1893ء۔1985ء) ایک بڑے وکیل گزرے ہیں۔ پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ رہے۔ لیکن یہ واضح نہیں کہ کیا وہ قرارداد لاہور کے خالق ہیں۔ تبھی سوچا کہ اس موضوع پر تحقیق کر کے سچائی وطن عزیز کی نئی نسل تک پہنچائی جائے۔

محترم ڈاکٹر مبارک علی نے اشارہ دیا تھا کہ "انٹرنیٹ پر ساری معلومات موجود ہیں"۔ سو سب سے پہلے دورِ جدید کے طلسم ہوشربا میں داخل ہوا جہاں گوگل عمرو عیار کی زنبیل بن چکا۔ بس اسے کوئی حکم دیجیے، پلک جھپکنے میں مطلوبہ شے حاضر۔ قرارداد پاکستان لکھتے ہی وکی پیڈیا کا مضمون "لاہور ریزولیشن" سامنے آگیا۔ اور واقعی اس کے آغاز ہی میں درج تھا کہ قرارداد پاکستان محمد ظفر اللہ خان کی تخلیق ہے۔ مضمون میں یہ بھی پڑھنے کو ملا کہ لارڈ لنلتھگو نے ان کو ایسی قرارداد تحریر کرنے کا حکم دیا تھا جو انگریز حکومت کے مفادات کو تحفظ دے سکے۔ وکی پیڈیا کا متن پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ حوالہ دیکھا، تو انکشاف ہوا کہ یہ دعویٰ مشہور سیاست داں، ولی خان مرحوم نے اپنی انگریزی کتاب "Facts are facts: The untold story of India's partition" میں کر رکھا ہے جو پہلی بار 1987ء میں طبع ہوئی تھی۔ دعویٰ ایک خط پر مبنی ہے جو وائسرائے

ہند، لارڈ لنلتھگو نے لارڈ زیٹ لینڈ، انڈیا سیکرٹری (یعنی برطانوی حکومت میں ہندوستان کے امور دیکھنے والے وزیر) کے نام تھا۔ نیٹ سے راقم کو جو کتاب ملی، اس میں یہ ذکر عنقا ہے کہ ولی خان نے خط کہاں دیکھا اور اب وہ کس جگہ موجود ہے؟ حوالے کے بغیر خط کا ذکر ایسے ہی ہے کہ کوئی ہوا میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ دنیائے انٹرنیٹ کی خاک چھانی، تو افشا ہوا کہ جن تحریروں میں سر ظفر اللہ خان کو قرارداد پاکستان کا خالق بتایا گیا ہے، ان سبھی نے بطور حوالہ ولی خان صاحب کی کتاب درج کر رکھی ہے۔ بچپن سے تاریخی کتب پڑھنے کی چاٹ لگنے کے باعث ناچیز بھی علم تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ والد مرحوم کی لائبریری اور دیگر کتب خانوں میں موجود تاریخ کی سیکڑوں کتب دیمک کی طرح چاٹ چکا۔ اب بھی تواریخ عالم کا مطالعہ پسندیدہ ترین مشغلہ ہے۔ فیصلہ کیا کہ تاریخ کے بے پناہ سمندر میں غوطہ زن ہو کر تلاش کیا جائے، قرارداد پاکستان کا خالق کون ہے؟

پس منظر

آغاز میں قرارداد کا مختصر پس منظر جان لیجیے تاکہ اس زمانے کا سیاسی منظر نامہ ذہن میں آ سکے۔ مسلمان لیڈروں کے باہمی اختلافات سے تنگ آکر قائداعظم محمد علی جناح 1930ء میں لندن چلے گئے تھے۔ تاہم قائد کی صلاحیتوں کے معترف مسلم لیگی لیڈران پر زور ڈالتے رہے کہ واپس ہندوستان آ جائیں۔ آخر اپریل 1934ء میں قائد واپس آئے اور مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت بنانے کا بیڑا اٹھالیا۔ 1937ء میں برطانوی ہند کی تاریخ میں پہلی بار گیارہ صوبوں میں صوبائی الیکشن منعقد ہوئے جن میں عوام نے جوق در جوق ووٹ۔ اس الیکشن میں مسلم لیگ بنگال کے علاوہ کسی صوبے میں متاثر کن کارکردگی نہیں دکھا پائی۔ گو وہ ہندوستان کی دوسری بڑی سیاسی جماعت بن کر ابھری تاہم ہزیمت نے یہی آشکارا کیا کہ مسلم لیگ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ پارٹی نہیں۔ چنانچہ مسلم لیگی کارکنوں میں بے دلی پھیل گئی اور حتیٰ کہ جماعت کا مستقبل مخدوش نظر آنے لگا۔

اُدھر الیکشن میں گانگرس کو زبردست فتح ملی اور اس نے بنگال، پنجاب اور سندھ کے علاوہ بقیہ آٹھ صوبوں (صوبہ سرحد، اترپردیش، مہاراشٹر، بہار، بمبئی، مدراس، اڑیسہ اور آسام) میں اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ حکومتیں سنبھالتے ہی گانگرسی ہندو خصوصاً متحدہ صوبہ جات (اترپردیش)، بہار اور مہاراشٹر میں اپنا اصل روپ سامنے لانے لگے۔ انھوں نے "ہندی" کو صوبوں کی سرکاری زبان بنا دیا۔ سکولوں میں "ودیا مندر سکیم" اور "واردھا سکیم" لاگو کر دیں تاکہ نظام تعلیم ہندوانہ بنایا جا سکے۔ سکولوں میں نہایت اشتعال انگیز گیت "بندے ماترم" بطور قومی ترانہ گایا جانے لگا۔ گائے کے ذبیح پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ غرض گانگرسی

حکومتوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اگر انگریز ہندوستان کی باگ دوڑ ہندوؤں کو دے کر رخصت ہوئے، تو وہ مملکت کو "ہندوراج" میں تبدیل کر دیں گے۔ ہندوستان میں ہندوراج آنے کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے مسلم لیگ ایسا لائحہ عمل اختیار کرنے پر غور کرنے لگی جو مسلمانانِ ہند کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔

پہلے انگریز اور ہندوؤں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ ہندوستان میں ایک تیسری طاقت... مسلمان بھی بستے ہیں۔ چنانچہ 10 اکتوبر 1938ء کو کراچی میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں پہلی بار یہ قرار داد منظور کی گئی: "مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کو ایسی سکیم تیار کرنی چاہیے جو مسلمانانِ ہند کو آزادی و خود مختاری دلوا سکے۔" یہ قرار داد شیخ عبدالمجید سندھی نے پیش کی جبکہ اس کی تیاری میں صدر سندھ مسلم لیگ، عبداللہ ہارون نے اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت سندھ، بلوچستان، سرحد اور کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پنجاب، بنگال اور متحدہ صوبہ جات میں بھی ان کی بڑی تعداد بستی تھی۔ بقیہ صوبوں میں مسلمان کم یا زیادہ تعداد میں آباد تھے۔ قائداعظم اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں کے سامنے پہلے پہل یہ مسئلہ آن کھڑا ہوا کہ ہندوستان میں آباد سبھی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیونکر یقینی بنایا جائے؟ کیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسی وفاقی حکومت بنائیں جن میں انھیں بھی متوازی قوت حاصل ہو؟ یا پھر مسلم اکثریتی صوبوں کی علیحدہ ریاست یا ریاستیں بن جائیں؟ یا ایسا وفاق عمل میں لایا جائے جس میں صوبے خود مختار ہوں اور وفاقی حکومت صرف دفاع، امور خارجہ اور خزانہ سنبھال لے؟

درج بالا سوالات پر غور کرنے کے لیے ہی مسلم لیگ نے دو کمیٹیاں تشکیل دیں۔ پہلی کمیٹی "مجلس امور خارجہ" (فارن کمیٹی) کی بنیاد 4 دسمبر 1938ء کو رکھی گئی۔ کمیٹی کو یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ ہندوستان اور بیرون ممالک سے متعلق مسلم لیگ کی پالیسیاں تیار کرے۔ کمیٹی کے صدر، عبداللہ ہارون بنائے گئے۔ دیگر ارکان میں سر شاہنواز ممدوٹ، پیر محمد علی راشدی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عرفان اللہ، ڈاکٹر سید عبداللطیف، سید رضوان اللہ، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور سید اختر حسین شامل رہے۔

دوسری کمیٹی "مجلس آئینی" (کونسٹینیو شنل سب کمیٹی) 26 مارچ 1939ء کو وجود میں آئی۔ اسے یہ ذمہ داری دی گئی کہ (انگریز حکومت ختم ہونے کے بعد) مستقبل کی حکومت بنانے کے سلسلے میں اب تک جو مختلف آئینی سکیمیں و تجاویز سامنے آئی ہیں، ان کا جائزہ لے کر ایک رپورٹ مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان میں قائداعظم، نواب اسماعیل خان، عبداللہ ہارون، خواجہ ناظم الدین، سر سکندر حیات خان، عبدالمتین چودھری، سردار اورنگزیب خان اور سید عبدالعزیز شامل تھے۔ لیاقت علی خان کمیٹی کے کنوینر مقرر ہوئے۔

دونوں کمیٹیاں ایسی اسکیم وضع کرنے کی خاطر غور و فکر اور تحقیق کرنے لگیں مستقبل میں ہندوستانی

مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ اس ضمن میں پہلا سوال یہ درپیش تھا کہ مسلم اقلیت کو ہندو اکثریت کے غلبے سے کیونکر محفوظ رکھا جائے؟ ہندو مسلم اختلافات نیا عجوبہ نہیں تھے تاہم ان میں شدت اٹھارہویں صدی عیسوی سے آئی جب انگریز ہندوستان کی باگ دوڑ سنبھالنے لگے۔ انھوں نے اپنی حکومت مستحکم بنانے کے لیے ہندو اور مسلمانوں کو لڑانے کی پالیسی تخلیق کر ڈالی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر تک ہندو مسلم اختلافات ہندوستانی معاشرے میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ 23 اگست 1890ء کو مشہور ادیب و ناول نگار، مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے "تہذیب" کے اداریے میں لکھا: "نوبت یہاں تک پہنچ چکی کہ اب مسلمان اپنی مذہبی رسومات آزادانہ طور پر ادا نہیں کر سکتے"۔

اس عالم میں بہتر یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلہ آبادی کر لیا جائے۔" اس سے قبل سر سید احمد خان بھی کہہ چکے تھے کہ ہندوستان میں دو اقوام آباد ہیں، مسلمان اور ہندو! تاریخ مسلم لیگ پر لکھی جانے والی کتب سے عیاں ہے کہ مجلس امور خارجہ اور مجلس آئینی عام طور مل کر کام کرتی رہیں۔ دونوں کمیٹیوں نے مختلف سکیموں کا جائزہ لیا جن میں "علی گڑھ سکیم" (ڈاکٹر ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری)، "ثقافتی منطقوں کی وفاقی ریاست برائے ہند" (ڈاکٹر سید عبدالطیف)، "ہندوستانی فیڈریشن اسکیم" (سر سکندر حیات خان)، "چودھری رحمت علی کی سکیم" اور "ہندوستان کا اتحاد" (میجر میاں کفایت علی) قابل ذکر ہیں۔

جنگ عظیم کا آغاز

ایک جامع سکیم وضع کرنے کے سلسلے میں غور و خوض جاری تھا کہ ایک عالمی واقعہ ہندوستانی سیاست میں انقلاب لے آیا۔ یکم ستمبر 1939ء کو دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ 3 ستمبر کو برطانوی ہند کی حکومت نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ اعلان کرتے وقت گانگرس سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔ گانگرسی لیڈروں نے اسے اپنی سبکی قرار دیا اور اکتوبر 1939ء میں سبھی صوبائی حکومتیں ختم کر ڈالیں۔ گانگرسی حکومتوں کے خاتمے پر قائد اعظم کی ہدایت پر مسلمانوں نے 22 دسمبر 1939ء کو "یوم نجات" دھوم دھام سے منایا۔ انگریز پچھلے ایک سو برس سے ہندوؤں کے سرپرست بنے بیٹھے تھے۔ انھی کی سرپرستی کے باعث معاشرے میں ہندو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر سب سے زیادہ طاقتور قوم بن گئے۔ مگر اس طاقت نے انھیں مغرور و متکبر بھی بنا دیا۔ چناں چہ انگریز حاکموں نے بعض معاملات بالا بالا طے کیے، تو گانگرسی ہندو لیڈروں کو آگ لگی گئی۔ اب وہ انگریزوں پر زور ڈالنے لگے کہ ہندوستان کی حکومت ان کے حوالے کر دی

جائے۔ کانگرس نے انگریز حکومت سے تعاون کی شرط ہی یہ رکھی کہ خاتمہ جنگ کے بعد اقتدار اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

تاہم دوسری جنگ چھڑتے ہی مسلمانانِ ہند بھی انگریز حاکموں کی نظر میں اہم بن گئے۔ وجہ یہ کہ برطانوی ہند کی فوج میں مسلمان شامل تھے یا سکھ! جنگ کے باعث اب مزید فوجیوں کی ضرورت تھی جو انھیں خصوصاً مسلم اکثریتی صوبوں، پنجاب اور سرحد سے ملنے تھے۔ لہٰذا اب وہ مسلمانوں کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ تب تک مسلم لیگ پنجاب میں سب سے بڑی مقامی جماعت، یونینسٹ پارٹی سے اتحاد کر چکی تھی۔ گو کئی مسلم لیگی لیڈر اس اتحاد پر خوش نہیں تھے مگر اس نے مسلم لیگ کو مسلمانان ہند کی اہم ترین سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا۔

دوسری جنگ کی وجہ سے بدلتے ماحول میں لارڈ لنلتھگو اب قائداعظم کے مطالبات اور نکات پر زیادہ دھیان دینے لگا۔ قائداعظم کئی بار کہہ چکے تھے کہ برطانیہ کا "ایک آدمی ایک ووٹ والا" پارلیمانی و جمہوری نظام ہندوستان میں نہیں چل سکتا۔ مخالفت کی وجہ عیاں ہے۔ اس نظام میں ہندو اکثریت ہر شعبے میں مسلمان اقلیت پر حاوی ہو جاتی (بھارت میں یہ عمل جنم لے چکا)۔ لارڈ لنلتھگو نے قائداعظم سے فرمائش کی کہ اگر آپ برطانوی جمہوری نظام اپنانے کے خواہش مند نہیں، تو کوئی جامع متبادل نظام پیش کیجیے۔ قائداعظم نے حامی بھر لی۔

سکیم کی تیاری

مسلم لیگ کی دونوں کمیٹیاں ہندوستان کے مستقبل کے سلسلے میں مختلف سکیموں پر غور کر رہی تھیں۔ اب قائداعظم جلد از جلد کوئی متفقہ لائحہ عمل اختیار کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی جنگ تیز تر ہو سکے۔ ان کی ہدایت پر کمیٹی امور خارجہ فعال ہو گئی۔ 1 فروری 1940ء کو ارکان کمیٹی نے مختلف سکیموں کے خالقوں سے ملاقات کی۔ بعد ازاں سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں ارکان کمیٹی نے "مسلم لیگی سکیم" وضع کرنے کے لیے ایک نوٹ تیار کیا جس میں مختلف سکیموں کے چیدہ چیدہ نکات جمع کر دیے گئے۔

دہلی میں 3 تا 6 فروری 1940ء مسلسل چار روز مسلم لیگ کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کے اجلاس ہوئے۔ یاد رہے، یہ مسلم لیگ کا سب سے طاقتور ادارہ تھا۔ اکیس رہنما اس کے مستقل رکن تھے۔ جب مسلم لیگ کا کوئی سالانہ اجلاس منعقد ہوتا، تو ایک دن پہلے اسی مجلس عاملہ کو تین چار ارکان کے اضافے سے "مجلس انتخاب مضامین" (سبجیکٹس کمیٹی) میں تبدیل کر دیا جاتا۔ یہی مجلس سالانہ اجلاس میں پیش ہونے والی قراردادوں

کے متن کی حتمی منظوری دیتی۔ مجلسِ عاملہ کے بعد "مسلم لیگ کونسل" دوسرا اہم ذیلی ادارہ تھی۔ اس کے تقریباً پانچ سو رکن تھے جو مسلم آبادی کے لحاظ سے مختلف ہندوستانی صوبوں سے منتخب کیے جاتے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے مندوبین (ڈیلی گیٹس) اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تھی۔ یہ تینوں ذیلی ادارے ہی جس قرارداد کو منظور کرتے، وہ ایک اٹل حقیقت بن جاتی۔

چناں چہ اوائل فروری 1940ء میں مجلسِ عاملہ کے اجلاس ہوئے، تو ان میں مجلس امور خارجہ کے نوٹ پر غور و فکر ہوا۔ اب یہ نوٹ تاریخ پاکستان میں "عبداللہ ہارون سکیم" کہلاتا ہے۔ اس میں مسلمانانِ ہند کو "ایک قوم" بتا کر "آزاد مسلم ریاست" کا تصور پیش کیا گیا۔ (بحوالہ The Haroon Report: از اے جی نورانی، سہ ماہی Criterion اسلام آباد، جلد سوم، شمارہ چار) مزید براں دیگر سبھی سکیموں کو بھی دیکھابھالا گیا اور ان کی خوبیاں و خامیاں زیر بحث آئیں۔ دراصل اگلے ماہ لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ قائداعظم سمیت سبھی لیڈر چاہتے تھے کہ اس اجلاس میں "مسلم لیگی سکیم" کا اعلان کر دیا جائے۔ چناں چہ اس کی تیاری پر زور و شور سے کام جاری تھی۔

21 مارچ کی صبح قائداعظم مع ساتھیوں کے لاہور پہنچ گئے۔ ریلوے سٹیشن پر انھوں نے صحافیوں کو بتایا "مسلم لیگ اپنے اس سالانہ اجلاس میں تاریخی اعلان کرنے والی ہے۔" اسی دن شام کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ قائداعظم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ سے منسلک اسسٹنٹ پروفیسر، ڈاکٹر فاروق احمد ڈار کا ایک مضمون "Jinnah and the Lahore Resolution" نیٹ پر موجود ہے جو پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے کسی جرنل میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ اسی اجلاس میں طے پایا کہ مسلم لیگی سکیم یعنی قرارداد لاہور تیار کرنے کی ذمہ داری قائداعظم اور وزیراعظم پنجاب، سر سکندر حیات خان کو سونپی گئی۔ چونکہ قائداعظم بہت مصروف تھے لہٰذا اسی قرارداد کا ابتدائی متن سر سکندر نے تیار کیا۔ اس دعویٰ کی خامی یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ 21 مارچ کے اجلاس ہی میں مجلس انتخاب مضامین کے چار نئے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔ 22 مارچ کی سہ پہر مسلم لیگ کا کھلا اجلاس منعقد ہوا جس میں مندوبین بھی شریک ہوئے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس اجلاس میں جب سر سکندر کا ذکر آیا، تو کئی مندوبین ان پر تنقید کرنے لگے۔ موصوف اتنے زیادہ گھبرائے کہ پنڈال کے عقبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ (بحوالہ "یادوں کے چراغ" از عبداللہ ملک)۔ 22 مارچ کی شام ہی ممدوٹ ولا میں مجلس انتخاب مضامین کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی تفصیل تحریکِ پاکستان کے بعض لیڈروں نے اپنی کتب اور مضامین میں بیان کی ہے۔

تاہم ان میں مفصل بیان سید شمس الحسن (1892ء۔1981ء) نے سپردِ قلم کیا۔ سید صاحب

1914ء سے 1947ء تک مسلم لیگ کے سیکرٹری رہے۔ جماعت کی روزمرہ تمام تنظیمی کارروائیاں انھی کی وساطت سے انجام پاتی تھیں۔ سید شمس الحسن کئی اخبارات ورسائل میں طبع شدہ اپنی یادداشتوں میں رقم طراز ہیں: " مجلس انتخاب مضامین کے اجلاس میں مختلف سکیموں کا جائزہ لیا گیا اور متفرق آئینی مسائل زیر بحث آئے جن کا ذکر قائداعظم نے اپنی تقریر میں کیا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ مجلس عاملہ قرارداد کا متن تیار کرے تاکہ بعد ازاں اسے برائے منظوری مجلس انتخابِ مضامین کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ چونکہ وقت کم تھا، اس لیے اسی رات مجلسِ عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ وہاں طویل مباحثے کے بعد قرارداد کے مندرجات تیار کیے گئے۔ آخر میں مجلسِ عاملہ نے لیاقت علی خان، نواب اسماعیل خان اور ملک برکت علی کو قرارداد لاہور کا متن لکھنے کی ذمے داری سونپی۔ ملک برکت علی نے متن تحریر کیا۔"

دیگر مسلم لیگی رہنما اپنی تحریروں میں لکھتے ہیں کہ یہ متن انگریزی میں تھا جسے مولانا ظفر علی خان نے اردو کا جامہ پہنایا۔ یہ کام انجام پاتے ہوئے رات کے بارہ بج گئے تھے۔ اگلی صبح دس بجے مجلس انتخاب مضامین کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا۔ تب متن میں مزید کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ اسی دن سہ پہر کو مسلم لیگ کا عام اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں باقاعدہ طور پر قرارداد لاہور عوام وخواص کے سامنے پیش کر دی گئی جو اب قرارداد پاکستان کہلاتی ہے۔ اگلے دن مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی وکونسل کے ارکان اور مندوبین نے قرارداد لاہور منظور کر کے اسے اٹل صورت دے دی۔

قرارداد پاکستان کی تاریخ سے عیاں ہے کہ اس کو نامور علمی وسیاسی شخصیات کے نظریات، خیالات اور تصورات سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیق کیا گیا۔ کسی ایک فرد کو اس کا خالق نہیں کہا جاسکتا! رنگارنگ اور ہمہ نوعی نظریات کا جوہر نکال لینا آسان کام نہ تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں اور مسلم اقلیتی صوبوں میں آباد مسلمانوں کی اپنی اپنی مخصوص ضروریات تھیں۔ لہٰذا مسلم لیگی لیڈروں پر ایسی قرارداد وضع کرنے کی بھاری ذمے داری آن پڑی جو سبھی مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھ سکے۔ نہایت کٹھن کام کے سبب ہی قرارداد میں کچھ ابہام بھی رہ گئے جنھوں نے آگے چل کر مسائل کھڑے کیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بدلتے اور نت نئے تقاضوں کے تحت قرارداد کا متن کئی بار تبدیل بھی ہوا۔ تاہم قائداعظم کی زیر قیادت مسلم لیگی رہنما مسلمانانِ ہند کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے قرارداد لاہور کی صورت پہلا ٹھوس قدم اٹھانے میں ضرور کامیاب رہے۔

اس قرارداد نے دنیا والوں پر آشکارا کر دیا:

1. مسلمانان ہند ایک قوم ہیں۔
2. ہندوستان میں مخصوص مذہبی، سیاسی و معاشرتی حالات کے باعث برطانوی جمہوری نظام کامیابی

سے نہیں چل سکتا۔

3. جن ہندوستانی صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں آزاد ریاستیں تشکیل دی جائیں۔

4. ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان کے حقوق کو پورا تحفظ دیا جائے۔

کیا سر سکندر خالق ہیں؟ بعض مورخین نے سر سکندر حیات خان کو قراردادِ لاہور کا خالق قرار دیا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی وفاقی سکیم میں خود مختار مسلم ریاستوں کا تصور عنقا تھا بلکہ سبھی مسلم ریاستیں وفاق کے تابع تھیں جن پر بعد از آزادی ہندوؤں کا قبضہ ہو جانا تھا۔ سر سکندر نے اپریل 1939ء میں اپنی سکیم پیش کی تھی۔

تحریک پاکستان کے رہنما، سید شریف الدین پیرزادہ اپنی کتاب "Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah and Pakistan" کے باب "Jinnah, the Two Nation theory and the demand for Pakistan" میں لکھتے ہیں انگریز وائسرائے نے سر سکندر کو اپنی سکیم پیش کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں اسے عبداللہ ہارون سکیم کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے۔ اس ضمن میں پیرزادہ صاحب نے گورنر پنجاب کا خط بنام وائسرائے ہند بطور ثبوت پیش کیا ہے۔ یہ انکشاف واضح کرتا ہے کہ سر سکندر انگریز ایجنٹ تھے جو مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد بھی اپنے آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کرنے کی پوری سعی کرتے رہے۔

مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور مشہور سیاست داں، چوہدری خلیق الزماں اپنی خود نوشت "شاہراہ پاکستان" میں رقم طراز ہیں: 4 فروری (1940ء) کو مجلسِ عاملہ میں سر سکندر حیات نے اپنی سکیم کی پر زور وکالت کی۔ لیکن دو گھنٹے تک بحث مباحثے کے بعد جناح کی تائید سے سکیم نامنظور کر دی گئی۔

حقائق سے عیاں ہے کہ اوائل میں سر سکندر نے انگریز حکمرانوں کے کہنے پر یا اپنی مرضی سے قرارداد لاہور کی تیاری میں حصہ لیا۔ وہ مسلم اکثریتی صوبوں کی خود مختاری کے تو خواہش مند تھے، مگر انھیں غیر مسلم وفاق کے ساتھ نتھی کرنا چاہتے تھے۔ جب مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے ان کی سکیم مسترد کر دی، تو وہ قرارداد لاہور سے لاتعلق ہو گئے۔ 23 مارچ کے عام جلسے میں وہ موجود نہیں تھے۔ سر سکندر ویسے بھی اندرون خانہ مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ ان کی تا عمر سعی رہی کہ مسلم لیگ پنجاب میں قدم نہ جمانے پائے۔ 11 مارچ 1941ء کو پنجاب اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے سر سکندر نے خود کہا تھا "میں نے جو قرارداد (لاہور) تیار کی تھی، اس میں (مسلم لیگ) کی مجلسِ عاملہ انقلابی تبدیلیاں لے آئی تھی۔ لہٰذا میری قرارداد اور منظور ہونے والی قرارداد میں بہت فرق تھا۔" (بحوالہ Lahore Resolution and question of provincial

autonomy از پروفیسر شریف المجاہد، ڈیلی بزنس ریکارڈر، 23 مارچ، 2007ء)

سر ظفراللہ خان کا قصہ یہ دسمبر 1981ء کی بات ہے، ممتاز سیاستدان ولی خان نے لاہور کے مشہور ہفت روزہ "چٹان" کو انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ قرارداد پاکستان سر ظفراللہ خان کی تخلیق ہے اور یہ کہ برطانوی نسرے ہند، لارڈ لنلتھگو نے یہ قرارداد ان سے لکھوائی تھی۔ بعدازاں اس دعویٰ کو ولی خان نے اپنی انگریزی کتاب کا بھی حصہ بنادیا جس کا ذکر درج بالا ہو چکا۔ کتاب میں بغیر حوالہ مصنف نے انڈیا سیکرٹری کے نام لارڈ لنلتھگو کے خط کا ذکر کچھ یوں کیا ہے:

"Upon my instruction Zafarullah wrote a memorandum on the subject. Two Dominion States. I have already sent it to your attention. I have also asked him for further clarification, which, he says, is forthcoming. He is anxious, however, that no one should find out that he has prepared this plan. He has, however, given me the right to do with it what I like, including sending a copy to you. Copies have been passed on to Jinnah, and, I think, to Sir Akbar Hydari. While he, Zafarullah, cannot admit its authorship, his document has been prepared for adoption by the Muslim League with a view to giving it the fullest publicity."

یہ خط عیاں کرتا ہے کہ برطانوی حاکموں کے حکم پر ایک متنازع مذہبی پس منظر رکھنے والی اہم شخصیت نے وہ قرارداد تحریر کی جو تحریک پاکستان کے ضمن میں مسلم لیگ کا "میگنا کارٹا" بن گئی۔ لیکن حقائق کچھ اور افشا کرتے ہیں۔ ہفت روزہ چٹان میں ولی خان کا انٹرویو شائع ہوا، تو ملک بھر میں ہلچل مچ گئی اور دانشور اپنی آرا پیش کرنے لگے۔ حقیقت جاننے کی خاطر روزنامہ پاکستان ٹائمز، راولپنڈی نے 13 فروری 1982ء کو سر ظفراللہ خان کا انٹرویو شائع کیا جو تب حیات تھے۔ اس انٹرویو میں سر ظفراللہ نے دعویٰ کیا کہ نوٹ انھوں نے اپنی مرضی سے تحریر کیا تھا۔ اسی انٹرویو میں انڈیا سیکرٹری کے نام لارڈ لنلتھگو کا خط بھی شائع ہوا جس کا متن ظفراللہ خان نے اخبار کو مہیا کیا تھا۔ وہ ملاحظہ فرمائیے:

"'I sent by the last bag a copy of Zafarullah's note on dominion Status which I remarked purported to be statement of the position from extremer point of view. I introduced that qualification because

I have not at that time had an opportunity of discussing its precise nature with him and certain of the propositions contained in it, were likely to appear formally under the name of a Member of r.iy council, might, I think, have justified a description in those terms. I asked him yesterday to put me a little more in the picture, and he told me first that this is a first draft only; secondly that, provided he is protected on that point and the paper is not used publicly, I may do what I like with it, including sending a copy to you; thirdly that copies have been passed to Jinnah and I think to Hydari and fourthly that while he, Zafarullah cannot of course admit its authorship, his document has been prepared for adoption by the Muslim League with a view to its being given the fullest publicity.I cannot claim even yet to have had time to absorb it fully, and I would prefer to suspend my comments on it untii later. But it is a substantial and trenchant piece of work and I shall be greatly interested in your own reaction to it."

ولی خان صاحب کی کتاب میں دیے گئے خط اور درج بالا خط میں واضح فرق ہے۔ یہ عیاں کرتا ہے کہ ولی خان نے اپنا دعویٰ سچ ثابت کرنے کی خاطر خط کا متن توڑ مروڑ کے پیش کیا جو ایک قسم کی علمی بددیانتی ہے۔

دور جدید کی ممتاز مورخ، ڈاکٹر عائشہ جلال نے حیاتِ قائد پہ لکھی اپنی انگریزی کتاب "The Sole Spokesman" میں سر ظفر اللہ خان کے نوٹ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ چونکہ ان کا شمار "ریاستی مورخین" میں نہیں ہوتا لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ کے افکار اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کتاب کے دوسرے باب "Jinnah and the League's search for survival" میں رقم طراز ہیں:

"وسط فروری 1940ء میں ظفر اللہ خان نے اپنا نوٹ وائسرائے ہند کو بھجوایا۔ انھوں نے اس میں تین سکیموں کا ذکر کیا۔ اوّل سکیم چودھری رحمت علی سکیم سے مشابہ تھی جسے انھوں نے "نہایت غیر عملی" قرار دیا۔ دوسری "فیڈرل سکیم" تھی۔ اس کے تحت انھوں نے اسلامی ریاستیں قائم کرنے کی تجویز دی جو وفاق کے ماتحت ہوں۔ تیسری "علیحدگی سکیم" تھی۔ اس کے تحت مسلم اکثریتی صوبوں کی دو اسلامی ریاستیں قائم کردی

جاتیں۔جناح نے یہ نوٹ دیکھا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں بھی اسے پیش کیا ہو گا۔ مگر سر ظفر اللہ کی دونوں سکیموں کو قبولیت نہ ملی۔ فیڈرل سکیم کی رو سے دونوں اسلامی ریاستیں کئی معاملات میں انگریزوں (یا ہندوؤں) کی محتاج بن جاتیں۔ جبکہ علیحد گی سکیم میں مسلم اقلیتی صوبوں میں آباد مسلمانوں کو بے یارو مدد گار چھوڑ دیا گیا۔ مزید براں جناح اسلامی ریاستوں (یا ریاست) میں مضبوط مرکز (وفاق) چاہتے تھے تا کہ از حد صوبائی خود مختاری کی خرابیوں سے بچا جا سکے۔"

گویا قائد اعظم اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے سر ظفر اللہ خان کے نوٹ کا جائزہ ضرور لیا اور ممکن ہے کہ کچھ نکات سے استفادہ بھی کیا ہو۔ مگر آخر کار اسے بھی بقیہ سکیموں کا حصہ بنا دیا گیا۔ یہ نوٹ "لنلتھگو پیپرز" میں محفوظ ہے۔اس کا نمبر MSS EUR,F / 125/9 ہے۔ ساتھ لارڈ لنلتھگو کا خط بھی ہے جو 12 مارچ 1940ء کو لکھا گیا۔لارڈ لنلتھگو 1936ء تا 1943ء وائسرے ہند رہا۔ اس دوران لارڈ نے جو سر کاری خط کتابت کی، وہ لنلتھگو پیپرز کے نام سے برٹش لائبریری میں موجود ہے۔"(75)

جناح صاحب کی شراب نوشی اور رتی کے ساتھ نکاح

ولی خان کے الزامات سے ہٹ کر جناح صاحب پر کچھ دوسرے الزامات پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً جناح صاحب شراب پیتے تھے سور کا گوشت کھاتے تھے۔ اس حوالے سے میرے دوست ارشد خان صافی نے جتنی خوبصورت تحریر لکھی اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ارشد خان لکھتے ہیں کہ "محمد علی جناح، شراب، سور، اور دیسی سیکولر قوم پرست:

"جناح تو شراب پیتے تھے اور سور کھاتے تھے"!سوشل میڈیا کی جہالت انگیزی سے لیکر "سنجیدہ"قسم کے مباحثوں میں یہ چند روایتی جملوں میں سے ہے جو کہ دیسی لبرل بھانڈوں اور نام نہاد سیکولر قوم پرست گلمر جانوں کی "آخری دلیل"ہوتی ہے-ظاہر ہے پاکستان سے غیر صحتمندانہ دلچسپی رکھنے والے ہمارے افغانی اور بھارتی دوستوں کے لیے یہ "سکینڈل"کسی فکری اثاثے سے کم نہیں جو کہ عام پاکستانی نوجوان کو جو کہ قائد کو مطالعہ پاکستان کی نظر سے دیکھتا ہے مشکل میں ڈال دیتا ہے- گو کہ یہ ایک دلیل سے زیادہ گھٹیا قسم کا نعرہ لگتا ہے لیکن ان خاص اقلیتی طبقات فکر میں اتنا مقبول ہے کہ راجہ داھر کو اپنا قومی ہیرو قرار دینے والے اے این پی کے حاجی عدیل مرحوم (جن کو ان کے نظریاتی مخالف

پنڈت عدیل کہتے تھے) سینیٹ تک میں اسکا ذکر کر بیٹھے جس کی بعد میں ان کو معذرت کرنی پڑی-

اس گھٹیا قسم کی دلیل کو استعمال کرنے والے اکثر پڑھے لکھے دانشور بھی اس سکینڈل کے واحد ماخذ سے ناواقف ہیں جو نہ تو محمد علی جناح صاحب کا اسلامی طور پر ممنوعہ حرام اشیا کا استعمال کا کوئی معلوم واقعہ ہے اور نہ ہی نشے کے حالت میں غل غپاڑہ کرنے کا کوئی کیس بلکہ "روزز ان دسمبر" نامی ایک کتاب کے چند بازاری سے جملے ہیں- اس سے دیسی لبرلوں اور سیکولر قوم فروشوں کی تاریخ کی سمجھ اور "سیکولر ریشنلزم" کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے- کتاب کے مصنف جسٹس چاگلہ تھے جو کہ گاندھی جی سے زیادہ بھارت ماتا کے وفادار مشہور تھے- 1920ء کی دہائی میں چھاگلہ بیرسٹر تب محمّد علی جناح کے سیکرٹری رہے تھے جب جناح صاحب گانگرس کے ممبر تھے اور نہرو رپورٹ کی حمایت کرنے پر انھوں نے چھاگلہ کو برخاست کر دیا تھا کیونکہ جناح صاحب رپورٹ کو مسلم دشمنی قرار دیکر خود بھی گانگرس سے الگ ہو گئے تھے- چاگلہ کو آزادی کے بعد گانگرس کی طرف اس کی وفاداری کے لیے خوب نوازا گیا اور بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہنے کے بعد وہ بھارت کے وزیر خارجہ بھی رہے- اپنی کتاب میں ایک جگہ منظر کشی کرتے ہوئے جسٹس چاگلہ نے غیر ضرور طور پر ضمناً بلکہ طنزاً بیرسٹر جناح صاحب کے دور جوانی میں ایک الیکشن مہم کے دوران ہیم سینڈوچ کا ذکر کیا ہے- موصوف اس "تاریخی حقیقت" کے واحد مخبر اور گواہ ہیں جس کا غیر ضروری چرچا مخصوص وجوہات کی بنا پر آج تک کیا جاتا ہے- بعد میں جتنے بھی بھارتی، مغربی اور دیسی سیکولر مورخین آئے انھوں نے اپنی تحریروں میں رنگ بھرنے کے لیے اسی بے بنیاد فسانے کا سہارا لیا اور آج تک مغربی اور ہندوستانی میڈیا میں بانی پاکستان کے متعلق آرٹیکلز میں اس امر کا ذکر بوجوہ ایک واجب کی طرح کیا جاتا ہے- ان محققوں میں جناح کے امریکی مداح اور مورخ سٹینلے ولپرٹ کے علاوہ ملالہ کی کتاب کی اصل مصنفہ کرسٹینا لیمب بھی شامل ہے- گو کہ اتنے بڑے قد کاٹ کے عالمی سطح کے تاریخی رہنما کے سوانح یا افکار میں عام طور پر یہ کوئی قابل ذکر بات بھی نہیں ہوتی لیکن ظاہر ہے وہ اسلام کے نام پر بنے پہلے جدید مسلم مملکت کے بانی تھے تو اس بات کو زیادہ ہوا دی گئی- مقصد محمد علی جناح صاحب کے کسی ذاتی فعل کا شرعی دفاع نہیں لیکن مسلمانوں کی تاریخ کے تناظر میں عرض ہے کہ محمد علی جناح صاحب تو صرف ایک قانون دان اور مسلمان سیاسی رہنما

تھے، مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر سے لیکر اسلامی تاریخ کے افسانوی شہرت کے ملک فاتح بیت المقدس صلاح الدین ایوبی تک ایام جوانی میں بادہ نوشی کرتے رہے تھے۔ ظہیر الدین بابر نے رانا سانگا کے ساتھ خانواہ کی لڑائی کو جہاد قرار دیتے ہوئے منت کے طور پر اپنے شراب کے برتن توڑ کر بادہ نوشی چھوڑ دی تھی جبکہ صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں اور اپنے مخالفین کے خلاف مسلمانوں کی قیادت سنبھالتے وقت شراب سے توبہ کر دی تھی۔ اس بات کے بہر حال مسلم اور غیر مسلم گواہ موجود ہیں کہ زندگی کے آخری سالوں میں محمد علی جناح نے مذہبی بنیادوں پر اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود ٹی بی کی علامات میں افاقے کیلیے برانڈی پینے سے انکار کیا تھا۔ انھوں نے مذہبی بنیادوں پر ہی اپنے انجان غیر مسلم بیٹی سے ناطہ توڑ دیا تھا جس کو انھوں نے زندگی میں بہت کم دیکھا تھا۔

بیرسٹر محمد علی جناح نے کبھی خود کو مسلمانوں کا کوئی مذہبی رہنما یا امام نہیں کہا بلکہ سختی سے ہر ایسے تاثر کی نفی کی۔ انھوں نے ہمیشہ خود کو برصغیر کے مسلمانوں کا ایک قانونی اور سیاسی وکیل کہا جن کو اس خطے پر 800 سالہ حکمرانی کرنے کے باوجود تاریخ کی ستم ظریفی اور اپنے ہی نام نہاد مذہبی طبقے نے فکری اور معاشی طور پر بہت پسماندہ اور کمزور کر دیا تھا اور خود کو انکا ایک بہترین اور کامیاب وکیل ثابت بھی کیا۔ ان کو برصغیر کے روایتی سیاستدانوں سے میچ کرنے میں تو عالمی شہرت یافتہ ان کے ان بڑے بڑے ہندو مخالفین اور بھارتی دانشوروں کو بھی ہمیشہ سخت دشواری ہوتی ہے گلمرجانوں کے لیڈر جن کے معمولی مقامی کارندے تھے۔ گاندھی اور نہرو دونوں نے ان کو مسلمانوں کا عظیم ترین لیڈر کہا اور مشترکہ ہندوستان کے وزارت عظمٰی تک کی پیشکش کی۔ انگریز اور ہندو دونوں انسے شدید اختلاف کے باوجود ان کی ایمانداری اور پاکستان کے کاز کے ساتھ ان کے غیر متزلزل عزم پر سوال نہیں اٹھا سکے۔ پاکستانیوں کیلیے بحیثیت ملت پاکستان کے سیاست اور ریاست میں اسلام کے کردار کے متعلق کسی بھی ملت کے بابائے قوم کی طرح ان کی ذاتی زندگی کے متعلق تخیل کی بنیاد پر نظریے گھڑنے کے بجائے ان کے فرمودات اور تقاریر کے علاوہ ان کے فکری اتالیق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی تعلیمات کافی ہیں۔ اقبال کی طرح پشتون قوم کیلیے ان کی شفقت پورے برصغیر کے مسلمانوں کا لیڈر ہو کر بھی پختونخوا کے لیے ان کی توجہ اور خدمات سے ظاہر ہے جس میں الگ صوبے کے حیثیت کے لیے ان کے جدوجہد کے علاوہ اسلامیہ کالج پشاور کے لیے اپنے جائیداد کا تیسرا حصہ وقف کرنا شامل ہے۔ اللہ بہتر

جانتا ہے کس سے کیا کام لینا ہے ورنہ کسی نام نہاد "مذہبی رہنما" کو ہی تاریخ کے اس مشکل دور میں مسلمانوں کے قیادت کا حق ہوتا تو اس وقت کے مولانا فضل رحمان دیوبندیوں کے رہنما ہوتے، اس وقت کے کوئی مولانا رضوی بریلویوں کے جبکہ اہل تشیع کی رہنمائی کوئی مولانا نقی نقن نقوی جیسا ذاکر یا پھر لڈن جعفری جیسا کوئی نمونہ ہوتا۔ نتائج سمجھنے کیلیے کسی کا سکالر ہونا ضروری نہیں۔"

اس کے علاوہ جناح صاحب کی رتی کے ساتھ شادی پر اور بعد میں علیحدگی پر بھی یار لوگ اپنی طرف سے پروپیگنڈے کرتے رہتے ہیں اور تاثر دیتے ہیں جیسے جناح صاحب انسانی جذبات سے عاری ایک بے حس انسان تھے اور اس نے کم سن لڑکی سے شادی کر کے اسے مرنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ کانجی دوارکاداس، جو جناح صاحب اور رتی دونوں کا دوست تھا اس نے رتی پر ایک کتاب بھی لکھی اس بارے لکھتے ہیں کہ

"جنوری 1928ء میں کلکتہ مسلم لیگ کے اجلاس سے واپسی پر رتی اور جناح میں علیحدگی ہو گئی۔ میں اس کا ذمہ دار ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قرار نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی سبب تھا تو وہ صرف مزاج اور عمر کا فرق تھا۔ رتی کا انتقال ہوئے 35 سال گزر گئے لیکن میں ذاتی علم کے بنا پر آج بھی یہی کہوں گا کہ وہ آخری دم تک جناح سے محبت کرتی رہیں۔ 3 اپریل 1928ء کو جناح انگلستان گئے۔ اس کے ایک ہفتے بعد رتی بھی پہنچ گئیں۔ اس سال اگست اور ستمبر کے درمیان رتی پیرس میں سخت بیمار پڑیں۔ اس وقت میاں بیوی میں مفاہمت ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب جناح کو رتی کے نرسنگ ہوم میں داخل ہونے کی خبر ملی تو وہ فوراً پیرس پہنچے اور اسی نرسنگ ہوم میں مقیم ہوئے۔ بعد میں مجھے رتی نے بتایا کہ جناح وہیں بیٹھ کر کھانا کھاتے اور وہی پرہیزی غذا کھاتے جو رتی کے لیے پکائی جاتی۔ اس کے بعد رتی اپنی ماں کے ساتھ ہندوستان لوٹیں، جناح بھی واپس آ گئے۔ رتی پوری طرح اچھی نہ ہو پائیں اور 20 فروری 1929ء کو اللہ کو پیاری ہو گئیں، میں ان دنوں ان سے تقریباً روزانہ ملتا تھا۔"

رتی کی وفات بارے لکھتے ہیں کہ:

"اس وقت سے لیکر تجہیز و تکفین تک، یعنی پورے پانچ گھنٹے میں جناح کے ساتھ رہا۔ میرا خیال تھا کہ خود رتی دفن کیے جانے کے بجائے (ہندوؤں کے طریقے سے) جلائے جانا پسند کرتیں۔ یہ بات میں نے جناح سے بھی کہی لیکن وہ نہ مانے اور اسلامی طریقے سے دفن کا انتظام کیا گیا۔ سارا وقت جناح بڑے ضبط اور ہمت سے کام لیتے رہے۔ کچھ دیر تو خاموش

رہے پھر انھوں نے یکایک بڑی روانی کے ساتھ اسمبلی کی کارروائیوں کا ذکر کرنے لگے۔ وہ اسمبلی کے اسپیکر وٹھل بھائی پٹیل کا ذکر کرکے کہنے لگے کہ کس طرح وہ حکومت کے خلاف ایک پیچیدگی میں پڑ گئے تھے اور پھر کیسے انھوں نے وٹھل بھائی کی دستگیری کی، اور دوسری باتوں کا بھی ذکر کرنے لگے۔ لیکن یہ بات چھپ نہیں رہی تھی کہ جناح کا دل رو رہا ہے۔ اور وہ بے محل گفتگو چھیڑ کر اپنے جذبات کو چھپانے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب اسی وقت تک ہوتا رہا جب تک جنازہ قبر کے پاس رکھا تھا، لیکن جونہی رتی کی لاش قبر میں اتاری گئی اور جناح سے مٹی دینے کو کہا گیا تو ضبط کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ دیر تک بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں اور بوجھل دل کے ساتھ رتی کی حسین روح کے بے جان جسم کا دیدار کیا۔ میں نے رتی سے وعدہ کیا تھا کہ ایک دن اس کی پوری کہانی لکھوں گا۔ وہ وعدہ میں تیس برس کے بعد پورا کر رہا ہوں۔ (دیکھیے میری تصنیف رتی جناح)"

کانجی مزید لکھتے ہیں کہ:

"رتی کی وفات کے بعد میں نے جتنی تلخی اور افسردگی جناح کی زندگی میں دیکھی اس سے پہلے کسی اور شخص میں نہیں پائی تھی۔ میرے سامنے انھوں نے گویا اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ دو گھنٹے تک وہ مسلسل بولتے رہے اور میں سنتا گیا۔ بیچ میں کبھی دو ایک لفظ ہمدردی کے کہہ دیتا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جناح کی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ ان کے لیے بیوی کی موت صرف ایک المناک سانحہ یا مرضی مولا کا کرشمہ ہی نہیں تھا بلکہ اس میں انھیں اپنی ناکامی کی جھلکی نظر آئی تھی، زندگی میں ذاتی شکست محسوس ہونے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس صدمے کو اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بھلا نہ سکے۔"

"برطانوی ایجنٹ" جناح کو ملنے والے "انعام"

کہ "ایجنٹ" جناح کو برطانویوں سے کون کون سے ریوارڈز ملے ان پر بھی ایک نظر دوڑاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ سرحدی حد بندیوں میں "ایجنٹ" کو کتنی رعایت ملی۔

منصور احمد (انڈین مسلم) اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 191 تا 93 میں سرحدی حد بندیوں بارے میں لکھتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کا رویہ اس وقت کس حد تک جانبدارانہ تھا۔ اس سے پہلے سابق پاکستانی وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے اس سے ملتے جلتے الزامات لگائے دیکھتے ہیں ان کے الزامات میں کس حد تک صداقت ہے اور منصور احمد

اپنی کتاب میں کونسے نئے شواہد سامنے لیکر آگئے ہیں۔ منصور احمد لکھتے ہیں کہ:

"اس ضمن میں اب ہم اس سنگین الزام کی تفصیل میں پڑتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کو ملا کر پنجاب کی تقسیم کے سرحدی لائن کو پنجاب باؤنڈری کمیشن کے ذریعہ آخری شکل دے دیے جانے کے بعد اس میں تحریف کرا کر پاکستان کے حصے کی چند علاقوں کو ہندوستان والے حصے میں ڈلوایا اور اس کے نتیجے میں ہی ہندوستان کو کشمیر وادی کے ساتھ لنک مل گیا۔"

تقسیم ہند کے دنوں سے ہی بہت سارے پاکستانی دانشور سیاست داں (بشمول ایک زمانے کے پاکستانی پرائم منسٹر چودھری محمد علی کے) لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ انھوں نے ریڈکلف کو ملا کر پنجاب کے متعدد مسلم اکثریت والی تحصیلوں کو (جو اصل پاکستان خطے کے لگاتار یا ملحق بھی تھیں) جیسے کہ گرداس پور تحصیل مسلم آبادی 52 فیصد بٹالہ تحصیل (مسلم آبادی 55.99) فیروز پور (مسلم آبادی 55.2)زیرا تحصیل (مسلم آبادی 51.1 فیصد)، پاکستان کے حصے میں نہ ڈال کر ہندوستان کے حصے میں کر دیا تھا۔

ابھی حال ہی میں اس الزام پر ایک طرح کی مہر تصدیق اس وقت پڑ گئی جب مسٹر کرسٹوفر بیوماونٹ جیسے معتبر شخص نے جو اس زمانے میں سرحدی کمیشن چیئر مین ریڈکلف کے سکریٹری تھے (اور شاید آج بھی بقید حیات ہیں یعنی دم تحریر) کم از کم فیروز پور اور زیرا تحصیل کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک دعوت کے دوران ریڈکلف کو اپنے دائرہ اثر میں لا کر پنجاب کی تقسیم والی باؤنڈری لائن (جسے باونڈری کمیشن نے آخری شکل دے دی تھی) اس میں تحریف کر کے ان تحصیلوں کو پاکستان کا حصہ بننے والے علاقے سے نکلوا کر ہندوستان کے حصے میں ڈلوا دیا۔

یہ انکشاف 1989ء میں بیو مونٹ نے آکسفورڈ کے آل سولس کالج (All Soul's College) میں نو شتہ شکل میں اپنی ایک رپورٹ میں کیا جو ہندوستان میں بھی 1992ء کے فروری مارچ میں شائع ہوا جب اس وقت بھی بیو مونٹ یارک شائر میں ایک سرکٹ جج کے حیثیت سے رہ رہے تھے، (اور ممکن ہے آج بھی بقید حیات ہوں) بیو مونٹ کے اس انکشاف کا متن جو ہندوستان میں مشہور انگریزی ہفتہ وار "دی سنڈے" کے 22 تا 28 مارچ 1992ء والے شمارے میں شائع ہوا، اس طرح ہے۔ اقتباس:

"Lord Mountbatten the last viceroy in India had manipulated the partition along Punjab in India's favour."

"ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کے دوران ہندوستان کی طرفداری میں پنجاب

کے اندر بٹوارے کی لائن میں تحریف کرادی۔ دی سنڈے نے آگے لکھا ہے:

"اس رپورٹ کے مطابق ریڈ کلف نے ماؤنٹ بیٹن کے اثر و دباؤ میں آکر (خود ماؤنٹ بیٹن نہرو اور مہاراجا بیکانیر کے اثر و رسوخ میں تھے) فیروزپور اور (تحصیلوں) کو اس ملک (یعنی ہندوستان) کو دے دیا۔ مہاراجا بیکانیر کا اس میں مفاد یہ تھا کہ فیروزپور میں نہروں کے نظام کا ہیڈ ورکس تھا جس کے پاکستان میں چلے جانے سے بیکانیر اسٹیٹ کی آبپاشی پر برا اثر پڑتا۔ ماؤنٹ بیٹن نے دخل اندازی کی اور ریڈ کلف اس سے متاثر ہونے سے اپنے کو بچا نہیں سکے، 'یہ اہم مداخلت' سمجھا جاتا ہے کہ، اس لنچ (دوپہر کے کھانے) پر کی گئی جس میں ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف دونوں شریک تھے اور جس سے بیو مونٹ کو، چالاکی سے یہ کہہ کر الگ رکھا گیا کہ ٹیبل پر مزید جگہ نہیں تھی، بیو مونٹ زور دے کر کہتے ہیں میں جانتا تھا یہ بات غلط تھی، اس شام پنجاب کی ریکھا (سرحدی لائن) تبدیل کی گئی۔"

منصور احمد مزید لکھتے ہیں کہ:

"دی سنڈے کے لندن اسٹاف سربانی باسو جو اس رپورٹ کے خالق ہیں ان کا کہنا ہے کہ مسٹر الاسٹر لیمب جنھوں نے حال ہی میں Kashmir Disputed Legacy کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے (جو ڈیلی ٹیلی گراف میں چھپی ہے) ان کا کہنا ہے کہ ان کو یعنی لیمب کو اس انکشاف پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ لیمب کے مطابق گرداس پور، کا ضلع جس کے بغیر جموں و کشمیر اور ہندوستان کے درمیان کا کلیدی رابطہ نہیں بن سکتا تھا، پاکستان کو جانا چاہیے تھا، لیکن ریڈ کلف کے ہندوستان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ماؤنٹ بیٹن نے یہ بتا دیا تھا کہ یہ ضلع تقسیم کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ماونٹ بیٹن کے سوانح نگار زیغلر Zeighler جنھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ اس معاملے میں شک کا عنصر باقی رہتا ہے، اب مانتے ہیں کہ وہ شک اب اور مضبوط ہو گیا ہے۔"

دی سنڈے رپورٹ میں آگے کہا گیا ہے:

"بیو مونٹ کا کہنا ہے کہ وہ اپنی موت سے پہلے اس بیان کو منظر عام پر نہیں آنے دیتے، جس کا مطلب ہوتا کہ یہ واقعہ پرانا ہو کر تاریخ کا حصہ بن چکا ہوتا، لیکن معلوم ہوا کہ ان کا پوتا کیمرج میں "ہندوستان کی تقسیم" کو ایک خصوصی مضمون کے طور پر مطالعہ کر رہا تھا تو انھوں نے خیال کیا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ سچائی کو ظاہر کر دیا جائے۔"

منصور احمد اپنی کتاب کے صفحہ نمبر 194 اور 195 میں مزید حقائق سامنے لیکر آتے ہیں کہ کیسے سرحدی

حد بندیوں میں پاکستان کے ساتھ زیادتی کی گئی۔

کولمبیا یونیورسٹی پریس کے ذریعے شائع کردہ کتاب Resolution to Pakistan جو دراصل کئی تاریخی مضمون کا اڈیٹیڈ (Edited) متن ہے، اس میں ایک مضمون دین محمد کا تحریر کردہ ہے، جسے ایڈیٹر کو 27 جنوری 1952ء کو انھوں نے دیا تھا۔ مصنف کے مطابق:

گو انڈین انڈیپینڈینس ایکٹ 1947ء کے دوسرے شیڈیول کے مطابق پنجاب کا گرداس پور ضلع جو کہ مسلم اکثریت والا تھا، اسے پاکستان میں جانا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے ریڈ کلف کو ورغلا کر اس ضلع کا، بٹوارا کرا دیا ہوا یوں کہ قبل اس کے کہ ریڈ کلف ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے، ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس کی۔ اس پریس کانفرنس میں ان سے سوال کیے گئے کہ انھوں نے اپنے براڈ کاسٹ میں ایسا کیوں کہا تھا کہ:

> "The ultimate boundaries of the partitioned provinces would be almost certainly not identical with those which have been provisionally adopted"
>
> "(تقسیم شدہ صوبوں کی سرحدیں انجام کار (تقریباً یقینی طور پر) وہ نہیں بنیں گی، جو عبوری طور پر مانی گئی ہیں) اس پر ماؤنٹ بیٹن نے فوراً جواب ان لفظوں میں دیا وجہ سیدھی سادی یہ ہے کہ پنجاب کا گرداس پور ضلع جس میں آبادی کا تناسب ہے50.4 فیصد مسلمان 49.6 فیصد غیر مسلم، فرق صرف 8 فیصد ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ باؤنڈری کمیشن سیدھے اس پورے ضلع کو پاکستان میں نہیں ڈال سکتا"

دین محمد لکھتے ہیں کہ اولاً تو یہ ہندسے سراسر غلط تھے وہ اس طرح کہ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمان 50.4 فیصد نہیں بلکہ 51.48 فیصد تھے فرق 8 فیصد نہیں تھا بلکہ 28.2 تھا۔

> "جب بات یہ تھی کہ انڈیپینڈینس ایکٹ کے دفعہ 4 کے ذیلی دفعہ 3 کے تحت باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ سے مراد صرف کمیشن کے چیئرمین کے فیصلوں سے تھا اور اس میں ہندوستان کے وائسرائے کو کوئی حق نہیں تھا کہ اس معاملے پر ما قبل فیصلہ اثر انداز ہوں اور اس کے ضمن میں اس چیئرمین کے لیے جو اپنے ملک سے ابھی آنے ہی والا تھا اس طرح کی بیہودہ تجویز رکھ چھوڑیں کہ پورا گرداس پور کا ضلع باوجودیکہ وہ مسلم اکثریت کا تھا پورے کا پورا پاکستان میں نہ رکھا جائے۔
>
> اس مقام پر اس بات کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے کہ باؤنڈری کمشن کو ہدایت یہ تھی کہ پنجاب کے دو حصوں کی سرحدوں کا تعین متصل و ملحق مسلم اکثریتی و غیر مسلم اکثریتی

علاقوں کی بنیاد پر کریں اور اس میں کمیشن کو ابتدائی اساس کے طور پر آبادی کے فیکٹر کو ہی لینا تھا، اکثریت کتنی قلیل یا کتنی کثیر تھی اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔

دین محمد آگے لکھتے ہیں کہ اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں مسلمانوں کا تناسب غیر مسلموں سے زیادہ تھا، گرداس پور، بٹالہ، فیروزپور، زیرا، نکودر، انبالہ، اور جالندھر تحصیلیں (پاکستان) پنجاب سے کاٹ کر نکال دی گئیں گو یہ سب مغربی پنجاب کے دوسرے مسلم اکثریتی علاقوں سے متصل و ملحق بھی تھیں۔"(76)

اس سے بہت پہلے سابق وزیر اعظم پاکستان چوہدری محمد علی یہی باتیں اپنی کتاب "ظہور پاکستان" میں لکھ چکے تھے:

"9 اگست 1947ء کو میں دہلی سے کراچی گیا۔ لیکن میرے دہلی واپسی کے لیے کراچی چھوڑنے سے قبل لیاقت علی خان نے مجھے بتایا کہ قائداعظم کو پنجاب کی سرحدوں کی تعین کے تعلق سے بڑی تشویشناک رپورٹیں بالخصوص، گرداس پور ضلع کے بارے میں ملی ہیں اور یہ بھی کہ امرتسر اور جالندھر کے ضلعوں میں بھی متصل مسلم اکثریتی علاقوں کے ہندوستان کو دیۓ جانے کا خدشہ تھا۔ لیاقت علی خاں نے مجھ سے کہا کہ اپنی دہلی واپسی پر لارڈ اسمے سے ملوں اور انھیں قائدِاعظم کی طرف سے یہ کہہ دوں کہ اگر متذکرہ باؤنڈری لائن انھیں خطوط پر ہوئی جن کا خدشہ ظاہر کیا گیا ہے تو اس کے بڑے گہرے اثرات پا کستان اور حکومت برطانیہ کے تعلقات پر پڑیں گے، جن کی بھروسہ مندی اور عظمت اس مسئلے سے ہم کنار ہے۔

میں جب دہلی پہنچا تو ایرپورٹ سے سیدھے وائسرائے ہاؤس چلا گیا جہاں اسمے محو کار تھے مجھے بتایا گیا کہ لارڈ اسمے سر سرل ریڈکلف سے تخلیہ میں محو گفتگو تھے میں نے ان کے فارغ ہو لینے تک انتظار کر لینے کا فیصلہ کیا، جب قریب ایک گھنٹے کے بعد ان سے ملاقات کی تو میں نے قائداعظم کا سندیسہ پہنچایا۔ جواب میں اسمے نے سرحدوں کے سلسلے میں ریڈکلف کے خیالات سے مکمل لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا انھوں نے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کبھی اس سوال پر ریڈکلف سے گفتگو نہیں کی ہے، یہ تو حتمی طور پر ریڈکلف کا کام ہے اور اس ضمن میں قطعی کوئی سجھاؤ بھی ان کو نہیں دیا گیا ہے اور نہ دیا جائے گا۔ جب میں نے اسمے کو ان تفصیلات کا ذکر کر کے کریدا جس کی رپورٹیں ہمیں ملیں تھی، توانھوں نے کہا کہ وہ میری بات سمجھ نہیں پارہے تھے۔ اس کمرے میں ایک نقشہ ٹنگا ہوا تھا میں نے اس نقشے کی طرف

ہاتھ بڑھایا تاکہ اس کی مدد سے بات کی وضاحت کر سکوں، اس نقشے پر اب بھی پنجاب کے بیچ پنسل کی لائن کھینچی ہوئی تھیں یہ لائن انھیں خطوط پر تھیں جن کے بارے میں قائداعظم کو رپورٹیں ملیں تھی، میں نے کہا کہ اب مجھے اور وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نقشے پر جو لائن کھینچی ہوئی ہے وہ اس سرحدی لائن کو بتارہی ہے میں جس کے بارے میں کہہ رہا تھا، اسمے کا چہرہ اس وقت فق پڑ گیا اور وہ الجھن کے عالم میں بولے کون اس نقشے کے ساتھ حماقت کر رہا ہے۔

Who has been fooling with this map

نقشے پر کھینچی یہ لائن باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ والے فائنل نقشے سے صرف ایک بات میں مختلف تھی۔ فیروز پور ضلع کے فیروز پور اور زیرا والے مسلم اکثریتی تحصیل اب بھی کھینچے ہوئے نقشے میں پاکستان کی طرف ہی تھے" (77)

قارئیں ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح فیروز پور اور زیرا کی نسبت سے یہ تحریر مسٹر بیوماؤنٹ کے حالیہ بیان کی مزید تصدیق کر رہی ہے۔

"حریت پسند" کانگرس کا کردار

آخر میں ولی خان کی کتاب سے متاثر ذہنوں کو کچھ مستند حوالوں سے ہلکی سی ایک جھلک دکھاتے ہیں کہ ایجنٹ کیسے ہوتے ہیں۔

برطانویوں کی طرف سے ٹرانسفر آف پاورز کے ڈاکیومنٹس ڈسکلوز کرنے کے بعد بہت ساری حقیقتیں کھل کر سامنے آگئیں۔ آزادی کے دنوں کے انتہائی قریب سدھیر گوش کس کے لیے اور کیا کر رہے تھے آیئے پڑھتے ہیں۔

"ان دنوں بھی کانگرسی رہنماؤں اور برطانوی کابینہ کے وزیروں بالخصوص کرپس اور پیتھک لارنس کے مابین ایک خفیہ رابطہ سدھیر گوش (ٹاٹا گروپ) کے ذریعے قائم تھا جو خصوصی ہوائی سفر کی مراعات لے کر ہندوستان سے لندن گیا ہوا تھا۔

26 اگست کو ویول نے برلا ہاؤس دہلی اور لندن کے مابین ٹیلی فون پر ہونے والی بات چیت کا ریکارڈ حاصل کیا برلا ہاؤس سے پٹیل اور لندن سے سدھیر گوش بول رہا تھا۔ پٹیل نے کہا:

"کرپس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر کلکتہ میں گڑبڑ ہوئی تو وہاں 93 (گورنر راج) نافذ کر دی جائے گی۔ وہ کیا کر رہا ہے؟ جواب میں سدھیر نے کہا" کرپس لندن میں نہیں ہے۔ میں نے

سارا معاملہ پیتھک لارنس کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ میرے ساتھ پوری طرح اتفاق بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ اگر اس وقت کوئی انتہائی اقدام اٹھالیا گیا تو اس سے بڑے سنگین مسائل پیدا ہو سکتے ہیں"

اس پر پٹیل نے اسے وہاں مزید دو ہفتے رکنے کے لیے کہا اور بتایا کہ انگریزوں کا اخبار سٹیٹس مین اگر چہ لیگ وزارت (بنگال) کے خلاف بہت کچھ لکھ رہا ہے لیکن اس پر کوئی اقدام نہیں کیا جارہا ہے۔ سدھیر نے جواب میں کہا کہ میں آج ایک بار پھر پیتھک لارنس سے ملوں گا اور اسے ساری صورت حال سمجھاؤں گا۔ (ٹرانسفر آف پاور جلد 8 صفحہ نمبر 329-30)

ویول نے یہ ساری گفتگو من وعن تحریر کر کے 28 اگست کو وزیر اعظم ایٹلی کو ارسال کر دی اور ساتھ اپنے خط میں لکھا کہ:

"میں ہندوستان کے معاملات کا پوری طرح ذمہ دار نہیں رہ سکتا اگر آپ کے کابینہ کے بعض ارکان ایک آزاد ایجنٹ کے ذریعے میری پیٹھ پیچھے کانگرس کے ساتھ رابطہ استوار رکھیں گے۔" (ٹرانسفر آف پاور جلد 8 صفحہ 328)

لیکن ایٹلی خود بھی سدھیر گوش کے ساتھ ملاقات کر چکا تھا جس کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے خود ایٹلی نے 14 اگست کو گاندھی کو لکھا تھا کہ:

"مجھے اس کے ساتھ گفتگو کا بڑا لطف آیا۔ مجھے پورا وثوق ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین مکمل تصفیہ طے پا جائے گا۔" (ٹرانسفر آف پاور جلد 8 صفحہ نمر 236) کانگرس اور لیبر حکومت کے مابین متذکرہ بالا رابطوں سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ کلکتہ فسادات کے پس پشت کیا عزائم کار فرما تھے؟ اور یہ بھی کہ گاندھی اور نہرو نے ویول کے ساتھ اس قدر رعونت آمیز روّیہ کیوں اختیار کیا تھا؟" (78)

کرپس اور پیتھک لارنس، گاندھی کے ساتھ کس طرح کا فدویانہ روّیہ رکھتے تھے اس بارے کیبنٹ مشن والے باب میں تفصیلی نظر ڈالی جاچکی ہے جس میں ویول نے بار بار اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ ایسی حرکتیں وقار کے منافی ہیں۔

ویول کے جانے کے بعد جب ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آئے تو آپس کی محبت کہیں زیادہ گہری ہوگئی زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ:

"ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے ساتھ مذاکرات کی جو تفصیلی رپورٹ 17 اپریل کو وزیر ہند پیتھک لارنس کو ارسال کی اس میں مذکورہ تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہ جناح کے خلاف اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔"

"میری رائے میں جناح ایک دماغی مریض ہے۔ دراصل اس کے ساتھ ملاقات ہونے سے پہلے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جو انتظامی امور کے علم یا احساسِ ذمہ داری سے قطعی بے بہرہ ہو وہ اس قدر طاقتور مقام حاصل کر سکتا ہے اور برقرار رکھ سکتا ہے کہ جو اسے حاصل ہے۔ (ٹرانسفر آف پاور جلد 10 صفحہ نمبر 300)

16 اپریل کو ہندوستان میں برطانوی ہائی کمشنر ایلن شون نے جناح کے ساتھ ملاقات کے بعد ایک نوٹ میں اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے لکھا "جناح کا اپنے مطالبہ پاکستان پر اصرار اس قدر بے لچک ہو چکا ہے کہ یقیناً ان کے ذہنی مریض ہونے کا گمان ہوتا ہے" (ٹرانسفر آف پاور جلد 10 صفحہ نمبر 279)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہد چوہدری لکھتے ہیں کہ:

"جناح کے متعلق برطانوی حکام کے اس قدر تلخ جذبات رکھنے کی وجہ صاف طور پر یہ تھی کہ برطانیہ عالمی سامراجی تقاضوں کے تحت برصغیر کو جس متحد شکل میں اور جس قسم کی مرکزی حکومت کے ماتحت رکھ کر جانا چاہتا تھا، جناح اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے کہ انھیں برصغیر کے کروڑوں مسلم عوام نے اپنا قائد اعظم بنا کر اپنے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری ان کے کاندھوں پر ڈال دی تھی اور یہی عوام الناس جناح کے اس "طاقت ور مقام" کا سرچشمہ تھے جو ماؤنٹ بیٹن اور شون جیسے سامراجی گماشتوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو کانگرسی رہنماؤں میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آتی تھیں اور پہلی ہی ملاقات کے بعد اس نے نہرو کو "سب سے مخلص" رہنما قرار دے دیا تھا۔ دراصل روّیے اور نظریے مادی مفادات سے بالاتر نہیں ہوتے۔ ماؤنٹ بیٹن کی جانب سے کانگرسی رہنماؤں اور جناح کے بارے میں اختیار کردہ رویوں میں یہ واضح امتیاز بالکل ظاہر کر دیتا ہے کہ اس وقت برصغیر میں برطانوی سامراج کے مفادات کون پورے کر رہا تھا۔" (79)

منصور احمد (انڈین مسلم) ماؤنٹ بیٹن کے جانبدارانہ روّیے بارے اپنی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

"ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچنے کے چھ مہینوں کے اندر مختلف رہنماؤں سے گفت وشنید پوری کر لینے کے بعد ایک پلان کی تشکیل دی جسے انھوں نے ڈکی برڈ پلان (Dickee-Bird Plan) کا نام دیا۔

منصور احمد صفحہ نمبر 170 اور 171 میں رضا خان کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "وائسرائے کی دراصل بڑی خواہش تھی کہ پنڈت نہرو کی تائید ان کے پلان کو پہلے ہی حاصل ہو جائے سچ تو یہ ہے کہ وائسرائے اپنی اس خواہش کو چھپا نہیں سکے کہ وہ کانگرس کو مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتے تھے ان کا ماننا تھا کہ اگر لیگ کوئی عذر کھڑا کریں گے تو انھیں اس بات کا خوف دلایا جائے گا کہ اختیارات کانگرس کے ہاتھوں ایک واحد مرکزی حکومت کی شکل میں سونپ دیے جائیں گے۔

دس مئی کو وائسرائے یا تو اچانک کسی اضطراری کیفیت یا جانے بوجھے منصوبے کے تحت چپ چاپ اپنی تجوری کے پاس گئے اور اس میں سے پلان کو نکال کر پنڈت نہرو کو پڑھنے کے لیے دیا اور خود آدھے گھنٹے تک دم سادھے انتظار کرتے رہے کہ پندت نہرو کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ تب انھوں نے جو دیکھا وہ یہ تھا کہ پنڈت جی کا چہرہ پہلے لال ہو گیا اور اس کے بعد کرب سے ہرا۔ وائسرائے سمجھ گئے کہ کہ سارا کام بگڑ گیا۔ پنڈت نہرو نے کہا:

> "یہ ایک دم نہیں چلے گا (It won't do)" میں اس طرح کے پلان کو کبھی بھی تسلیم نہیں کرونگا نہ ہی کانگرس اس کو منظور کرے گی، وائسرائے بڑی حیرانی اور سراسیمگی میں پڑے۔"

اسمے اور جارج ایبل منظوری کے لیے ڈکی برڈ پلان کو اس سے پہلے لیکر جا چکے تھے۔ منصور احمد آگے لکھتے ہیں کہ:

> "اس اثنا میں وہ پلان جسے لارڈ اسمے لندن لے گئے تھے معمولی ترمیم کے بعد منظور کر لیا گیا تھا اور اسے کیبل کر کے ہندوستان واپس بھیج دیا گیا۔ تاہم مانا یہ گیا تھا کہ 17 مئی تک اسے کسی کو دکھایا نہیں جائے لیکن یہی پلان تھا جسے ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کو 10 مئی کو دکھایا تھا اور جس دن دکھایا گیا اس کے دوسرے دن نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ اس پلان سے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے (Balkanisation) ہو جائیں گے۔ اس پر فوراً وی پی مینن کو بلا کر وائسرائے نے ہدایت کی کہ پلان پر نظر ثانی کر کے اس میں ترمیم کریں۔ 17 مئی والی دہلی کی مجوزہ میٹنگ ملتوی کر دی گئی اور ایک ڈرامائی انداز میں ماؤنٹ بیٹن نے پرائم منسٹر ایٹلی کو ایک تار بھیجا: "جس پلان کو آپ نے منظور کر کے بھیجا ہے وہ (اس تار کے ذریعے) مسترد کیا جاتا ہے، آپ دوسرے پلان کا انتظار کریں۔
>
> The draft plan that you have approved is hereby cancelled. Please revised plan.

لارڈ اسمے نے جن کو اس ساری پیشرفت کا علم نہیں تھا سرا سیمگی کے عالم میں ریمارک کیا
"یہ کیا حماقتیں ہو رہی ہیں(What the hell is going on) "
ادھر شملہ میں وی پی مینن چھ بجے شام کو اپنے ہوٹل میں پلان پر نظر ثانی کرنے کے لیے بیٹھے اور چار گھنٹے مسلسل کام کر کے پلان کے آخری جملے کو پورا کر لیا اور فوراً سے بھی پیشتر سر ایرک میویل کی معرفت ماؤنٹ بیٹن کے پاس بھیجا۔ وی پی مینن نے اس میں نہرو کی تجاویز کو شامل کر لیا تھا۔ 18 مئی کو لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن وی پی مینن کے ساتھ لندن کے لیے روانہ ہوئے تاکہ مسٹر ایٹلی سے براہ راست بات کریں، ایبل اور اسمے نے وائسرائے کے ساتھ سخت جدوجہد کی کہ پہلے والے پلان کو رہنے دیا جائے لیکن ان کی ایک نہ سنی گئی۔

دوسرے دن کیبنٹ اور پرائم منسٹر ایٹلی نے ایک کیبنٹ میٹنگ میں جو مشکل سے پانچ منٹ کی تھی اس ترمیم شدہ پلان کو منظوری دے دی۔ رضا خان لکھتے ہیں کہ:

> "تاہم مینن کچھ زیادہ ہی کانگرس نواز تھے، اور غیر ارادی طور پر بھی جناح اور مسلم لیگ کی ہزیمت کے متمنی تھے۔ "ان کے اپنے ہی لفظوں میں "میں بلبھ بھائی پٹیل کو شملہ کی ساری پیش رفت کی اطلاع دیتا رہتا تھا اور وہ ان پیشرفتوں سے بڑے مسرور تھے۔"(80)

ترمیم شدہ پلان لکھنے والے وی پی مینن کون تھے جو پٹیل کو شملہ کی ساری پیشرفت کے بارے میں اطلاع دیتا رہا زاہد چوہدری اپنی کتاب "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" میں لکھتے ہیں کہ:

> "وی پی مینن اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا۔ اس کی لکھی ہوئی دونوں کتابیں پڑھی جائیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص بڑی اونچی جگہ سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ بطور کلرک ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ملازم ہوا تھا۔ اس نے مختلف محکموں میں اپنی کلرکانہ محنت اور وفاداری سے اپنے افسروں کی خوشنودی حاصل کر کے اتنی ترقی کی تھی کہ یہ وائسرائے کا آئینی مشیر بن گیا تھا۔ برطانوی سامراج کے آخری دو سالوں میں اس شخص کی اہمیت میں اس لیے بہت اضافہ ہو گیا کہ یہ وائسرائے اور کانگرسی لیڈروں کے درمیان ایک غیر سرکاری رابطہ افسر کے طور پر کام کرتا تھا۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ یہ "ڈبل ایجنٹ" تھا۔ کانگرسی لیڈروں کو وائسرائے کی خفیہ باتیں بتا دیتا تھا اور وائسرائے کو کانگرس کے رازوں سے مطلع رکھتا تھا۔ چونکہ 1946ء کے اواخر میں ویول نے برطانیہ کی مقررہ معیاد کے اندر دستبرداری کی تجویز پیش کر دی تھی، اس لیے یہ شخص ہوا کا رخ دیکھ کر سو فیصدی پٹیل کا "آدمی" بن گیا تھا۔ گویا مینن 1947ء کے اوائل میں ایک ایسا سیاسی دلال بن گیا تھا

جس نے ماؤنٹ بیٹن اور کانگرسی لیڈروں کے درمیان سودابازی کے ڈرامے میں وقتی طور پر بظاہر اہم کردار ادا کیا تھا اور اسی بنا پر اسے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ برصغیر کے چالیس کروڑ عوام کی تقدیر اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ تنہا تاریخ سازی کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ لکھتا ہے کہ "میں نے شملہ کے سیسل ہوٹل میں پہلے دو بڑے پیگ وسکی کے چڑھائے اور پھر برصغیر کی تقسیم کا مصوبہ لکھنے بیٹھ گیا۔ منصوبہ اسی شام تیار ہو گیا۔ نہرو کو دکھایا گیا اور اس نے منظوری دے دی۔"

نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ اب یہ منصوبہ صحیح خطوط پر استوار ہو گا اور اب کانگرس کے لیے قابل قبول ہو گا"

گاندھی کے سیکرٹری پیارے لال نے بھی کم و بیش یہی روایت بیان کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اپریل کے آخری دو ہفتوں میں پٹیل سے یہ کہا گیا کہ "کانگرس اگر عبوری دور کے لیے ڈومینیئن کا درجہ قبول کر لے تو پھر برطانیہ کے انخلا کا قبل از وقت انخلا ممکن ہو گا۔ مزید برآں اس اقدام سے برطانیہ کے ساتھ مسلم لیگ کی سودابازی کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی۔ یکم مئی کو وائسرائے کے سیکرٹری نے اطلاع دی کہ اب سردار پٹیل نوآبادیاتی درجے کی پیشکش منظور کرنے کے لیے تیار ہے"(پیارے لال صفحہ 166)(81)

ایچ ایم سیروائی تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت میں ماؤنٹ بیٹن کی جانبداری بارے لکھتے ہیں کہ:

"سرکاری دستاویزات اور شائع شدہ ریکارڈ جسے ٹرانسفر آف پاور کے عنوان سے کئی جلدوں میں شائع کیا گیا، کے مطالعے سے بلاشبہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کے لیے منصوبہ بندی کرنی شروع کی تو اس نے انصاف کا وہ لبادہ اتار دیا جو اس نے اب تک مسلم لیگ اور کانگرس کے ضمن میں اوڑھ رکھا تھا۔ اس کے اس دعوے کا بھانڈا پھوٹ گیا کہ وہ مسلم لیگ اور کانگرس سے یکساں سلوک کر رہا ہے۔ وہ حق دوستی ادا کرنے کے لیے اہم دستاویزات نہرو کو دکھاتا رہا اس سے تجاویز لیکر ان دستاویزات میں تبدیلیاں کرتا رہا لیکن اس نے جناح اور مسلم لیگ کو اندھیرے میں رکھا اور ان کا ردِ عمل جاننے کی کبھی زحمت گوارا نہ کی۔ وہ کانگرس کی حمایت میں کس حد تک آگے گیا اس کا اندازہ عائشہ جلال کی کتاب کے درج ذیل پیرے سے ہوتا ہے۔

"دو مخالف پارٹیوں میں سے صرف ایک کے ساتھ گفتگو ایک نیا تصور تھا جو ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی سیاست میں متعارف کرایا۔ کانگرس کے تصور کے مطابق یونین کو چند ہفتوں کے اندر ڈومینیئن کا درجہ مل جانا تھا (آزادی حاصل ہو جانی تھی) اور مسلمان اضلاع کی قبل از وقت "پیدائش" ہونی تھی تاکہ وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ وائسرائے کی غیر منقولہ تشبیہ کے مطابق یہی فرق ہے مستقل عمارت بنانے، جھونپڑی کھڑی کرنے یا خیمہ لگانے میں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہم صرف خیمہ لگا رہے ہیں اور ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے" (بحوالہ عائشہ جلال صفحہ نمبر 271)

سیر وائی مزید لکھتے ہیں کہ:

"محمد علی جناح کے ان بیانات کا حوالہ دینے کا کوئی فائدہ نہیں جن میں انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی غیر وابستگی یا انصاف پسندی پر اعتماد کا اظہار کیا تھا کیونکہ انھیں علم نہیں تھا کہ پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ بہر حال یہ بات طے ہے کہ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے کی حیثیت سے انصاف کرنے میں ناکام رہا اور ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کا فرض نبھا نہ سکا۔"(82)

ان تمام حقائق کے باوجود جناح صاحب برطانوی ایجنٹ تھے جو ہند کے پسماندہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے تن تنہا برطانویوں اور کانگرس لیڈر شپ کے عزائم کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے کیونکہ ان حقائق کی سنی سنائی "حقائق حقائق ہیں" کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ اور جسونت سنگھ جیسے لوگوں نے یقیناً مطالعہ پاکستان کے کسی باب سے متاثر ہو کر جناح صاحب بارے ایسے تعریفی کلمات کہے:

"He created something out of nothing and single-handedly he stood against the might of the Congress party and against the British who didn't really like him."

حوالہ جات

1. (عبد الغفار خان-ڈی جی ٹینڈولکر پہلا ایڈیشن 1967ء صفحات 424-25)
2. (انڈیا ونز فریڈم صفحہ 193)
3. آپ بیتی خان عبد الغفار خان صفحہ نمبر 176
4. ایضا صفحہ نمبر 205
5. (ٹرانسفر آف پاور والیوم 10 صفحہ نمبر 768---- از--زاہد چوہدری "افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسئلہ خود مختاری کا آغاز")
6. (آزاد صفحہ 195)
7. قائد اعظم اور سرحد-عزیز جاوید صفحات 189-190 از منیر احمد)
8. "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" صفحہ نمبر 86 از کیمبل جانسن
9. ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی
10. زاہد چوہدری "افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسئلہ خود مختاری کا آغاز" صفحہ نمبر 88-89
11. ایضاً۔ صفحہ نمبر 88-89
12. (ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 591 زاہد چوہدری "افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسئلہ خود مختاری کا آغاز" صفحہ نمبر 95-96)
13. (ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 889 از زاہد چوہدری 95-96)
14. ایضاً۔ صفحہ نمبر 810 از زاہد چوہدری)
15. ہیکٹر بولتھو صفحہ نمبر 30-31
16. ایضا صفحہ نمبر 34
17. ایضا صفحہ نمبر 207
18. ایضا صفحہ نمبر 192
19. ایضا صفحہ نمبر 177

20. ایضاً صفحہ نمبر119-22

21. محمد علی جناح کا نجی دو آر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ 53،52

22. ہیکٹر بولتھو صفحہ نمبر238

23. ایضاً۔ صفحہ نمبر99،298

24. انٹرویوز اور تاثرات از ڈاکٹر مبارک علی

25. Pakistan Eye of the Storm مترجم یاسر جواد صفحہ نمبر90

26. محمد علی جناح کا نجی دو آر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ نمبر18

27. ایضاً19 تا21

28. ایضاً صفحہ نمبر75،76

29. ایضاً صفحہ نمبر86

30. "برطانوی ہند کا مستقبل" بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی صفحہ نمبر213

31. جناح، اتحاد سے تقسیم تک جسونت سنگھ صفحہ نمبر60

32. ایضاً۔ صفحہ نمبر 51-52

33. فریڈم ایٹ مڈ نائٹ لیری کولنز، دامنک لیپیئر ترجمہ: سعید سہروردی صفحہ 30،28،27

34. دی گریٹ لیڈر جلد دوم از منیر احمد منیر

35. "تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار" از محمد فاروق قریشی ٹرانسفر آف پاور ڈاکیومنٹس

36.

37. قائد اعظم جناح، ایک قوم کی سرگزشت جی الانا، مترجم رئیس امروہوی صفحہ نمبر99،198

38. ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی صفحہ نمبر58

39. کے ایچ خورشید "قائد اعظم کی یادیں"

40. محمد علی جناح کا نجی دو آر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ 38،37

41. ایضاً۔ صفحہ58،59

42. "حقائق حقائق ہیں" از ولی خان صفحہ نمبر236

43. زاہد چوہدری "افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسئلہ خود مختاری کا آغاز" صفحہ نمبر106،105

44. "حقائق حقائق ہیں" از ولی خان صفحہ نمبر25

.45 محمد علی جناح کا نجی دو آر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ 17

.46 ہیکٹر بولتھو صفحہ نمبر 99

.47 محمد علی جناح کا نجی دو آر کا داس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ 28،29

.48 ایضاً 29 تا 31

.49 ہیکٹر بولتھو صفحہ نمبر 103

.50 جناح، اتحاد سے تقسیم تک جسونت سنگھ صفحہ نمبر 71

.51 ایضاً۔ صفحہ نمبر 144،45

.52 "حقائق حقائق ہیں" از ولی خان صفحہ نمبر 108

.53 " ایضاً۔ صفحہ نمبر 195

.54 ایضاً 241

.55 ایضاً 242

.56 ایضاً

.57 ایضاً 204

.58 ایضاً 244-45

.59 " قائد اعظم کیا تھے کیا نہیں تھے از ڈاکٹر مبارک

.60 "حقائق حقائق ہیں" از ولی خان صفحہ نمبر 239 تا 245

.61 ایضاً۔ صفحہ نمبر 294،95

.62 تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیر وائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر 138 تا 40

.63 "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" از زاہد چوہدری، حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر 557،58

.64 ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی صفحہ نمبر 221-22

.65 ایضاً۔ صفحہ نمبر 222

.66 " پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" از زاہد چوہدری، حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر 562،563

.67 پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ 566

.68 ٹرانسفر آف پاور والیوم 11 صفحہ نمبر 122-23 322-25 از پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم صفحہ نمبر 567

.69 "حقائق حقائق ہیں" از ولی خان صفحہ نمبر 289-90

70. فریڈم ایٹ مڈنائٹ لیری کولنز، دامنک لپییئر ترجمہ: سعید سہروردی صفحہ 56،155

71. ایضاً۔ 158

72. محمد علی جناح کا نجی دو آر کاداس ترجمہ و ترتیب سید شہاب الدین دسنوی صفحہ 76-77

73. ایضاً صفحہ نمبر 110

74. زاہد چودھری اور حسن جعفر زیدی کی مرتب کردہ کتاب "مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء" صفحہ نمبر 327-
336-334،330

75. سید عاصم محمود، ایکسپریس 16 اپریل 2017ء

76. "تقسیم ہند 1947ء، کیا اصلاً مسلمان ہی اس کے ذمے دار ہیں" از منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر
191 تا 193

77. ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی صفحہ نمبر 266-67

78. "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" از زاہد چوہدری، حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر 49،48

79. ایضاً۔ 373 -374

80. "تقسیم ہند 1947ء، کیا اصلاً مسلمان ہی اس کے ذمے دار ہیں" از منصور احمد (انڈین مسلم) صفحہ نمبر
169 تا 172

81. "پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم" از زاہد چوہدری، حسن جعفر زیدی صفحہ نمبر 481

82. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت ایچ ایم سیروائی صفحہ نمبر 134-135

کتابیات

1. برطانوی ہند کا مستقبل بیورلے نکولس ترجمہ ثمینہ راجہ، عظیم الرحمان فاروقی
2. تقسیم ہند 1947ء۔۔۔ کیا اصلاً مسلمان ہی اس کے ذمہ دار ہیں؟ منصور احمد انڈین مسلم
3. گاندھیایز آئینو ہماز اند ولالیاجنک ترجمہ محمد ظفر احمد انصاری
4. انڈین سٹر گل از بوس
5. کراس روڈز از سبھاش چندر بوس
6. مہاتما از ٹنڈولکر متفرق والیوم
7. عبد الغفار خان -ڈی جی ٹینڈولکر پہلا ایڈیشن 1967ء
8. پاکستان آر پارٹیشن از ڈاکٹر ابیدکر
9. جناح آف پاکستان از سٹینلے والپرٹ
10. لاسٹ ڈیز آف برٹش راج از موزلے
11. قائداعظم اور گاندھی پروفیسر محمد مظفر جنگ پبلشرز
12. ایس ایم نمبودری پد، "مہاتما اینڈ ازم
13. جناح، اتحاد سے تقسیم تک جسونت سنگھ
14. کے ایمنشی "پلگریمج ٹو فریڈم"
15. "دیسٹوری آف مائیلائف "از ایم آر جے کار
16. محمد علی جناح کا نجی دوآر کا داستر جمہو ترتیب سید شہاب الدین دسنوی
17. حیاتِ قائداعظم ہیکٹر بولتھو مترجم زہیر صدیقی
18. فریڈم ایٹ مڈنائٹ لیری کولنز، دامنکلیپیئر ترجمہ: سعید سہروردی
19. تقسیم ہند افسانہ اور حقیقت سیر وائی، ایچ۔ ایم ترجمہ ڈاکٹر صفدر محمود
20. قائداعظم جناح، ایک قوم کی سرگزشت، از جی الانا، مترجم رئیس امروہوی
21. صرف مسٹر جناح تالیف سید شمس الحسن، ترجمہ منیر احمد منیر
22. قائداعظم کی یاد میں از کے ایچ خورشید

23. آزادی ہند امام الہند مولانا ابوالکلام
24. شاہراہ پاکستان از چوہدری خلیق الزماں
25. ڈاکٹر امبیدکر " تھاٹس آن پاکستان
26. پاکستان کیسے بنا۔ جلد اوّل از زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی
27. پاکستان کیسے بنا۔ جلد دوم از زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی
28. "ڈِوائڈ اینڈ کوئِٹ" از پینڈرلمون
29. آزادی کی کہانی میری زبانی از سردار عبدالرب نشتر
30. قائداعظم جیسا میں انھیں جانتا ہوں، ایم اے ایچ اصفہانی
31. "مکاتیب قائداعظم محمد علی جناح 1937ء تا 1946ء (ڈاکٹر ندیم شفیق ملک)
32. قائداعظم شخصیت اور سیاست، جسونت سنگھ کی کتاب پر تبصرے: ڈاکٹر انور شاہین
33. جناح پیپرز مدیر اعلیٰ ڈاکٹر زوار حسین زیدی
34. ظہور پاکستان از چوہدری محمد علی
35. آپ بیتی خان عبدالغفار خان
36. افغانستان کا تاریخی پس منظر اور پختون مسلہ خود مختاری کا آغاز از زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی
37. "مشنود ماؤنٹبیٹن " از کیمبل جانسن
38. انٹرویوز اور تاثرات از ڈاکٹر مبارک علی
39. "پاکستان آئی آف دا سٹارم" از اووِن بینٹ جونز مترجم یاسر جواد
40. دیگر پلیڈر جلد دوم از منیر احمد منیر
41. تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار، از محمد فاروق قریشی (ٹرانسفر آف پاور ڈاکیومنٹس)
42. "حقائق حقائق ہیں " از ولی خان
43. قائداعظم کیا تھے کیا نھیں تھے۔ از ڈاکٹر مبارک علی
44. پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 5، از زاہد چوہدری اور حسن جعفر زیدی
45. ویول دی وائسرائے، ز جرنل ایڈیٹڈ پینڈرل مون
46. اقبال، جناح اور پاکستان از ڈاکٹر صفدر محمود

*****

''قائدِ اعظم، دوسرے لفظوں میں پاکستان، کی مخالفت آج کے پاکستان میں دو گروہ کر رہے ہیں اور اتفاق سے دونوں انتہا پسند ہیں۔ ایک وہ جن کا مذہب کے ساتھ کوئی خاص علاقہ نہیں اور متحدہ ہندوستان کے رومان میں اسیر ہیں۔ ان میں سے اکثر بھارت یاترا کرتے رہتے ہیں۔ یہ اپنی دانست میں بارڈر کی ''مدہم'' لکیر کو کالعدم گردانتے ہیں۔ دوسرا گروہ اہلِ مذہب کا ہے جن کے تعلیمی اداروں میں قائدِ اعظم کا نام لینا جرم ہے۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ سے طلبہ کو ہر ممکن حد تک ناواقف رکھا جاتا ہے اور قائدِ اعظم کا ذکر کرنا بھی پڑے تو بیگانگی کے بے مہر لمس کے ساتھ جناح صاحب کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔

عماد بزدار کی زیرِ نظر تصنیف آج کے پاکستان کی ایک بنیادی ضرورت پورا کر رہی ہے۔ عماد نے جذبات سے بلند ہو کر ٹھوس حوالہ جات کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کو دیوار سے لگایا گیا اور اس حد تک زچ اور مجبور کیا گیا کہ پاکستان کے مطالبے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ قائدِ اعظم نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جدوجہد کی اور اس میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں! عماد یہی منطقی اور زمانی ترتیب بروئے کار لایا ہے۔ اس نے پاکستانی مسلمانوں کا رخ اصل قائدِ اعظم کی طرف پھیرا ہے۔ یہ ایک خالص تحقیقی کتاب ہے۔ اس میں نعرے ہیں نہ جذبات! حقائق کو مذہبی لبادہ پہنانے کی کوشش کی گئی نہ مذہب سے بزور دُور دھکیلنے کی''۔

محمد اظہار الحق

فِکشن ہاؤس

لاہور ● حیدر آباد ● کراچی ●

@fictionhousepublishers www.fictionhouse.com.pk

ISBN 978-969-562-757-0

9789695627570